فاکیہ

پرویز بلگرامی

مجھے کچھ کہنا ہے

قارئین آپ کے سامنے میرا نیا ناول ہے۔ یہ ناول علم وعرفان پبلشرز کی جانب سے پیش کیا جارہا ہے۔ عرصہ سے میری خواہش تھی کہ اس بڑے ادارے سے بھی میرا کوئی ناول شائع ہو۔ کیونکہ اس ادارے سے شائع ہونے والے ناول زیادہ لوگوں تک پہنچتے ہیں اور چھپائی بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ ادارے کے روح رواں جناب گل فراز صاحب نے میری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور قرعہ فال فاکیہ پر آ کر ٹھیرا۔ فاکیہ میں نے ایک ڈائجسٹ میں شروع کیا تھا لیکن بدقسمتی سے مالکان نے وہ ڈائجسٹ بند کر دیا نتیجتاً قسط ادھوری رہ گئی۔ اپنے وقت پر یہ بہت کامیاب جارہی تھی۔ لوگ بے صبری سے اگلی قسط کا انتظار کرتے تھے اس لیے میں نے اسے پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر اسے آخری ٹچ دے ہی دیا۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اس کہانی کا مرکزی کردار ایران کا ایک غریب لیکن مشہور شخص ہے جس کی روحانی روٹی پورے ایران میں مشہور ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ کو یہ ناول کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں گے۔

پرویز بلگرامی

فاکیہ

اس کا نام سلمان احمدی مقدم تھا۔ وہ خواب بہت دیکھا کرتا تھا۔ رنگا رنگ خواب، نیلے پیلے خواب۔ ان خوابوں کا محور نہ خوشحالی تھی اور نہ کوئی حسینہ کیوں کہ اسے فی الحال دولت کی بالکل طلب نہ تھا۔ ماں باپ کا دیا کھاتا تھا اور عیش کرتا تھا۔ باپ جامعۃ الرضا میں ''صرف ونحو'' پڑھاتے تھے، اس لیے انہیں غیر معمولی عزت حاصل تھی۔ لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے، پھر ان کی رسائی دربار میں بھی تھی کیوں کہ ان کے دادا شاہ قاچار کے دور میں درباری تھے۔ اسی نسبت سے رضا شاہ پہلوی کے دربار میں انہیں عزت دی جاتی تھی۔ نوروز کی تقریب میں جن لوگوں کو دربار سے رقعہ ارسال کیا جاتا تھا، ان میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چھٹیوں پر اپنے گاؤں لوٹتے تو ان سے ملنے مقامی سطح کے تمام سرکاری افسران حاضر ہو جاتے تھے۔

کہنے کو وہ جامعۃ الرضا کے استاد تھے مگر ان میں ترقی پسند کے جراثیم خاصے موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہائی مذہب کے لوگوں کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ مذہب نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا کیوں کہ اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔

اس مذہب کی بنیاد شاہ قاچار کے دور میں پڑی تھی۔ عجیب اتفاق تھا، ایک ساتھ تین الگ الگ ممالک میں تین الگ الگ شخصیت نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

سوڈان میں مہدی سوڈانی، ہندوستان میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ایران میں علی محمد باب نے مہدیت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اتفاق سے یہ تینوں ممالک برطانیہ کے زیر اثر تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے انہیں تحفظ فراہم کیا تھا۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی کو کئی دن تک چلنے والی مسلح

جھڑپوں کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ ایران میں شہنشاہ قاچار نے بھی بابی مذہب پر پابندی لگا دی تھی اور باب کو اس کے حواریوں سمیت ملک بدر کر دیا تھا۔ باب کی دست راس قرۃ العین طاہرہ جو اس دور کی سب سے بڑی شاعرہ تھی اور ایک جید عالم دین کی بیٹی تھی۔ وہ حسن میں یکتا ہونے کا خوب خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔

شہنشاہ قاچار بابیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی وجہ سے تنگ تھا۔ اس کے حکم سے دربار میں بابیوں اور مسلمان علماء کے درمیان مناظرہ منعقد ہوا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اگر باب اور اس کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کی سچائی ظاہر نہیں کی تو سب کو ملک بدر کر دیا جائے گا۔ مناظرے میں شرکت کرنے کے لیے شاہ قاچار نے اسلام کے ہر فرقے کے علماء کو مدعو کیا تھا۔ طافتان واس کے گرد و نواح سے بلوچوں کو، طالقان اور مغربی صوبے جہاں اہل سنت کی اکثریت ہے، وہاں سے عمر الطاہری کو، قم سے 7 اثنا عشری عالم دین مع مراجع حسین طباطبائی کو، کردستان سے کرد علماء داخر عثمانی و سعید عثمانی کو دربار میں حاضر کیا گیا تھا۔

گیارہ سو مختلف فرقوں کے علماء سے مناظرہ کرنے کے لیے قرۃ العین طاہرہ کی سربراہی میں 18 بابی آئے تھے..... مناظرہ شروع ہوا۔ بحث عروج پر پہنچی بابی شکست کے قریب تھے کہ قرۃ العین طاہرہ نقاب الٹ کر مجمع کے درمیان آ گئی۔ حسن کا جادو چل گیا۔ وہ جو چاہتی تھی، وہ ہو گیا۔ علماء اس بے پردگی پر لاحول پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قرۃ العین طاہرہ کی اس بے حیائی پر شہنشاہ قاچار بھی برہم ہو گیا اور اس نے سزا سنا دی کہ قرۃ العین طاہرہ کو اپنے حسن پر ناز ہے، اس لیے اسے اس وقت تک ریگستان کی گرم ریت پر گھوڑے سے باندھ کر گھسیٹا جائے جب تک اس کی جلد نہ جل جائے۔ باقی بابیوں کو ملک بدر کر دیا جائے۔

ملک بدر بابیوں کا قافلہ ایران سے نکل کر عراق میں داخل ہوا اور باغ رضواں میں ٹھہرا۔ وہاں پہنچ کر باب کے دست راست علی حسین بہاء اللہ نے اعلان کر دیا کہ علی محمد جن کے آنے کی خوش خبری دینے کے لیے ''باب'' (دروازہ) بنے ہیں، وہ میں ہی ہوں یعنی بہا اللہ (اللہ کا نور) تمام بابی اسی دن بہائی بن گئے۔

باب کو اسرائیل کے شہر عکہ میں قید کر دیا گیا۔ اب بہا اللہ ہی سربراہ تھے۔ ان کے بعد عبدالبہا سربراہ بنے۔ ان کے بعد سوگی آفندی اور اب روحیہ خانم۔ سوگ آفندی نے بہائیوں کا حضیرۃ القدس (ہیڈ کوارٹر) امریکا میں قائم کر لیا تھا۔ اسی کی کوشش سے رضا شاہ پہلوی امریکا کی

گود میں آ گیا تھا، اس لیے رضا شاہ پہلوی کی بہائیوں پر خاص نظر کرم تھی۔ بہائی دھڑلے سے اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے..... اسلام میں جن باتوں پر پابندی ہے، بہائیوں نے ان باتوں کی کھلی اجازت دے دی تھی۔ عبادت کرنے کی کوئی پابندی نہیں، دن میں ایک بار یا ہفتے میں ایک بار یا سال میں ایک بار جب موقع ملے، عبادت کر لیں، ثواب یکساں ملے گا۔ 19 دن کا ایک مہینہ 19 مہینے کا ایک سال، باقی رہ گئے 5-6 دن جو ''ایام ہا'' کہلائے، ان میں عبادت کر لی جائے تو بھی چھوٹ گئی عبادت کا بدل مل جائے گا۔ طریقہ عبادت بھی آسان ''کتاب مقدس'' کی چند سطریں جہاں، جس حالت میں چاہیں، پڑھ لیں۔

اسلام میں پردے کی سخت پابندی۔ بہائی مذہب میں کھلی آزادی۔ لوگ دھڑا دھڑ بہائی مذہب قبول کر رہے تھے۔ مذہب اسلام کے شیدائی ہر فرقے کے علماء بہائیوں کے آگے دیوار بن رہے تھے۔ ایسے علماء رضا شاہ پہلوی کی نظروں میں باغی تصور کیے جاتے تھے۔ انہیں پولیس طرح طرح سے پریشان کرتی تھی اور جو عالم دین بہائیوں سے ربط ضبط رکھتا، اسے مراعات ملتیں۔ سلمان کے والد بھی مراعات پانے والوں میں تھے مگر ان کی بیوی خانم شیریں انہیں دن رات طعنے دیتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کفر کے گرداب میں پھنس رہا ہے۔ عالم دین ہو کر خاتم النبی ﷺ کو خاتم النبی ﷺ نہ مان کر بہا اللہ کے کفر کو بڑھاوا دے رہا ہے۔

خانم خود بھی ایک مشہور عالم دین کی بیٹی تھیں، اس لیے اسلامی احکام پر سختی سے عمل کرتی تھیں۔ اپنی اکلوتی اولاد سلمان کو بھی اسی طریقے سے پرورش کر رہی تھیں۔ وہ گاؤں ہی کے مدرسے میں پڑھ رہا تھا۔ وہ اسے نجف اشرف (عراق) بھیجنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مگر سلمان کو خواب دیکھنے سے ہی فرصت نہ تھی۔ وہ مدرسے کی پڑھائی کو جبراً قہراً مکمل کر رہا تھا۔ اسے گھر میں رہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں ہر شب جمعہ (جمعرات کی رات) کو اس کے گھر میں جمع ہوتی تھیں۔ ان میں نوعمر لڑکیوں کی تعداد اچھی خاصی ہوتی تھی۔ سلمان کو ان لڑکیوں سے ہنسی مذاق کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا اسی لیے وہ دعائے کمیلؑ کی محفل میں شربت پلانے کے بہانے گھسا رہتا تھا۔ دعائیہ محفل کے اختتام پر عورتیں خانم سے مختلف کاموں کے لیے تعویذ لیا کرتی تھیں۔ یہ کام اسکے شوہر مقدم کو بالکل پسند نہ تھا۔ وہ خوب خوب مذاق اڑاتا جب کہ گاؤں بھر میں اس کی دھوم تھی۔ اس کے تعویذات، دم کیے ہوئے پانی کو لوگ ذوق و شوق سے حاصل کرتے تھے۔ خانم کا ایک اور فن شہرت کا باعث تھا۔ وہ حاضرات میں بھی طاق تھی۔ علم جفر اور رمل کے ساتھ

حاضرات میں ماہر ہونا معمولی بات نہ تھی وہ حاضرات نماز شب کے بعد کیا کرتی تھیں۔ اس کام میں ان کا مددگار سلمان تھا۔

سلمان کا برج میزان تھا۔ ہلکے برج کی وجہ سے وہ بہ آسانی معمول بن جاتا تھا۔ خانم اسے گہری نیند سے اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھا لیتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ ہوا کرتا جس میں وہ خانم کے سوال کا جواب دیکھا کرتا تھا۔ عام طور پر خانم فارسی بولا کرتی تھیں مگر حاضرات کے وقت پہلوی زبان بولتیں۔

اس دن بھی وہ رات کے ڈھائی بجے ایک سائل عورت کے لیے حاضرات کر رہی تھیں۔ اس عورت کا بیٹا بندر عباس میں نوکری کرتا تھا۔ وہ تین ماہ سے گھر نہیں آیا تھا، اسی کے بارے میں پتا کرنا تھا۔

سلمان کو سامنے بٹھا کر خانم نے اس کے ہاتھ میں آئینہ دے دیا تھا پھر انہوں نے کہا تھا ''جاروب کش، آؤ، جاروب کشی کرو۔''

سلمان نے آئینے میں صاف دیکھا، پہلے گھنے بادل دکھے جو آہستہ آہستہ چھٹتے چلے گئے اور ایک جاروب کش ہاتھ میں جھاڑو تھامے جاروب کشی کرتا نظر آیا۔ جھاڑو دینے کے بعد وہ چلا گیا، تب خانم نے کہا۔ ''تخت والے آؤ، تخت بچھاؤ۔''

سلمان نے دیکھا، چار قوی ہیکل سیاہ فام غلام آئے۔ انہوں نے تخت بچھا کر مسندیں لگا دیں، تب خانم بولیں۔ ''شاہ جنات، آؤ، دربار سجاؤ۔'' تبھی ایک خلاف توقع بات ہوگئی۔ ہر بار کی طرح شاہ جنات نظر نہ آیا۔ ایک نوخیز سی شہزادی آ گئی۔ اس نے قدیم دور کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی جیسی چھوٹی سی اونچی سرخ ٹوپی بھی تھی جس میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کی شوخی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے لب لعلیں وا کیے۔ ''کس بدبخت نے میرے آرام میں خلل ڈالا ہے؟''

''مگر آپ شاہ جنات تو نہیں ہیں؟'' خانم کی بجائے سلمان بول اٹھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ تو سلمان صرف ماں کے الفاظ دہرایا کرتا تھا۔ اس حرکت پر خانم چونک گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''پتا نہیں، یہ کون درمیان میں آ گئی؟''

''کون ہے؟''

''میں کیا جانوں، کوئی لڑکی ہے۔ تمکنت و وقار سے شہزادی لگ رہی ہے۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''لگ نہیں رہی ہے، واقعی شہزادی ہوں۔ خاندان نوشیرواں کی چشم و چراغ..... مجھے فاکیہ کہتے ہیں۔'' لڑکی نے شوخ لہجے میں کہا۔

''مگر میں نے تمہیں تو بلایا نہیں تھا، درمیان میں بن بلائے کیوں آ گئیں؟'' سلمان بولا۔ اسے اس لڑکی سے گفتگو کرتے ہوئے مزہ آ رہا تھا۔

''دراصل شاہ جنات تنخواہ میں اضافے کے لیے بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''یہ بکواس ہے؟'' سلمان بولا۔

''بھوک ہڑتال بکواس ہے، پھر تمہاری دنیا میں بھوک ہڑتال کیوں کی جاتی ہے؟'' ابھی وہ کچھ اور بولتی کہ دو تنومند سے سیاہ فام آئے اور اسے کھینچتے ہوئے لے گئے، پھر ایک تاج پوش غلاموں کے جلو میں آیا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ سلمان اسے پہچان گیا۔ وہ شاہ جنات تھا۔ ہر بار وہی حاضر ہو کر جوابات دیتا تھا۔ خانم نے اس سے کئی سوالات کیے اور اس نے مفرور شخص کو دکھا دیا جو ایک گودی پر سامان لاد رہا تھا۔

خانم نے حاضرات ختم کیا۔ اس عورت کو تسلی تشفی دی اور سلمان کو سونے کے لیے بھیج دیا۔

سلمان کمرے میں آ کر لیٹ گیا مگر اس کی آنکھوں سے اس شہزادی کا سراپا محو نہ ہوا۔ وہ جاگتی آنکھوں سے اس کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ اس حسین سراپا کو سوچ ہی رہا تھا کہ دھم سے وہ مجسم آ گئی۔

یکا یک ہی اس کا آ جانا سلمان کو متعجب کر گیا۔ اس نے آنکھوں پر ہتھیلی رگڑی، کئی بار آنکھوں کو مسلا، کئی بار آنکھیں پٹپٹائیں اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ سامنے کھڑی قتالہ عالم سپنا نہیں، حقیقت ہے۔

اس کے یوں تکتے رہنے پر قتالہ عالم کے اب لعلین وا ہوئے۔ اس نے مسکراہٹ کے تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے؟''

''ہاں ایک حسینہ عالم کا حسن آنکھوں میں چبھ گیا ہے۔'' سلمان نے مسکراتے ہوئے جملہ اچھالا۔

''فرہاد سے رشتے داری ہے کیا جو تیر نظر کے نخچیر کی اداکاری کر رہے ہو؟''

''یہ اداکاری نہیں، حقیقت ہے۔ میرے دل میں ایک عجب سی کسک پیدا ہوگئی ہے۔ تم کون ہو، کیوں بار بار میرے سامنے آ رہی ہو؟ انسان تو ہو ہی نہیں سکتیں کیونکہ حاضرات میں اس طرح زندہ افراد نہیں آتے۔''

''تمہارا اندازہ صحیح ہے، میں کبھی مجسم تھی مگر اب نہیں۔ اب تو ایک روح ہوں، ایک ایسی روح جو صرف بھٹکنا جانتی ہے۔'' اس بار اس کا لہجہ مغموم تھا۔

''میرا پیچھا کیوں پکڑا ہے؟''

''تمہاری معصومیت نے مجھے موہ لیا ہے۔ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔''

''اس کا مطلب۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں، صرف دوستی۔ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے عشق کرنے لگی ہوں۔ آخر کو مرد ہونا، عورت کی مسکراہٹ دیکھ کر خود کو گلفام کا برادر خورد سمجھنے لگتے ہو۔''

''زندوں سے مردوں، کی یاری کیسی؟'' سلمان نے آنکھیں تریر کر کہا۔ ''کیا تم مجھے وامق سمجھتی ہو یا فرہاد یا مجنوں؟ میں ایسا نہیں ہوں۔''

''اچھا بھئی، اچھا، تم دودھ کے دھلے ہو، میرے کہنے کا مطلب ہے کہ مجھ سے دوستی کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔''

''ورنہ نقصان میں رہو گے؟ یہی منشاء ہے ناں تمہاری؟''

''یہ تمہارا اپنا خیال ہے، میں ایسی سخت دل بھی نہیں ہوں کہ خوامخواہ کسی کو نقصان پہنچاتی پھروں۔ میں خاندان نوشیرواں کی ہوں۔ ہم تو صرف فائدہ پہنچانا جانتے ہیں، نقصان خود اٹھاتے ہیں۔ یہی ہمارے خاندان کا دتیرہ رہا ہے۔''

''چلو تمہاری بات مانے لیتا ہوں، اب تو جاؤ کیونکہ ممانی جان کو سن گن مل گئی تو سمجھو میری شامت آ گئی۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے، تمہاری ممانی ننگی تلوار ہیں۔ تم لوگوں سے خوب خوب جلتی ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ تم لوگوں کو نکال باہر کریں مگر ڈرو نہیں، اب میں تمہارے ساتھ ہوں، اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے، فی الحال تو میری جان چھوڑو۔''

''تم کہتے ہو تو چلی جاتی ہوں۔'' کہتے ہی وہ اس طرح غائب ہوگئی جیسے بٹن دباتے ہی بلب بجھ جاتا ہے۔

اس کے جاتے ہی سلمان نے شکر کا سانس لیا کیونکہ کوئی بھی کمرے میں آ جاتا تو اس کی شامت آ جاتی، کردار دھول میں مل جاتا۔ چھوٹی بہن کیا سوچتی؟ امی کو کتنا دکھ پہنچتا۔ وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ باہر سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی، پھر برتن گرنے کی آواز گونجی۔ اس نے آواز پہچان لی، وہ ممانی تھیں جو محاذ کھولے لڑنے پر کمربستہ تھیں۔ یقیناً چھوٹی بہن مرجان سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ ممانی تو اسی تاک میں رہتی ہیں۔ انہوں نے فوراً اس غلطی کو لپک لیا ہوگا۔ اب گھنٹے دو گھنٹے تک گولہ باری ہوتی رہے گی۔ سلمان یہی کچھ سوچتا ہوا اپنے ابو کی طرح جو ایسے موقعوں پر سرتاپا چادر اوڑھ لیتے تھے، اس نے بھی اوڑھ لی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا، بالکل اسی طرح جیسے شتر مرغ ریت میں سر ڈال کر خود کو محفوظ تصور کر لیتا ہے۔

وہ ابھی اپنی کوشش میں کامیاب بھی نہیں ہو پایا تھا کہ مرجان نے اندر آ کر اس کی چادر کھینچ لی۔ سلمان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا.....؟''

''بہرے ہو گئے ہو کیا، سنائی نہیں دیتا؟ ممانی نے پیالہ پھینک کر امی جان کا سر پھوڑ دیا ہے۔''

''آں.....! کیا کہا.....؟'' اس کی بات سنتے ہی وہ کمرے سے باہر کی طرف بھاگا۔ آنگن میں اس کی امی سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ان کی انگلیوں سے رس رس کر خون باہر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا امی جان.....؟''

''اس سے کیا پوچھنا ہے، مجھ سے سن، تیری ماں نے میرے بھائی پر سحر چلایا ہے۔ اس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا جسے اس نے روک دیا۔ مرا ہوا بچہ ہوا ہے۔''

سلمان نے زخم پر اپنی امی کے دوپٹے سے پٹی باندھی پھر سر اٹھا کر ممانی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ممانی جان.....! ذرا سوچیں، کوئی اپنوں سے بھی دشمنی کرتا ہے؟''

''چل ناکارہ، منحوس، ہمیں سکھاتا ہے۔ تیری ماں میری دشمنی میں ایسا کر رہی ہے۔ وہ میرے گھر کو تباہ کر کے چھوڑے گی، لیکن میں بھی بخشنے والی نہیں، اس کا حشر شمر لعین جیسا کروں گی۔ دوسرے کے گھر کو تباہ کرتی ہے ناں، کوڑھی ہو کر مرے گی۔'' ممانی خم ٹھونک کر میدان میں

جمی ہوئی تھیں۔

سلمان کی امی جو سدا کی کم گو تھیں، اپنے منہ سے کچھ بھی بولنے پر تیار نہ تھیں، ممانی کا لہجہ، دل کو جلاتی باتیں سلمان کے دل و دماغ میں آگ بھڑکا رہی تھیں۔ مگر میں مجبور تھا، کچھ کر نہیں پا رہا تھا اس لیے امی کو سہارا دے کر وہ ان کے کمرے میں لے کر چلا گیا۔

ابھی وہ اپنی امی جان سے ہی الجھ رہا تھا۔ ''آپ ممانی کے خلاف کیوں کچھ نہیں کرتیں، آپ کے علم کا معتقد ایک عالم ہے اور آپ ممانی سے ڈر رہی ہیں؟''

''کیا کروں بیٹا.....؟ وہ میرے بھائی کی بیوی ہے۔ ہر بہن کی طرح میں بھی اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اسی وجہ سے اسے برداشت کر رہی ہوں پھر مجھے معلوم ہے، اس کا بھائی قاتل ہے، اپنے محلے کے ایک آدمی کی جان لے چکا ہے۔ ایسے شخص سے دشمنی مہنگی پڑتی ہے۔ تم اور تمہارے ابو مجھے بہت عزیز ہیں۔''

''اسے عقلمندی نہیں، بزدلی کہتے ہیں۔'' سلمان نے غصے سے کہا۔ ''اگر آپ پہلے ہی روز انہیں ٹوک دیتیں تو وہ کبھی اول فول نہ بکتیں۔''

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔''

''پتا نہیں، آپ نے کیا سوچ کر ماموں جان کے لیے انہیں پسند کیا تھا۔ ان کا تو پورا خاندان خدائی خوار ہے۔'' ابھی سلمان کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ممانی جان کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں جاروب تھا۔ اسی جھاڑو سے انہوں نے سلمان کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بولتی جا رہی تھیں۔ ''میرا خاندان خراب ہے، ہم خدائی خوار ہیں۔ آج تجھے سبق نہ سکھایا تو میرا نام نہیں۔''

مرجان آ کر ان کے پیروں میں گر گئی، تب جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ بھائی کو بچاتے ہوئے وہ بھی دو چار جھاڑو کھا چکی تھی۔ اگر وہ اکیلی آتی تو شاید کامیاب نہ ہوتی مگر اس کے ساتھ ممانی کی اکلوتی بیٹی فرح بھی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ کیسی ہے یہ سلمان بھی جانتا تھا مگر اس وقت وہ اس کی حمایت میں آئی تھی، اس لیے وہ اسے بری نہ لگی۔

فرح اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی وہاں سے باہر لے گئی۔ مرجان، بھائی کی حالت دیکھ کر رونے لگی تھی۔ جھاڑو کی کئی ضربیں سلمان کے چہرے پر بھی پڑی تھیں۔ اس کے واضح نشانات گالوں پہ، پیشانی پہ ابھر آئے تھے۔ ان نشانوں پر انگلیاں پھیرتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ سلمان نے اسے چپ کرایا۔ امی کو بستر پر لٹا کر سونے کی تاکید کی اور وہاں سے نکل کر اپنے کمرے

میں آ گیا۔

اب بھی اس کی کھال میں جلن ہو رہی تھی۔ جہاں جہاں جھاڑو کی ضرب لگی تھی، وہاں کی چمڑی ورم کر گئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس جگہ کسی نے مرچیں گھس دی ہوں۔ وہ قمیص اتار کر لیٹ گیا۔ اسے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اسے ایسا لگا جیسے اس کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے اپنے ننگے بدن پر چادر ڈال لی اور بیٹھ گیا۔ اب وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا مگر لیمپ کی ٹمٹماتی یرقان زدہ روشنی میں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اسے مغالطہ ہوا ہے، یہ سوچ کر وہ پھر لیٹ گیا، لیکن فوراً ہی چونک گیا اس لیے کہ اسے ایسا لگا تھا جیسے بستر پر اس کے پاس کوئی آ کر بیٹھا ہے۔

''کون.....؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''چوٹ میں جلن ہو رہی ہے؟'' نقرئی گھنٹیوں جیسی آواز تھی۔

''کون.....؟ کون ہو تم.....؟ سلمان نے پوچھا۔

''تمہاری دوست.....!'' وہی آواز پھر آئی۔ اب کی بار اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی جو حاضرات کے درمیان آ گئی تھی۔

''اکیلے.....؟ اکیلے کمرے میں کیوں آ گئی؟ کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا۔''

''ہاں..... ہاں..... گھر میں سب اندھے ہیں ناں.....؟ میری چھوٹی بہن کیا سوچے گی؟ امی کا رویہ کتنا برا ہوگا اور ممانی جان..... وہ تو رائی کا پہاڑ بنا دیں گی۔'' سلمان نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ناں، کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں کسی اور کو نظر ہی نہیں آؤں گی۔ خود سوچو جب میں تمہاری اتنے قریب بیٹھی ہوں تو کیا تمہیں نظر آ رہی ہوں؟''

''مگر تمہاری آواز تو چغلی کھا دے گی؟''

''نہیں.....! میری آواز تمہارے سوا کوئی نہیں سن سکے گا۔''

''پر تمہاری تشریف آوری کی وجہ کیا ہے، یہ بتاؤ گی؟'' سلمان نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

''بس دل نے کہا اور میں آ گئی۔''

''یہ تمہارا دل ہے یا مشورے کی دکان.....؟''

''تم جو سمجھ لو۔''

''تم ٹھہریں روح، اور میں ٹھوس جسم رکھنے والا۔ ایک مردے سے زندے کی دوستی کب ہوتی ہے؟''

''یہی غلط سوچ ہے۔ مردہ پسند کرے تو یقیناً ہو سکتی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اکثر روحانی علم کے ماہر مردوں سے دوستی کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی دوستی عمل اور چلے کے ذریعے ہوتی ہے۔''

''مگر میں تو عالم ہوں اور نہ عامل پھر تم کیوں مجھ پر ریجھ گئیں؟''

''تمہاری معصومیت نے مجھے متوجہ کیا ہے۔''

''اچھا تو گویا تم مجھ سے محبت کرنا چاہتی ہو؟ اپنے ہی خیالات کی نفی کر رہی ہو۔''

''اور کیا.....''

''کوئی ضروری تو نہیں کہ ایک دوسرے کو چھو کر ہی احساس کرایا جائے؟ لمس سے تسکین وہ کرتے ہیں جو جسم سے محبت کرتے ہیں، میں تمہارے جسم سے نہیں، روح سے محبت کرتی ہوں۔''

''محبت کی آخری حد جسمانی ملاپ ہوتا ہے۔''

''واہ بھئی.....! تم تو بہت گہری گہری باتیں کرتے ہو۔ ہمارے عہد میں تو شادی سے پہلے نہ لڑکے کو پتا ہوتا تھا کہ جسمانی لذت کیا ہوتی ہے اور نہ لڑکی کو۔ شادی سے ایک دن پہلے لڑکے کو پورا ایک دن کسی بالا خانے میں گزارنا پڑتا تھا۔ وہاں اسے پہلی بار جسمانی لذت کا ادراک کرایا جاتا تھا۔''

''وہ زمانہ اور تھا، اب ہم ترقی کر چکے ہیں۔ اب دیکھو ناں، تمہارے زمانے میں ریڈیو تھا؟ کتنی دور بیٹھا آدمی جو گا رہا ہو، اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تمہارے زمانے میں مصور ایک تصویر بنانے میں ایک مہینہ لگا دیتا تھا، اب کیمرے کو کلک کیا اور تصویر آ گئی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اس دور میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم جادو کہا کرتے تھے جیسے ٹیلی فون، ریڈیو، ریڈیو گرام، گانوں کے ریکارڈز، ریلوے، موٹر گاڑیاں وغیرہ وغیرہ۔''

''تم اس ماحول میں بھی اپنا جادو چلا رہی ہو۔''

''میں بہت سے علم جانتی ہوں، جن میں سحر و ساحری بھی ہے اسی لیے تو مجھے نجات نہیں مل رہی ہے۔ میری روح کو قرار نہیں، بھٹکتی پھر رہی ہوں۔''

''پھر بھی نجات کی کوشش کرنے کی بجائے خود کو مزید الجھا رہی ہو۔ جاؤ اللہ اللہ کرو! میں بھی نماز شروع کرنے والا ہوں۔''

''تم نے غور کیا ہوگا، جب لوگ ایک خاص عمر کو پہنچ جاتے ہیں، تب نماز، روزے پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ دین کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، جانتے ہو؟ نوجوانوں پر بے راہ روی کا الزام وہ اس لیے لگاتے ہیں کہ وہ خود اس مقام سے گزر چکے ہوتے ہیں، اب ان میں اتنا دم خم تو ہوتا نہیں ہے کہ وہ بھی ان کاموں میں حصہ لے سکیں، اسی لیے جلن کے مارے وہ تنقید کرنے لگتے ہیں اور دنیا سمجھتی ہے، وہ عبادت گزار بن چکا ہے۔''

''واہ بھئی.....! تم تو کفر بکنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔''

''اس کا معقول جواب میرے پاس ہے مگر ابھی دے نہیں سکتی کیونکہ تمہاری امی ادھر ہی آ رہی ہیں، اس لیے میں تو چلی.....!''

اس کے جاتے ہی سلمان نے جسم کے گرد چادر کو مزید بہتر انداز میں لپیٹ لیا اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔ امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے لیمپ کو کارنس سے اٹھایا اور اس کے بستر کے سرہانے میں رکھی تپائی پر رکھ کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا۔ اسے سلمان کے نزدیک رکھ کر انہوں نے چادر ہٹائی اور چوٹ کی جگہ پر گیلا گیلا سا کچھ لگانے لگیں۔ بو سے اندازہ ہوا کہ وہ ہلدی چونے کا لیپ کر رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں جلن ہوا ہو گئی اور سلمان نے سکون کی سانس لی، تبھی امی بولیں۔ ''بیٹا.....! ممانی سے زبان لڑانا بری بات ہے، ادب کے خلاف ہے، بڑوں کی عزت کرنا چاہیے۔''

''امی جان.....! آپ خود انصاف کریں، آخر ہم کب تک اور کتنا برداشت کریں؟''

''اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

''اگر اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے تو کل جو کچھ قم میں ہوا، اسے کیا کہا جائے گا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے علماء کو صابرین کی فہرست میں نہیں رکھا ہے؟' سلمان نے کل کے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا جس نے پورے ایران کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بات معمولی سی تھی۔ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کی بڑی بیٹی شہزادی فرح اپنی ایک امریکن دوست کو لے کر قم میں واقع حضرت امام رضا کے

مزار اقدس پر پہنچی تھی۔ وہ دونوں ہی منی اسکرٹ میں تھیں۔ اس حالت میں اندر جانے پر خدام نے انہیں روکا۔ خدام کا کہنا تھا امام کے مرقد پر کھلے سر جانا بے ادبی ہے، آپ تو جسمانی لحاظ سے بھی ادھ ننگی ہیں۔'' یہ بات شہزادی کو بری لگی اور اس نے خدام کو دھکا دے کر سامنے سے ہٹا دیا۔ یہ منظر ایک عالم دین نے اپنے چوبارے سے دیکھ لیا۔ ان کی عمر پچاسی سال ہے، انتہائی ضعیف ہیں۔ اس منظر نے ان کے غصے کو ہوا دے دی۔ وہ اپنی جگہ سے لرزتے ہوئے اٹھے اور جوانوں کی سی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ انہوں نے آگے بڑھتی ہوئی شہزادی کے بال پکڑے اور کھینچتے ہوئے حرم امام رضا کے باہر پھینک آئے۔ پھر انہوں نے خدام کو حکم دیا۔ ''اب اس عورت کو کسی بھی حال میں اندر آنے نہیں دیا جائے۔''

بادشاہ کی بیٹی کو پاگل کتے کی طرح گھسیٹنا، اسے دھکا دے کر دروازے سے باہر کرنا معمولی بات نہیں تھیں۔ ہر اخبار نے اپنے اپنے انداز میں خبر لگائی تھی۔ شاہ کے حامی اخباروں نے اسے بغاوت قرار دیا تھا جب کہ اسلام پسندوں نے اس اقدام کو صحیح قرار دیا تھا۔ یوں بھی اس وقت اسلام پسند حلقہ شاہ کے خلاف اندر ہی اندر باغی بن رہا تھا۔ آیت اللہ، روح اللہ الخمینی کی تحریک کو مدد دے رہا تھا۔ آیت اللہ خمینی کو کہ ملک بدری کی سزا بھگت رہے تھے۔ فرانس کے شہر میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، پھر بھی ان کی حمایت میں ایک بہت بڑا طبقہ اندر ہی اندر شاہ کے خلاف مزاحمت کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس تحریک کو مصر کے حسن البنیٰ اور پاکستان کی جماعت اسلامی کے سربراہ کی مورل سپورٹ حاصل تھی کیونکہ دنیائے اسلام کی یہ دو بڑی پارٹیاں اسلامی اقتدار لانے میں کوشاں تھیں۔

جب امی نے اس کی تاویل سنی تو وہ بولیں۔ ''بیٹا.....! حرم امام رضا میں جو کچھ ہوا، وہ اسی کا متقاضی تھا۔ کچھ کام ایسے بھی ہونے چاہئیں جن سے لوگ سبق حاصل کریں۔ اگر وہ عالم دین ایسا نہ کرتے تو حرم میں ہر بے پردہ، نیم برہنہ عورت جانا شروع کر دیتی۔ شہنشاہ ایران کو سبق دیا گیا ہے کہ تمہاری حکومت پورے ایران میں ہے، لیکن حرم امام مستثنیٰ ہے۔ یہاں صرف اسلامی قوانین چلتے ہیں۔''

امی سے بحث کرنا سلمان نے مناسب نہیں سمجھا اور پیٹ کے بل لیٹ گیا تاکہ پیٹھ پر لگا لیپ چادر میں نہ لگے۔

اسے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کوئی پھر اس کمرے میں آ گیا۔ کون ہے، یہ

دیکھنے کے لیے اس نے رخ موڑا اور لرز کر رہ گیا۔

دروازے پر ممانی کا خونی بھائی کھڑا اپنی سرخ آنکھوں سے سلمان کو گھور رہا تھا۔

سلمان اسی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ اندر آ گیا، پھر اس نے اس کے سرہانے پہنچ کر بال پکڑے اور جھٹکا دے کر بولا۔ ''تو نے کیا سمجھ کر میری پیاری بہن سے بدتمیزی کی؟''

سلمان کو ایسا لگا تھا جیسے سر کے ذریعے اس کی جان نکل رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے..... اس نے سلمان کے سر کو دھکا دے کر کہا۔ ''آئندہ ایسا کچھ سنا تو گلے پر چھری پھیر دوں گا۔''

سلمان لڑھکتا ہوا بستر کی دوسری طرف جا گرا۔ غصے سے اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ اس نے غصے کے عالم میں اٹھ کر تپائی پر رکھے کانسی کے گلدان کو اٹھایا اور پوری قوت سے مقابل کے سر پر دے مارا۔ ایک نہایت تیز چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی انگلیوں سے سرخ سرخ خون بہتے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ خون دیکھ کر سلمان کو احساس ہو گیا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ اب یہ اسے جان سے مار دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کمرے سے باہر نکلا اور تقریباً دوڑتا ہوا مرکزی سڑک پر پہنچ گیا۔ کہاں جانا ہے، یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد اس جگہ سے دور، بہت دور نکل جانا چاہتا تھا اسی لیے پوری قوت کے ساتھ بالکل سیدھ میں دوڑتا چلا جا رہا تھا تبھی اسے دور سے آتا ہوا ایک ٹرک نظر آیا۔

ٹرک کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ڈرائیور شاید رحم دل انسان تھا، اس کی کم عمری پر اسے رحم آ گیا ہوگا۔ اس نے فوراً ہی ٹرک روک دیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے۔''

سلمان کو معلوم تھا، یہ راستہ ''بام'' کی طرف جاتا ہے۔ بام چھوٹا سا مگر خوبصورت شہر ہے۔ ایک بار وہ ماموں جان کے ساتھ وہاں جا چکا تھا اس لیے اس نے فوراً کہا۔ ''بام.....!''

ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ سلمان اچک کر ادھر چڑھ گیا۔ ٹرک پھر چلنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ ممانی کا بھائی مر چکا ہے، اسے اس نے قتل کر دیا ہے اور قتل کی سزا پھانسی ہے۔ اب اسے پولیس پکڑے گی اور پھانسی پر چڑھا دے گی۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ دنیا کے رنگ و بو سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

''بچے..... ! بام میں کہاں جائے گا؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''میرے ابو جامع مسجد کے امام ہیں، انہی کے پاس۔'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''اچھا اچھا، تو آغائی سعید مختاری کا بیٹا ہے۔ وہ تو بہت بڑے عالم ہیں۔ ان سے میرا سلام کہنا مگر تو ادھر کہاں چلا آیا تھا؟''

''یہاں میرے ماموں رہتے ہیں، ان سے ملنے آیا تھا۔'' سلمان نے پھر جھوٹ بولا۔ زندگی میں ایک ساتھ اس نے اتنے جھوٹ کبھی نہیں بولے تھے جتنے آج بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر جھوٹ بولنے کی مشین لگ گئی ہو۔ وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ نہایت فراٹے سے بولتا چلا جا رہا تھا۔ ڈرائیور شاید باتونی تھا۔ وہ بولا۔ ''آغائی مختاری سے کہنا کہ میں نے تمہیں بہت آرام سے لایا ہے۔'' پھر اس نے ڈیش بورڈ کے خانے کو بائیں ہاتھ سے کھولا اور ایک پیکٹ نکال کر اسے دیا۔ ''لو کھاؤ.....؟''

بھوک کا احساس ہی نہیں تھا مگر جب کھانے کا نام سنا تو بھوک جاگ اٹھی۔ سلمان نے جلدی سے پیکٹ کھولا، پیکٹ میں ''چلو ماہی'' تھا کسی اچھے ہوٹل کا تیار کردہ کیونکہ پیکنگ نہایت نفیس تھی۔ وہ چاولوں کو مچھلی کے ٹکڑے سے ملا ملا کر رکھانے لگا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ڈرائیور نے تھرمس بڑھا دیا۔ سلمان نے جی بھر کے پانی پیا اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ ٹرک چلتا رہا تقریباً دو گھنٹے کے بعد رکا۔

وہ ایک سرائے تھی جہاں اور بھی ٹرک و دیگر قسم کی سواریاں کھڑی تھیں۔

''آؤ چائے پیتے ہیں۔'' ڈرائیور نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

سلمان بھی نیچے اتر آیا۔ بڑی بڑی بنچیں پڑی تھیں۔ ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئے۔ سرو کرنے والا لڑکا تشت میں رکھ کر چائے دانی لے آیا۔ چینی نقاشی والے پیالے میں ڈرائیور نے قہوہ چائے ڈالی، پھر اسے سلمان کی طرف بڑھا دیا۔ سلمان نے پیالہ تھام کر شکر کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔ داہنے گال میں دبا شکر کا ٹکڑا گھل گھل کر چائے کا ذائقہ بڑھاتا رہا۔ چائے پی کر ڈرائیور نے کہا۔ ''بچے..... اب تم گھر جاؤ ہم آرام کریں گے..... دن میں ٹرک شہر میں نہیں لے جا سکتے۔'' پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرارے کرارے کئی نوٹ نکالے اور سلمان کو دے کر بولا۔ ''ٹیکسی کر لینا، اور آغائے مختاری سے میرا سلام کہنا۔''

سلمان کے پاس رقم نام کی کوئی چیز نہ تھی، یہ دو ہزار تومان کے نوٹ اس کے بہت کام آ سکتے تھے، اس لیے اس نے جلدی سے لے لیے۔ وہاں کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں مگر وہ سڑک پر

آ گیا۔ ابھی وہ آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ یکا یک ہی ایک پولیس جیپ اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس جیپ میں بیٹھے ایک پولیس افسر نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ پولیس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا اٹھا تھا۔ نہ تو وہ چور تھا اور نہ ہی رہزن پھر بھی اس کے چہرے پر خوف چھلک آیا تھا۔ جس نے بازرس (پولیس افسر) کو چونکا دیا تھا۔ اس نے سلمان سے پوچھا۔ ''بچے.....! کہاں سے آ رہے ہو؟''

''جی..... اجی.....! گھر سے۔''

''گھر کہاں ہے؟''

''بی جان..... میں بی جان کا رہنے والا ہوں۔''

''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''اپنے والد سے ملنے۔'' اس نے پھر جھوٹ کا سہارا لینا چاہا تھا مگر بروقت اسے احساس ہو گیا کہ پولیس والے نے اگر مولوی صاحب سے پوچھ لیا تو..... اس لیے اس نے کہا۔ ''وہ یہاں مزدوری کرتے ہیں۔ چچا نے بتایا تھا کہ ان سے بس اسٹاپ پہ ملاقات ہو جائے گی۔''

''بچے..... انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے چہرے پر شیطان ناچنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر شیطان محو رقص ہے۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔''

اتنی دیر میں ایک آژان (سپاہی) نے آ کر پیچھے سے اس کی قمیص کے کالر کو پکڑ لیا تھا۔ بحالت مجبوری وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

کلانتری (پولیس اسٹیشن) زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ لوگ فوراً ہی پہنچ گئے۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد افسر اسے کمرے کی طرف لے کر بڑھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں تو بچے..... اب یہ بتاؤ، تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟ اب تک کتنے جرم کر چکے ہو؟''

''دیکھیے جناب، میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔''

''ابھی ہم پتا کر لیتے ہیں۔ اپنے گھر کا پتا بتاؤ تمہارے علاقے کے کلانتری (پولیس اسٹیشن) سے معلومات لے لیتے ہیں۔''

وہ دہل اٹھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر اپنے گھر کا پتہ بتاتا ہوں تو فوراً راز کھل جائے گا کہ میں گھر سے قتل کر کے بھاگا ہوں، اس لیے خاموش رہ گیا۔

اسے خاموش دیکھ کر افسر نے کہا۔ ''کیا ہوا، بولتے کیوں نہیں؟''

''میں...... میں بی جان کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد کا نام ثانی ہے۔'' سلمان نے بالآخر جھوٹ ہی کا سہارا لیا۔

افسر نے اسی وقت وائرلیس سے رابطہ کیا، پھر ایک سپاہی کو بلا کر بولا۔ ''فی الوقت اسے باہر بٹھاؤ، نظر رکھنا، یہ بھاگ نہ پائے۔''

سپاہی اسے لے کر باہر نکل آیا اور ایک بنچ پر بیٹھنے کا کہہ کر ایک دوسرے سپاہی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بنچ پر سر جھکائے بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اب پتا نہیں، میرے ساتھ یہ لوگ کیسا سلوک کریں؟ جہاں ان لوگوں نے وائرلیس میسیج کیا ہے، وہاں سے پتا نہیں کیسا جواب آئے؟ یقیناً میرے خلاف ہی آئے گا۔

ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ وہی افسر غضبناک نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور نزدیک آ کر اس نے سلمان کے گال پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا پھر بولا۔ ''جھوٹ بول کر سب کو پریشان کرتا ہے۔ بتا، تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ تیرا اور تیرے باپ کا کیا نام ہے؟ کس گروہ کے لیے کام کرتا ہے؟''

وہ پے در پے سوالات کر رہا تھا اور سلمان خود کو سزا بھگتنے کے لیے اندر سے تیاری کر رہا تھا کہ وائرلیس اپریٹر نے آ کر افسر کو کوئی پیغام دیا۔ افسر وائرلیس روم کی طرف چل پڑا۔ وہاں پتا نہیں کس سے کیا بات ہوئی کہ افسر نے باہر آتے ہی کہا۔ ''تمہیں پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کہ تم اسدی کے بیٹے ہو، اسد۔ باپ کا نام نامکمل بتانے کی وجہ سے ہی تمہارے بارے میں جواب آیا تھا کہ اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔''

سلمان نے جواب نہیں دیا، صرف سر جھکائے کھڑا رہا، تب افسر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جاؤ، اب دوبارہ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔''

اجازت ملتے ہی سلمان پولیس اسٹیشن سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ پتہ نہیں، کس اسدی نے اسے بیٹا تسلیم کر لیا تھا؟ جب اسے احساس ہوگا تو وہ جوابی میسیج بھی کرا سکتا ہے، اس ڈر سے وہ تیز تیز چل رہا تھا۔

سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا کاریں بھی آ جا رہی تھیں۔ کار والے اجنبی مسافر کو بھی لفٹ دے دیتے تھے۔ ایران کا قانون ہے کہ اگر کار میں جگہ ہے تو مسافر کو بٹھا لینا چاہیے۔ اس

طرح ایندھن کی بھی بچت ہوتی ہے اور لوگ پریشانی سے بھی بچ جاتے ہیں۔ کار میں بیٹھنے والے کو ٹیکسی کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ شہر میں کسی بھی جگہ جائیں، کرایہ دو تومان بنتا تھا۔ کار والا کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو اسے یہ دو تومان لینا ہی پڑتے۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ دینے پر ایک کار والے نے کار روک دی اور اسے ساتھ بٹھا کر شہر کی طرف چل پڑا۔ پہلے سلمان نے کار والے کی طرف توجہ نہیں دی تھی مگر اب جو اسے دیکھا تو اس کا خون خشک ہو گیا۔ وہ پولیس کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سینے پر لگے بیجز بتا رہے تھے کہ وہ کوئی بڑا افسر تھا۔ سلمان نے دل ہی دل میں دعا پڑھنا شروع کر دی کہ یہ شخص مجھ سے کوئی سوال نہ کرے۔ وہ شخص خود میں الجھا ہوا تھا یا پھر کم گو تھا کیونکہ اس نے اب تک کوئی سوال نہ کیا تھا اور کار بام میں داخل ہو رہی تھی۔

''آغا...... ! بس یہیں اتار دیں۔'' سلمان نے کہا تو اس نے کار روک دی۔ اس نے نیچے اتر کر دو تومان کا نوٹ نکالا اور کار والے کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے مسکرا کر نوٹ سلمان کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''بچہ...... ! یہ رقم میری طرف سے تمہارے لیے ہے، رکھ لو۔''

سلمان نے شکریہ کہا اور ایک گلی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جلد از جلد اس شخص کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ گلی کافی لمبی ثابت ہوئی۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ یکایک ایک دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی۔ اس نے سلمان کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''تو کہاں چلا گیا تھا؟ تجھے کچھ خبر ہے؟''

سلمان گھبرا کر خود کو اس کی پکڑ سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ بھی ہو، وہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا۔ قد کاٹھ بھی اچھا تھا۔ اگر کسی کی نظر پڑ جاتی کہ ایک غیر محرم عورت اسے یوں سرِ راہ بانہوں میں لینے کی کوشش کر رہی ہے، دھڑا دھڑ پیشانی پر بوسے لیے جا رہی ہے تو اسے سنگسار کر دیا جاتا۔

وہ عورت بیچ بیچ میں کہتی جا رہی تھی۔ ''میرے بیٹا [illegible] !'' سلمان کو اطمینان ہوا کہ وہ کسی مغالطے میں ہے اور مجھے اپنا بیٹا سمجھ رہی ہے۔ جواب میں وہ کچھ کہتا کہ اندر سے ایک آدمی نکلا اور اس نے بغیر کچھ پوچھے تڑاتڑ اس عورت کے طمانچے برسانا شروع کر دیئے سلمان سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ گورکھ دھندہ کیا ہے؟ وہ کیوں مار رہا ہے؟ ساتھ ہی ساتھ وہ شخص کچھ بول بھی رہا تھا مگر اس کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس کے سامنے والے تمام دانت اکھڑے ہوئے تھے اور وہ تیزی سے بول رہا تھا اسی لیے الفاظ صاف ادا نہیں ہو رہے تھے، تبھی کئی

اور لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر آ گئے۔ انہی لوگوں نے سلمان کو اس کے چنگل سے چھڑایا۔ اب وہ عورت اسے مارنے والے سے الجھی ہوئی تھی۔ زبانی گولہ باری زور و شور سے جاری تھی۔ اسے چھڑانے والوں میں سے ایک نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں تھے کیوں ستا رہے ہو؟''

سلمان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اسی لیے وہ خاموش کھڑا تھا۔

''بولتے کیوں نہیں ہو؟'' کوئی شخص بولا۔ ''اس عمر میں ماں باپ کو کوئی اس طرح ستاتا ہے؟''

اس نے پھر بھی چپ نہ توڑی، تب وہ جھنجلا کر بولا۔ ''آئندہ پھر ایسی حرکت کی تو ہم سب مل کر تمہیں محلے سے نکال دیں گے۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔''

وہ عورت سلمان کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے جانے لگی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سامنے ہی سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار لڑکیاں دیکھی تھیں مگر اتنی خوبصورت لڑکی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس جہان کی تو ہے ہی نہیں، کسی اور دنیا سے بھٹک کر آ گئی ہے۔

❁

''گویا تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو؟'' سلمان نے جھنجلا کر کہا۔

''اے لو..... میں تو تمہارے دل کی بات اپنی زبان سے ادا کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ ہر جان دار اپنے جوڑے کو حاصل کر کے اپنی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ تم نے اگر اس لڑکی کو پسند کیا ہے تو برا کیا ہے۔ یہ تمہارا حق ہے۔'' فاکیہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ جیسے اسے سمجھانا چاہتی ہو۔ اسے ننھا سا بچہ سمجھ رہی ہو۔

''قدرت کی صناعی پر ستائشی نظر ڈالنا انوکھی بات نہیں ہے۔ ہر اچھی چیز پر نظریں خود بخود ٹک جاتی ہیں۔ وہ لڑکی بھی خوب صورتی کا مرقع ہے۔ اس لیے تعریفی نظروں سے اسے دیکھ لیا، کیا برا کیا؟'' سلمان نے جل کر کہا۔

''بالکل برا نہیں کیا، وہ ہے ہی اتنی خوبصورت کہ اسے جو بھی دیکھے گا بھرپور نظر سے دیکھے گا۔ تم نے بھی اسی نظر سے دیکھا ہو گا۔ اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے جس نے ڈالی بری نظر ڈالی..... خیر چھوڑو اس بحث کو، یہ بتاؤ تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہے کہ ایک انجان شہر میں

ایک انجان گھرانے نے تمہیں اپنا بیٹا کیسے مان لیا؟''

''ہاں یہ حیرت کی بات ضرور ہے۔ تم اگر نہ آتیں تو میں اسی نکتے پر غور کر رہا ہوتا۔''

''اگر یہ جگہ نہ ملتی تو تم بھٹکتے رہتے اور کسی آژان (سپاہی) کے ہتھے چڑھ کر کلانتری (تھانہ) پہنچتے اور بازرس (انسپکٹر) آوارہ گردی کے جرم میں زندان بھیج دیتا۔ اس لیے میں نے یہ انتظام کیا ہے۔ ان لوگوں کا اکلوتا بیٹا تہران گیا ہوا ہے بلکہ گھر سے فرار ہو کر گیا ہے۔ اس کے آنے کی ابھی کوئی امید نہیں ہے اسی لیے میں نے ان لوگوں کی نظروں میں پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں اپنا بیٹا اور بھائی سمجھنے پر مجبور ہیں اس طرح تمہیں ایک معقول ٹھکانہ مل گیا ہے۔''

''اگر یہ سحر ٹوٹ گیا تو؟''

''اتنی جلدی سحر نہیں ٹوٹے گا۔ پھر تب تک تم کوئی معقول انتظام کر لو گے۔'' ابھی ان کی باتیں جاری تھیں کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور ایک لمحے میں فاکیہ غائب ہو گئی۔ بالکل ایسے جیسے روشن بلب سوئچ بند ہوتے ہی اپنی روشنی کھو دیتا ہے۔ سلمان دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے امید تھی کہ شیریں آئے گی۔ دراصل انسان ازل کا پاگل ہے۔ صرف اپنی پسند کو مقدم جانتا ہے۔ اپنے ہی خواب کو تعبیر دیتا ہے۔ شیریں اس کے دل کو بھا گئی تھی اسی لیے وہ اسی کے لیے نظریں فرش راہ کیے تھا مگر جب دروازہ کھلا تو روحیہ کا چہرہ سامنے تھا۔ شوخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے تشت سنبھال رکھا تھا۔ تشت پر خوان پوش پڑا تھا اس لیے اندر کی چیزیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہاں آتے ہی اسے دونوں بہنوں کا نام معلوم ہو گیا تھا۔

روحیہ نے تشت لا کر اس کے بستر پر رکھا پھر بولی۔ ''بھائی! اگر سونے سے فرصت پا چکے ہو تو پیٹ کی آگ بجھا لو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے سالن بنایا ہے، صرف تمہارے لیے۔''

سلمان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ روحیہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی ہے۔ اسے دیکھ کر سلمان کو اپنی بہن یاد آنے لگی کہ اس کی جدائی میں پتا نہیں اس نے اپنی حالت کیا بنالی ہو گی۔ امی پر کیا گزری ہو گی۔ وہ کتنا روئی ہوں گی۔ ابا نے کتنا غم منایا ہو گا۔ ممانی جان نے تو سب پر ظلم کا پہاڑ توڑنا شروع کر دیا ہو گا۔ اپنے بھائی کا بدلہ امی سے لیا ہو گا۔ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ تب ہی روحیہ بولی۔

''کن خیالوں میں کھوئے ہو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

سلمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر خوان پر نظر ڈالی۔ ابلے ہوئے برنج

(چاول) دال عدس (مسور) اور ترہ (ساگ) الگ الگ کٹوروں میں تھے۔ کھانا دیکھ کر بھوک جاگ اٹھی اور اس نے خوان کو نزدیک کر کے کھانا شروع کر دیا۔

ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ لوگ لڑ رہے ہیں۔ کوئی شخص نہایت تیز تیز اور اونچی آواز میں بول رہا تھا اس آواز کے ساتھ بڑی بی کی آواز تھی۔ جو نسبتاً نیچی مگر غصے میں بھری ہوئی۔ سلمان نے روحیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔ بعض سوال زبان کے محتاج نہیں ہوتے۔ نظروں ہی سے منزل پا لیتے ہیں۔ سلمان کی نظروں کے سوال نے بھی روحیہ تک مطلب پہنچا دیا۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''اولاد موش کور ہے۔''

''کون؟''

''ارے واہ یہ خطاب تو آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ ارے وہی محمود سعادی ہے۔ سود خور محمود سعادی۔''

''اچھا اچھا۔'' سلمان نے یوں کہا جیسے وہ محمود سعادی کو جانتا ہو۔ دراصل اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ روحیہ کو مطمئن کرنے کے لیے اچھا اچھا کہا تھا پھر ہاتھ دھونے بیسن پر چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''یہ آج ادھر کیسے آ گیا۔''

''یہ لو تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ہو۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''کمینہ اپنا ادھار مانگنے آیا ہے۔''

سلمان سوچ میں پڑ گیا اسے پہلے ہی احساس تھا کہ یہ گھر والے معاشی اعتبار سے بہت کمزور ہیں۔ گھر کے اسباب نے یہ راز بہت پہلے اس پر عیاں کر دیا تھا۔ اس کمرے میں کیا تھا؟ زمین پر بوسیدہ دری بچھی ہوئی تھی۔ مغربی سمت کی دیوار کے ساتھ وہ سریر (چارپائی) تھی جس پر موٹی دری اور بدرنگی چادر تھی۔ وہ اسی پر تو بیٹھا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر روحیہ بولی۔ ''اماں نے اس سے جھوٹا وعدہ کر لیا تھا کہ میرا بیٹا کمانے گیا ہے لوٹ کر آئے گا تو تمہارا قرض دے دوں گی۔ اسے جیسے ہی خبر ملی ہوگی کہ تم آ گئے ہو تو وہ دوڑا چلا آیا۔''

''ہنہ!'' سلمان نے ہنکارا بھرا پھر بولا۔ ''اب رقم کہاں سے ادا کریں گی؟''

''اس کمینے نے ایک کمینی شرط رکھی ہے کہ اگر باجی کی شادی اس سے کر دی جائے تو وہ قرض معاف کر دے گا۔''

''شیریں کا کیا کہنا ہے۔''

''باجی! اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' روحیہ نے منہ بنا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔

اس کی بات غلط نہ تھی محمود سعادی کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ اس پر تھوکنے والا بھی کچھ دیر سوچے گا کہ کہیں اس کا تھوک گندا تو نہیں ہو گا ناں۔ اس کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور تھے۔ ان مشہور لطیفوں میں سے ایک لطیفہ کچھ زیادہ ہی شہرت پا گیا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور آدمی تھا۔ چرب زبانی اس کی وجہ شہرت تھی اور چھوٹا قد اس کی پہچان تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی اس لیے اسے ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا تھا اور پھر بخالت کی ہجو بھی اڑائی جاتی۔ کنجوسی کے ایسے ایسے قصے مشہور تھے کہ لوگ سن کر ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیتے تھے۔

بلدیاتی انتخابات کا اعلان ہوا تو ہر طرف گہما گہمی شروع ہو گئی۔ اس حلقے سے بھی کئی امیدوار کھڑے ہوئے۔ محمود کے ایک عزیز، رضا شاہ پہلوی کی آشیرواد والی پارٹی کا ٹکٹ لے آئے۔ یار لوگوں نے محمود کو اکسا دیا کہ وہ کل کا چھوکرا امیر بلدیہ (میونسپل کمشنر) بن جائے گا۔ تم بھی کھڑے ہو جاؤ۔ علاقے کا رای (ووٹ) تمہیں ملے گا۔ کل اخبار میں موٹی موٹی سرخی میں آئے گا۔ ''محمود بلا معارض انتخاب شد۔'' (محمود بلا مقابلہ منتخب ہو گیا) صاحب بہادر نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور تماشہ بن گئے۔ انہیں صرف ایک ووٹ ملا اور یہ ووٹ بھی ان کا اپنا تھا۔ یار دوستوں کی بات الگ رہی خود ان کے گھر سے کسی نے انہیں اہل نہ سمجھا۔ بیوی تھی نہیں کہ اسے رعب میں لا کر ایک ووٹ اور لے لیتے۔

جلسے خوب کیے۔ مزہ لینے کو یاروں نے جلسے کرائے اور اس بہانے پیٹ اور جیب دونوں بھرے۔ سب کا کہنا تھا بخیل کا مال، مال غنیمت کی طرح حلال جو نہ کھائے وہ گناہ گار ہے۔ ایسے ہی ایک جلسے میں ایک دبیر (اسکول ٹیچر) کا تحریر کردہ لیکچر دینے کھڑے ہوئے۔ تقریر شروع کی۔ ''عزیز بھائی بہنو!''

مجمع سے آواز آئی۔ ''یہاں سب بھائی ہیں۔ ساری بہنوں کو بہنوئی لے گئے۔''

انہوں نے مجمع پر نظر ڈالی بات سچ تھی۔ دور دور تک کسی عورت کا پتا نہیں تھا۔ اس نے ایک دوست کو بلا کر پوچھا۔ ''عورتیں کہاں گئیں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''آج ٹی وی پر مقابلہ آرائش و زیبائش ہے سب وہی دیکھ رہی ہوں گی۔''

''اچھا اچھا کوئی بات نہیں، ان عورتوں کے مردوں سے بات کیے لیتا ہوں۔ یہ جا کر عورتوں کو سمجھا دیں گے۔'' کہہ کر محمود نے گلا صاف کیا اور کڑے لہجے میں دوبارہ تقریر کی شروعات کی۔ ''بھائیو! آپ جانتے ہیں میں عوامی خدمت کے لیے کتنا تڑپتا ہوں۔ بغیر لالچ کے خدمت کرتا رہتا ہوں۔''

''کب کس کی خدمت کی۔'' بھیڑ سے کسی نے جملہ کسا مگر محمود بات پروف بنے رہے۔ ''اب میں نے سوچا کہ.....'' تب ہی مجمع سے آواز آئی۔ ''کھڑے ہو کر تقریر کریں۔''

محمود بولے۔ ''بھائی کھڑا ہوں۔''

''نظر نہیں آ رہے ہیں اسٹول پر کھڑے ہو جائیں۔''

محمود منمنا کر بولے۔ ''اسٹول ہی پر کھڑا ہوں۔'' اس کے چھوٹے قد سے متعلق یہ لطیفہ اتنا چلا کہ وہ ہار کر بیٹھ گئے لیکن بہت دنوں تک ان کے کانوں میں آوازیں آتی رہیں۔

''اسٹول پہ کھڑے ہو جاؤ۔''

محمود کا قد ہی چھوٹا نہ تھا۔ رنگ بھی کالا تھا۔ نہ صرف رنگ کالا تھا بلکہ چیچک کے گہرے گہرے داغ بھی تھے۔ جوانی میں ایک بدنصیب پلے بندھ گئی تھی جو دو سال قبل خون تھوکتے تھوکتے مر گئی۔ تب سے وہ اکیلا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی بھی طرح پھر سے گھر بسا لے مگر اس عمر اور چہرے پر اسے کوئی بھی لڑکی دینے پر تیار نہ تھا۔ اپنی اسی کمی کو اب وہ عیاری سے پوری کرنے کی کوشش میں تھا اور اسی سلسلے میں اس نے شیریں کے والدین پر ایسی شرط عائد کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ لوگ رقم تو دینے سے رہے، ہاں بیٹی ضرور دے دیں گے۔ بیٹی بھی ایسی کہ چاند دیکھے تو شرما جائے۔ شیریں کا حسن ہی ایسا تھا۔ کافی عرصے سے شیریں پر نظریں جمائے ہوئے تھا تقریباً چھ ماہ پہلے اس نے ایک سازش بھی کی تھی۔ بہت معمولی سازش مگر انتہائی خطرناک سازش۔ یہ سازش اس گھر کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ دن کسی کو بھولتا نہیں، خاص کر شیریں کو اس کے بھائی، باپ، ماں اور احمد ہانی۔ ان سب کے ذہن میں وہ دن منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔

اس دن احمد ہانی اپنے گھر میں نہار غلیان (ناشتے) میں مصروف تھا۔ وہ چند ماہ پہلے ہی اس محلے میں آیا تھا۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ اس دور میں عام طور پر لڑکے داڑھی رکھنے سے گریز کرتے تھے کیوں کہ یہ شاہ دشمنی کے ذمرے میں آتا تھا۔ انہیں بیک ورڈ کا خطاب ملتا تھا۔ ملا کہہ کر تضحیک کی نظر سے دیکھا جاتا۔ ادارہ شہر بانی (پولیس) بھی انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتی تھی

کیوں کہ آیت اللہ روح اللہ الخمینی نامی ایک عالم مسلسل اس کوشش میں کوشاں تھے کہ شاہ کا تخت الٹ دیا جائے۔ شاہ نے انہیں ملک بدر تو کر دیا تھا اور وہ پیرس کے مضافات میں پناہ لیے بیٹھے تھے مگر وہاں سے بھی ان کی کوشش جاری تھی۔ اکثر مولوی ان کے لیے کام کرتے تھے۔ اس لیے ادارہ شہر بانی مولویوں کو نظروں میں رکھے ہوئے تھی اس وجہ سے لوگ داڑھی رکھنے سے اجتناب کرتے تھے مگر احمد ہانی نے داڑھی رکھی تھی۔ اس کی بیوی بھی شرعی پردے کی پابند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی وہ چونک اٹھی۔ دوسری دستک پر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے خوف زدہ آواز میں شوہر سے کہا۔ ''یہ صبح صبح اتنی زور زور سے کون دستک دے رہا ہے۔''

''ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' احمد ہانی نے ناشتے سے ہاتھ روک کر کہا۔

''نہیں آپ ٹھہریں میں دیکھتی ہوں، کہیں آژان (پولیس) نہ ہو۔''

''نہیں میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے بہت سارے لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک قد آور شخص بھی تھا۔ اس نے شوخ رنگ کا بش کوٹ اور پینٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے کندھے کافی چوڑے تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ دیکھنے سے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ پابندی سے ورزش کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں تیز اور چھوٹی تھیں۔ احمد ہانی کو وہ پہلی ہی نظر میں پسند نہ آیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جاہل مطلق اور اجڈ ہے۔ مہذب بھی نہیں ہے۔

''فرمائیے۔'' احمد نے اسے نظر انداز کر کے ایک درمیانی عمر کے شخص سے پوچھا۔ ''کیا کام ہے مجھ سے؟''

''شاید آپ نئے آئے ہیں۔'' قد آور شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''مجھے رونقی کہتے ہیں۔ باقی تعارف بعد میں ہو جائے گا۔ آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ ایک ضروری کام ہے۔''

احمد نے بھانپ لیا تھا کہ تمام لوگ رونقی کے فرمانبردار معلوم ہوتے ہیں۔ خاص کر ایک پستہ قد تو کچھ زیادہ ہی اس کی ہاں میں ہاں اس طرح ملا رہا تھا جیسے اسی کا دیا کھاتا ہے۔ دیگر لوگ بھی خاصے معقول اور معزز نظر آتے تھے مگر رونقی کے آگے گویا دم ہلا رہے تھے۔ وہ سب رونقی کے اشارے پر اس کے ساتھ چل پڑے۔ احمد نے بھی اس کی تقلید کی مگر اسے یہ سب پسند نہیں آ رہا تھا۔

''اس محلے کی ہر عورت میری عزت ہے۔'' رونقی آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''جب رونقی زندہ ہے کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں اخی ساجدین۔'' اس

نے برابر میں چلتے ہوئے شخص سے کہا۔

ساجدین نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا فرمانا بجا ہے۔ محلے کی عزت آبرو کا خیال رکھنا عین اسلام ہے۔ کارثواب ہے کیوں محترم صالح۔'' ساجدین نے اپنے پیچھے والے کو مخاطب کیا۔ ''جی ہاں آپ کی بات سو فیصد صحیح ہے۔''

صالح کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھا اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ سوال پر اس نے کہا۔ ''جی ہاں آپ بجا فرما رہے ہیں۔'' پھر قدرے جھک کر ساجدین سے بولا۔ ''تمہیں کچھ پتا ہے، لڑکی کس گھر کی ہے۔''

ان کے پیچھے چلنے والے نے گردن لمبی کر کے کہا۔ ''ہاں یہ بات بہت ضروری ہے۔ ہم سب بہو بیٹی والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس کی تین بن بیاہی بیٹیاں گھر بیٹھی تھیں اور بہو ایک بھی نہیں تھی۔ اس کے تین بیٹے تھے اور تینوں کے تینوں نکھٹو تھے۔ اچانک ہی اسے خیال آیا تھا کہ کیا اس کی تینوں بیٹیاں گھر میں ہی بیٹھی ہیں یا..... اس نے اپنا خیال بدلتے ہوئے غصیلی نظروں سے رونقی کی طرف دیکھا تھا جو سینہ تانے سب سے آگے چل رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ۔'' صالح نے ساجدین کو ٹہوکا دے کر پوچھا۔

''یہ بات بہت ضروری ہے۔ ہمیں پتا تو چلنا چاہیے کہ وہ چھوکری ہے کون! ہم سب عزت دار لوگ ہیں اور اس کمینے کا کوئی بھروسا نہیں۔''

رونقی واقعی کمین فطرت تھا اس سے سب ڈرتے تھے۔

صالح بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بھی دو بیٹیاں دو بہوئیں تھیں۔ اس نے اپنے آگے چلنے والے سے کہا۔ ''یہ اپنے محترم ساجدین پوچھ رہے ہیں کہ پہلے لڑکی کے بارے میں پوچھ لینا چاہیے۔ ہم سب بہو بیٹیوں والے ہیں۔''

رونقی ایک دم رک گیا۔ اس نے مڑ کر صالح سے پوچھا۔ ''کیوں برادرم رک کیوں گئے؟'' احمد ہانی جوان لوگوں کی باتوں سے کچھ اندازہ لگا چکا تھا۔ رونقی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''محترم بات سنیں، سب لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟''

''کیا بات ہے بے؟'' رونقی نے قہر آلود نظروں سی گھورتے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہو کس سے مخاطب ہو۔''

احمد ہانی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ صالح دونوں کے درمیان میں آ گیا۔ ''یہ صاحب اس محلے میں نئے آئے ہیں، انہیں ابھی پوری واقفیت نہیں ہے۔'' پھر وہ احمد ہانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''یہ اپنے برادر رونقی محلے کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ کسی کا کوئی کام اٹکا ہوا ہو تو ان کی مہربانی سے فوراً ہو جاتا ہے۔ ادارہ آگاہی، ادارہ شیر بانی، ادارہ بہداری (محکمہ صحت) امیر بلدیہ سب ان کے جاننے والے ہیں۔'' پھر وہ احمد ہانی کا کندھا دباتے ہوئے بولا۔ ''بس ذرا مزاج کے تیز ہیں، پر دل کے برے نہیں ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''اور کیا' ان کے ایسا کام آنے والا بندہ علاقے میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔'' محمود نے گردن اونچی کر کے دخل دیا۔

''میرا نام احمد ہانی ہے۔ میں تو بس آپ لوگوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔'' احمد ہانی نے محمود کی بات نظر انداز کر کے صالح کے جواب میں کہا۔

ساجدین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''محترم صالح بات غلط نہیں ہے..... پتا تو چلنا چاہیے لڑکی ہے کون؟''

ایک تیسرے شخص نے بھی لب کھولے۔ ''ہاں لڑکی کا اتا پتا معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا۔ تجسس ختم ہو جاتا۔''

رونقی نے کولہے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کس بات کا تجسس؟ میں نے اسی لیے تو آپ لوگوں کو اکٹھا کیا ہے کہ آپ لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ میری کیا مجال کہ میں کسی کی بہو بیٹی کو بدنام کروں۔''

''واہ جناب! آپ تعلیم یافتہ دوائر دولتی (سرکاری حلقے) کے ہوتے ہوئے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ میں اس کا نام بتا دوں اور جب ہم وہاں پہنچیں تو لڑکی فرار ہو چکی ہو اس طرح تو سب مجھے جھوٹا کہیں گے۔ ویسے میں بتا دوں کہ واقعی میں اس لڑکی کا نام نہیں جانتا۔''

ایک نوجوان نے پوچھا۔ ''استاد محترم لڑکی اسی محلے کی ہے؟''

رونقی نے اس نوجوان کو یوں دیکھا جیسے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ ''میں نے محلے کی عزت کے خیال سے آپ لوگوں کو ساتھ لیا ہے ورنہ میں شہر بانی سے آثر گان کو بھی بلا سکتا تھا، جسے شرم آ رہی ہے وہ واپس چلا جائے۔''

لیکن کوئی شخص واپس نہیں گیا بلکہ کچھ اور لوگ اس کارواں میں شامل ہو گئے..... بالآخر

سب اس مکان تک پہنچ گئے۔

رونقی نے پہلے باہر سے لگی کنڈی کھولی پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس نے دو تین مرتبہ اور دروازے پر ہاتھ مارا تو دروازے کی چولیں اکھڑ جائیں گی۔ اندر سے کسی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جلدی سے دروازہ کھولو۔'' رونقی نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''باہر تمہاری برات کھڑی ہے۔''

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور بیس اکیس سالہ نوجوان نے باہر دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔

''کیا بات ہے؟ آپ اتنے زور زور سے دروازہ کیوں پیٹ رہے تھے؟''

رونقی نے نوجوان کو گریبان سے پکڑ کر اندر کی طرف دھکیلا اور خود بھی اندر گھس آیا۔

''یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' نوجوان نے ناکام مزاحمت کی۔

''محترم ساجدین آپ اندر آئیں۔'' رونقی نے مڑ کر کہا۔ ''محترم صالح آپ بھی آئیں محترم نووارد کیا نام بتایا تھا ہاں احمد ہانی آپ بھی اندر آجائیں۔ میرے ہوتے ہوئے اس محلے میں حرام کاری نہیں چل سکتی۔''

ہجوم خود ہی اندر آ گیا تھا۔ رونقی نوجوان کو دھکیلتا ہوا بیڈ روم میں لے گیا۔ وہ خالی تھا پھر اسے کھینچتا ہوا اوَنج میں لے گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔

''اوئے بتا اپنی ہوتی سوتی کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔'' رونقی نے نوجوان کے گریباں کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اتنی دیر میں ایک لڑکے نے اندر سے آ کر کہا۔

''وہ آتش پرخانہ (کچن) میں ہے۔''

سب ادھر بڑھے۔ کچن کے فرش پر گھٹنوں میں سر دیے ایک لڑکی بیٹھی سسک رہی تھی۔

''لڑکی چہرہ اٹھاؤ کون ہو تم۔'' صالح نے آگے بڑھ کر کہا۔ لڑکی نے سر اٹھایا تو سب نے پہچان لیا۔ وہ حسین بادانی کی بیٹی شیریں تھی۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''یہ روزانہ میرے پاس پڑھنے آتی ہے۔''

''اور تم اکیلے گھر میں اسے دروازہ بند کر کے پڑھاتے ہو۔'' رونقی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، آج کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔''

احمد ہانی اس کی بات پر یقین کر رہا تھا کیوں کہ وہ بھی ایسے حالات گزر چکا تھا۔ پھر اس نے اپنی نظروں سے کنڈی کھلتے دیکھا تھا۔ اس لیے اس کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا پھر بھی محمود کا پلان کامیاب ٹھہرا تھا۔ شیریں بری طرح بدنام ہو گئی تھی۔ ہر کوئی اس پر اور اس کے گھر پر انگلیاں اٹھا رہا تھا۔ اس کا بھائی بھی شرمندگی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ محمود کو پورا یقین تھا اب جب وہ رشتہ ڈالے گا تو سب راضی ہو جائیں گے مگر یہاں الٹا یہ ہوا تھا۔ حسین بادانی کا پورا گھرانہ مخالفت پر آمادہ تھا۔ اسی لیے اس نے رقم کی وصولی کے لیے دباؤ بڑھا دیا تھا۔ احمد ہانی کی زوجہ کئی بار آ کر شیریں کی ماں کو حوصلہ دے گئی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔ اپنی بیٹی کو زندہ درگور نہ کریں۔ احمد ہانی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے ہیں۔

ابھی وہ لوگ اس مسئلے کا حل ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ قسمت نے بلکہ فاکیہ نے اس گھر میں سلمان کو لا پھینکا۔

رقم حاصل کرنا سلمان کے لیے اتنا ہی دشوار تھا جتنا چاند کو چھونا اگر اس کے پاس رقم ہوتی تو وہ گھر سے فرار کیوں ہوتا۔ اپنی ماں بہن کا سہارا بنتا نا کہ ظلم کی چکی میں پسنے کے لیے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ آتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی پریشانیاں دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اگر اسے ایک بڑی رقم ہاتھ آ جائے تو وہ انہیں محمود کے چنگل سے بچا لے گا۔ اپنی پسند کو دوسرے کے قبضے میں جاتے ہوئے کون دیکھ سکتا ہے؟ وہ بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ روحیہ نے بتا دیا تھا کہ محمود نے کل تک کا وقت دیا ہے کہ اس کا قرض مع منافع لوٹا دیا جائے ورنہ وہ قانون کا سہارا لے کر سب کو قید کروا دے گا اور اس گھر پر قبضہ کر لے گا۔''

''اس گھر پر'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے کھلے ہوئے دروازے سے آنگن میں نظر ڈالی۔ ''بہنا! یہ گھر ہے، ٹوٹی ہوئی دیواریں جس کے پلستر تک جھڑے زمانہ گزر گیا ہے۔ چھوٹا سا آنگن۔ فقط دو کمرے اور ایک برآمدہ۔ برآمدہ بھی ایسا کہ اس کی ہمواری غائب۔ جگہ جگہ کھڈے پڑے ہوئے۔ اسی برآمدے پر ایک جانب آتش پرخانہ (باورچی خانہ) جس سے اٹھتا دھواں برآمدے میں بیٹھے شخص کو چین نہ لینے دے کیوں کہ دھوئیں کا نکاسی کے لیے بنایا گیا پائپ پڑوس کی دیوار و چھجے کی وجہ سے بند پڑ چکا ہے۔ نکاسی آب و آب رواں کا نظام انتہائی ناقص۔ اسے گھر کہنا گھر کی توہین ہے۔ تب ہی اس کی نظر سر پہ سیاہ اسکارف لپیٹے، لکڑیاں جمع کرتی ہوئی خانم پر پڑی جس نے اسے بیٹا کہہ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ یہی وہ وقت ہے جب وہ بیٹا بن کر ان کی

پریشانیوں کو کم کرسکتا ہے۔اس سوچ کے تحت اس نے آواز دی۔''خانم''

''جان مادر!''بڑے سے لہنگے کو سنبھالتی ہوئی بڑی بی اس کے پاس آ گئی۔

''خانم! محمود کی رقم کتنی ہے؟''سلمان نے سوال کیا۔

بڑی بی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے ان کے اندر حیرت کے سمندر نے کروٹ لی ہو۔وہ آگے بڑھیں اور اس کے سر پر ممتا نچھاور کرتے ہوئے ہاتھ پھیر کو بولیں۔''جان مادر تو کیوں فکر کرتا ہے۔پدر بزرگوار کوشش میں ہے۔کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو جائے گا۔''

''اور اگر کل تک انتظام نہ ہوا تو پھر گل صنوبر جیسی شیریں کو عفریت جیسے محمود کے حوالے کردے گی۔نہیں میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔بول کل کتنی رقم کا انتظام کرنا ہے۔''

بڑی بی کی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی آ گئی۔اس نے ہتھیلی کو آنکھوں پر پھیر کر کہا۔

''جان مادر کاش یہ جملہ تیرا ابا بول سکتا۔اف کس قدر وہ تجھ سے مایوس ہے۔کتنی نفرت سے وہ کہتا ہے کہ کاش میں نے اس کی پرورش نہ کی ہوتی۔جوان بیٹا بوڑھے باپ کی لاٹھی ہے مگر میرا بیٹا خون آشام بلا کی طرح میری ہڈیوں کو چوس رہا ہے۔اسے ذرا بھی گھر کی پرواہ نہیں ہے۔''

''ماں! مجھے صرف تیری پرواہ ہے۔بس تیرے لیے ہی میں پوچھ رہا ہوں۔''

بڑی بی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر بولی۔

''ساٹھ ہزار تومان۔''

یہ رقم معمولی نہ تھی۔شاہ کے دور میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔وہ سوچ میں پڑ گیا۔اس مسئلے کا حل کیا نکالے؟ بڑی بی جا چکی تھی مگر وہ خود سے الجھا ہوا تھا تب ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور فاکیہ کی شبیہہ ابھری اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔''شاید وہ اس مسئلے کا حل نکال لے۔''ابھی اس نے سوچا ہی تھا کہ وہ مجسم سامنے آ گئی۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالآخر تمہیں میری اہمیت کا اندازہ ہو ہی گیا۔یہ مسئلہ میرے لیے بہت معمولی ہے۔میں جب چاہوں اس مسئلے کا حل کردوں۔''

''تو پھر دیر کیسی؟''

''دیر اس لیے کہ مسئلے کو سلجھانے میں تمہاری مدد درکار ہوگی۔''

''کس قسم کی مدد؟''

''دیکھو میں کرنسی چھاپنے سے رہی اور نہ میں بینک میں ڈاکا ڈال کر نوٹ لاسکتی

ہوں۔میں سبیل پیدا کرسکتی ہوں کہ کس طرح یہ مسئلہ حل ہوگا۔''

''تو کروناں! کیوں خوامخواہ الجھا رہی ہو۔''

''آؤ کھلی فضا میں آ جاؤ۔میں میدان بتاتی ہوں تم آستین چڑھا کر اتر جانا۔''

فاکیہ کے کہنے پر سلمان بستر سے اترا۔اس نے لباس تبدیل کیا اور جوتے کا تسما باندھ کر بولا۔''بولو کہاں جانا ہے۔''

''فی الحال باہر تو نکلو۔''

''چلو۔''کہہ کر سلمان کمرے سے باہر نکلا۔باہر آنگن میں بڑی بی لکڑیاں الٹ پلٹ کر دھوپ میں ڈال رہی تھیں۔آب رواں کے پاس بنے پنڈے پر روحیہ بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔شیریں غم و الم کی تصویر بنی برآمدے میں بیٹھی قیمص پر کشیدہ کاری کر رہی تھی۔اس کے چہرے پر دنیا بھر کا کرب پھیلا ہوا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ شب گریاں میں شریک ہو۔سلمان کو آنگن میں آتا دیکھ کر بڑی بی نے پوچھا۔''جان مادر کہاں کا قصد ہے؟''

''خانم! میں ابھی آیا۔''

''میں پوچھ رہی ہوں کہاں جا رہے ہو؟''

سلمان سوچ میں پڑ گیا۔اسے کسی ایسے سوال کی امید نہیں تھی مگر جواب دینا ضروری تھا۔مجبوراً اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔''خانم! میں نے تہران میں اچھی خاصی رقم کمائی ہے۔وہ رقم میں نے اپنے ایک دوست کے پاس رکھی ہے۔میں ابھی لا کر دیتا ہوں آپ محمود کے منہ پر مار دیجیے گا۔''

اس کا یہ جملہ آنگن میں پھٹے بم کی طرح محسوس ہوا۔شیریں نے چونک کر دیکھا۔روحیہ نے بھیگے کپڑے دور اچھالے اور صابن سے سنے ہاتھوں سے آ کر سلمان کے گلے میں جھول گئی۔''ہاں برادر! تم رقم لائے ہو؟ کتنے تومان ہیں۔مجھے بھی ایک تومان دینا۔میں کب سے گڑیاں کی شادی کرنے کا سوچ رہی ہوں۔''

''چل ہٹ پگلی۔ایک کیا میں سو تومان تجھے دوں گا مگر ابھی نہیں گڑیا کی شادی کے لیے تو بالکل نہیں ہاں تیری شادی کے لیے ضرور دوں گا۔اب چل ہٹ میرے کپڑے خراب نہ کر۔''

''جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔''وہ روٹھنے کے انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

اس کی اس ادا پر سلمان کو اپنی بہن یاد آ گئی اور آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی نمی تیرنے لگی اور

حلق میں پھندا سا لگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''نا بہن ناں! ایسا کبھی نہ بولنا، مجھ سے تو روٹھے گی تو میں مر جاؤں گا۔''

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ روحیہ ہی نہیں شیریں بھی سسک پڑی۔ روحیہ پورے قد سے اس پر جھول گئی تھی۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ''برادر معظم اگر پھر کبھی ایسا لہجہ اختیار کیا ناں تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔''

غریبوں کے درد، غریبوں کی خوشیاں، جتنی ارزاں اتنی مہنگی۔ بڑے سے بڑے دکھ کو جھیل جائیں اور ذرا سی خوشی ملے تو اس طرح آنکھیں بھر آئیں جیسے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ سلمان روحیہ کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر گھر سے باہر آ گیا۔

وہ سر جھکائے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ پر اب تک کچھ دیر قبل کے لمحات قابض تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ہر غریب کی زندگی یکساں ہے۔ وہ بام کا ہو یا بامیان کا ہر ایک کی کہانی ایک جیسی ہے۔ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ کیا وہ ان لوگوں کی مدد کر پائے گا؟ فاکیہ کے بہلاوے میں آ کر اس نے جو وعدہ کر لیا ہے کیا وہ اسے پورا کر سکے گا؟

ابھی سوچ کا سفر جاری تھا کہ یکا یک ہی فاکیہ اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ فکر نہ کرو۔ ان کے تمام قرضے تمہارے ذریعے ادا ہوں گے۔''

''مگر کیسے؟''

''یہ مجھ پر چھوڑ دو، میں راہ بتاتی جاؤں گی تم اس پر عمل کرتے جاؤ۔''

''میں سو جان سے راضی ہوں'' سلمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو سنو پہلا کام جو تمہیں سونپا جا رہا ہے اس کے بارے میں سنو! تمہاری جیب میں صرف بیس تومان ہیں اس سے ایک وقت کا کھانا تو مل سکتا ہے محمود کا قرضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تمہیں ابتدا میں کم سے کم ہزار تومان چاہئیں۔

''اتنی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟''

''وہ بھی میں بتا رہی ہوں۔ پہلے کسی سواری کو ہاتھ دو۔ جو بھی گاڑی رکے اس پر سوار ہو کر شاہراہ رضا پہنچو۔ وہاں پہنچ کر میں بتاؤں گی کہ تمہیں کرنا کیا ہے؟''

''اچھی بات ہے۔'' کہہ کر سلمان نے سامنے سے آتی ہوئی کار کو رکنے کا اشارہ دیا۔ کار اس کے نزدیک آ کر رک گئی اور پچھلا دروازہ کھل گیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے بیٹھا تھا

کہ اس کی نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ اب اسے سمجھ آیا کہ ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کیوں کھولا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی۔ جسم پر شرٹ تھی یقیناً اسی سے میچ کرتا ہوا ٹراؤزر ہوگا۔ شاہ کے دور میں ایسے ٹائٹ لباس پہننے والی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ منی اسکرٹ جو گھٹنے سے ایک ڈیڑھ بالشت اوپر تک کا ہوتا تھا کافی پسند کیا جاتا تھا۔ ماڈرن سمجھا جاتا تھا۔ یہ لڑکی بھی ماڈرن گھرانے کی لگ رہی تھی۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا ''کہاں اترنا ہے۔''

''شاہراہ رضا۔'' سلمان نے مختصر سا جواب دیا۔ لڑکی نے پھر کچھ نہ پوچھا۔ سیٹی پر کسی انگلش گانے کی دھن ہلکی آواز میں بجاتی ہوئی ڈرائیونگ میں مصروف رہی۔ شاہراہ رضا پر پہنچتے ہی اس نے کار روک دی۔

سلمان دروازہ کھول کر اتر گیا۔ اس نے کرایہ ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ کار آگے بڑھ گئی۔ شاید لڑکی کچھ کھمنڈی بھی تھی اسی لیے شکریہ وصول کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ دکانوں میں رش تھا۔ خریداروں کا اژدحام تھا۔ اس بھیڑ میں کھڑا وہ سوچ رہا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ کدھر جانا ہے۔ تب ہی اسے فاکیہ کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''واہ بھئی قسمت غضب کی پائی ہے۔ کیا غضب کی ہمسفر ملی تھی۔''

''خاموش، وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔'' سلمان نے خجل آواز میں کہا۔

''بے وقوف سال ڈیڑھ سال کی چھٹائی بڑائی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ایسی کراری تھی کہ منہ پانی سے لبالب بھر جائے۔ ہونٹوں پر زبان وائپر کی طرح چلنے لگے۔''

''تم بہت شیطان ہو۔'' سلمان کا لہجہ ہنوز خجل سا تھا۔

''عمر حیات مانگ کے لائے ہیں چار دن۔ دو آرزو میں اور دو انتظار میں کیوں کٹے۔ زندگی کو زندہ دلی سے گزار دو ورنہ مرنے کے بعد میری طرح حسرت زدہ پھرو گے۔ اپنی تمام تمنائیں پوری کرو، خوش رہو، عیش کرو۔ راہ میں نکالو گی۔''

''چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یہاں کیوں آنے کے لیے کہا۔'' سلمان نے باتوں کے رخ کو موڑنے کی کوشش کی۔

''سامنے زیورات کی دکان دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں! آگے بولو۔''

''اس دکان کے باہر بیٹھا، اونگھتا ہوا پہرے دار بھی نظر آ رہا ہے ناں۔''

''ہاں! وہ لمبی لمبی مونچھوں والا۔''

''اس کے پاس جاؤ۔ اس کی گن چھینو اور اندر گھس جاؤ۔ اندر جا کر کیش کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کے سینے پر نال رکھ کر کیش طلب کرنا۔ جس جس کے نزدیک جاؤ گے وہ تمہارے حکم کا بندہ بن جائے گا۔ سب کو میں روکے رکھوں گی ناں۔''

''اور اگر پکڑا گیا تو؟'' سلمان کے لہجے میں خوف تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں ناں! رقم حاصل کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقم فصل کا بیج ہے پھر دیکھنا کیسا لہلہاتا کھیت نظر آئے گا۔ تم فصل کاٹتے کاٹتے تھک جاؤ گے۔ مگر خوشیوں کا انبار ویسے ہی رہے گا۔''

''بس بس زیادہ خواب نہ دکھاؤ۔''

''تم شروعات تو کرو۔''

فاکیہ کے اکسانے پر وہ دل مضبوط کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس وقت اس پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ دل کی دھڑکن بے قابو اور پیروں میں جان نہ تھی۔ زبردست گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ چہرے پر بہتے پسینے کی دھار بہ خوبی محسوس ہو رہی تھی۔ پسینے سے کپڑے تک چپکنے لگے تھے مگر وہ آگے بڑھنے پر مجبور تھا۔ بہ دقت تمام وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ بازار کا شور، موٹر گاڑیوں کے ہارن، اس وقت اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے برابر سے ایک لڑکی پرس جھلاتی ہوئی دکان میں داخل ہوئی۔ اس نے نہایت تیز پرفیوم لگا رکھا تھا اس پرفیوم کی خوشبو نے سلمان کو زندگی کا احساس دلایا اور اس نے سر جھٹک کر آگے کی طرف دیکھا چوکیدار ہنوز اونگھنے میں مصروف تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کے بعد اپنا ہاتھ بندوق کی طرف بڑھایا اور تب ہی چوکیدار نے جھکا ہوا سر اٹھا کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا اٹھا اس کا پاؤں بے ساختگی میں پیچھے ہٹ گیا مگر چوکیدار نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے اس نے سلمان کو دیکھا ہی نہ ہو۔ فاکیہ کی آواز سنائی دی۔ ''مرد بنو..... ہمت کرو۔ گن چھینو۔'' اور اس نے اپنا لرزیدہ ہاتھ اٹھایا۔ گن کی نال پکڑی اور اسے کھینچ لیا۔

حیرت انگیز، چوکیدار نے ذرا بھی مدافعت نہ کی اور اسی طرح اونگھتا رہا۔ یہ دیکھ کر سلمان کو نیا حوصلہ ملا۔ وہ بندوق لے کر دکان میں داخل ہو گیا۔

اندر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کئی سیلز مین گاہکوں کو نمٹا رہے تھے۔ اتنے لوگوں کے درمیان وہ گن لے کر اندر آ گیا تھا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ وہ اس بات سے نیا حوصلہ پا رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکن پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا اور اب اس کے قدم کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے کاؤنٹر تک پہنچ ہی گیا۔ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر کاؤنٹر مین نے پوچھا۔ ''خیر باشد؟'' (خیریت تو ہے)

''خاموشی سے کیش میرے حوالے کر دو۔'' سلمان نے اپنی آواز کو بھاری بنا کر کہنے کی کوشش کی جب کہ حقیقت یہ تھی کہ زبان ہلنے پر تیار نہ تھی۔

''یا خدایا۔'' کیشیئر بڑبڑایا اور اپنے سینے پر رکھی نال کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کیش نکال نکال کر ایک بڑے سے لفافے میں رکھنے لگا پھر اس نے وہ لفافہ سلمان کی طرف بڑھا دیا۔

سلمان نے لفافہ اٹھایا۔ ادھر اُدھر کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی حیرت کی بات تھی کہ کسی نے بھی اس سے کچھ نہ پوچھا اور نہ کوئی خوف زدہ ہوا۔ عام سی نظروں سے دیکھتے ہوئے لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ سلمان تیز تیز قدموں سے باہر نکلا۔ اس نے گن چوکیدار کے ہاتھ میں دی۔ چوکیدار نے بھی کوئی تعرض نہ کیا۔ وہ ایسے بیٹھا رہا جیسے یہ بھی اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہے۔ سلمان اسے اسی حال میں چھوڑ کر سڑک کی طرف بڑھا۔ سامنے سے آتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں سوار ہو کر بولا۔ ایستگاہ راہ آہن۔ (ریلوے اسٹیشن)

ٹیکسی چل پڑی۔ تب ہی سلمان کو اس دکان سے آتی ہوئی خطرے کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ کیشیر نے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی مگر سلمان اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا کیوں کہ اب اسے اپنے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔

اب اس کے چہرے پر وہی رونق لوٹ آئی تھی۔ اطمینان سے وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسٹیشن کے سامنے پہنچتے ہی ٹیکسی رک گئی۔ وہ نیچے اترا کرایہ دو تو مان ادا کیا اور لفافہ پکڑے پلیٹ فارم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب وہ دفتر بلیط (ٹکٹ گھر) کے سامنے پہنچا تو فاکیہ کی آواز سنائی دی۔ ''واپس ٹیکسی اسٹینڈ جا کر دوسری ٹیکسی پکڑو اور بس اڈے کی طرف چل پڑو راستے میں، میں تمہیں نئی ہدایت دوں گی کیوں کہ مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی ہے۔''

سلمان کچھ دیر تک ٹائم ٹیبل پڑھتا رہا جیسے کسی خاص ٹرین کا وقت جاننا چاہتا ہو پھر ٹہلتے

ہوئے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف آ گیا۔ قطار میں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ قانون کے مطابق وہ پہلی ٹیکسی کی طرف بڑھا اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ایستگاہ آتوبوس۔''

ٹیکسی بس اڈے کی طرف چل پڑی مگر اس نے بس اڈے سے کچھ پہلے ہی ٹیکسی رکوا لی۔ کرایہ دے کر اسے رخصت کیا اور ٹہلتے ہوئے سامنے کی طرف بڑھا۔ ادھر پارک تھا۔ اس کا خیال تھا دوپہر کی وجہ سے پارک میں لوگ کم ہوں گے اس لیے فاکیہ سے باتیں کرنے میں آسانی رہے گی۔

ابھی وہ پارک میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ فاکیہ نے کہا۔ ''یہیں رک جاؤ۔''

سلمان ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آنے جانے والے سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یہ جگہ سڑک سے قدرے ہٹ کر تھی اس لیے اس کے نزدیک سے کوئی نہیں گزر رہا تھا۔ وہ قدرے اطمینان سے کھڑا تھا کہ فاکیہ کی آواز آئی۔ ''وقت کافی بدل چکا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ دکانوں میں عکاسی کے آلات بھی لگے ہوتے ہیں جو ہر آنے جانے والوں کی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ میں نے سب پر سحر تو طاری کر دیا تھا مگر کیمرے کو بھول گئی تھی۔ اگر پتا رہتا تو اسے بھی بند کر دیتی۔ اس کیمرے میں تمہاری تصویر بھی آ گئی ہو گی۔''

سلمان پورے بدن سے کانپ گیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ قانون کی نظروں میں آ چکا ہے۔ اس پر جرم ثابت کرنا کوئی مشکل نہیں رہا۔ وہ کسی بھی لمحے گرفتار ہو سکتا ہے۔ دادگاہ (عدالت) اسے مجرم سمجھ کر فوراً زندان بھیج دے گی۔ اسی کو کہتے ہیں نیکی کرو پھندے پر جھولو۔

❁

سلمان اسی سوچ میں تھا کہ اب کیا ہو گا۔ جیولرز کے کیمرے نے میری تصویر کھینچ لی ہے۔ یہ تصویر ادارہ شہربانی (محکمہ پولیس) کو دی جائے گی اور ادارہ شہربانی روزنامہ (اخبار) کو۔ روزنامہ میں جب تصویر چھپے گی تو یقیناً اس کے گھر والے بھی دیکھیں گے تب اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ بہن کیا سوچے گی، والد جو عالم دین ہیں انہیں کتنا طعنہ ملے گا۔ وہ یہی کچھ سوچے جا رہا تھا اور فاکیہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی جسے اس بات نے اسے طمانیت دی ہے۔ ایک عالم دین کے بیٹے سے چوری بلکہ ڈاکہ ڈلوا کر وہ خوش ہو رہی ہے۔

''اتنی بڑی رقم ہاتھ آ گئی جس سے تم محمود کا قرض چکا سکتے ہو پھر بھی فکر مند ہو؟'' فاکیہ نے کہا

''جب میری تصویر بطور اشتہار اخبار میں چھپے گی تو کیا ہو گا؟ میرے والدین کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔''

''فکر نہ کرو میں ہوں ناں، اس معاملے کو بھی سنبھال لوں گی۔ فی الحال تو تم جا کر خانم کو آدھی رقم دے آؤ کہنا کہ باقی رقم بھی کل مل جائے گی۔'' فاکیہ کے لہجے میں ایسا اطمینان تھا جیسے وہ اسے محکمہ شہربانی سے بچا لے گی۔

حوصلہ دینے والا بھی حوصلہ مند ہو تو حوصلہ شکستہ کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ فاکیہ کی باتوں نے سلمان کے حوصلے کو بھی تقویت دی اور وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے میں اس سے آدھی رقم خانم کو دے دوں گا۔ بس یہ رقم دے کر ابھی آیا۔''

''زیادہ دیر نہ لگانا۔ ابھی مزید رقم کا انتظام کرنا باقی ہے۔'' فاکیہ نے کہا۔

''اس بار کہاں دزدی (چوری) کرنا ہے؟''

''نہیں چوری ابتدائی رقم کے لیے کروائی تھی۔ اب اس رقم سے رقم کھینچنا ہے۔ فکر نہ کرو اب غیر قانونی کام نہیں کراؤں گی۔''

فاکیہ کا جواب سن کر وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے میں ابھی آیا۔'' پھر وہ تیز تیز قدموں سے ٹیکسی تک گیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر خانم کی گھر کی طرف چل پڑا۔

اسے ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر محلے کے لوگ حیران رہ گئے۔ جس گھر میں پابندی سے چولہا نہ جلتا ہو۔ اسے ٹیکسی میں دیکھ کر حیرانی تو ہو گی۔ سلمان ان سب پر نظر ڈالتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ اسے آتا دیکھ کر خانم نے کہا۔ ''جان مادر کہاں سے آ رہے ہو؟''

''ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ جاتے وقت تو بتا گیا تھا ناں۔''

''برادر بزرگ میری گڑیا لائے؟'' روحیہ دوڑتی ہوئی آ کر سلمان کے گلے میں جھول گئی۔

''گڑیا تو نہیں لایا مگر اس کی قیمت خانم کو دے رہا ہوں کل ''سوق'' جا کر خرید لینا۔'' کہہ کر اس نے جیب سے پچاس ہزار تومان نکال کر خانم کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر خانم کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جیسے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک ساتھ اتنے سارے نوٹ دیکھ سکیں گی۔ ان کی ہی طرح روحیہ اور شیریں کی بھی حالت ایسی ہی تھی۔

''یہ..... یہ سب..... سب رقم..... تم..... تم..... نے کمائی ہے؟'' خانم کی آواز لرز رہی تھی۔ حیرت نے انہیں سکتے جیسی کیفیت میں ڈال دیا تھا۔ آنکھوں میں تحیر تھا اور چہرے پر خوشی،

اندر کی خوشی۔ ایک ماں کے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی کہ بیٹا ڈوبتی کشتی کو سنبھال لے۔ بیٹا بھی وہ جو باپ کی نظر میں نکھٹو، نکما، کام چور ہو۔ یہی وجہ تھی کہ خانم ہی نہیں، دونوں بہنیں بھی حیرت زدہ تھیں۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کے ہاتھوں میں پکڑی گڈیاں دیکھے جا رہے تھیں۔

خانم اپنی خوشی پر قابو نہ رکھ سکیں۔ آگے بڑھ کر سلمان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر اس کی پیشانی پر پے در پے بوسے لینے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کہتی جا رہی تھیں۔ ''میرا لعل میرا چندا۔ آج تو نے میرے دل کو ٹھنڈا کر دیا۔ اب میں تیرے باپ کو دکھاؤں گی کہ دیکھو جسے تم حرام خور، ہڈحرام کہتے تھے اس نے کتنا بڑا کام کر دکھایا ہے۔ اسے کہتے ہیں نیک اولاد۔''

سلمان نے مسکرا کر کہا۔ ''پسر بایداز پدر احترام گزارد۔'' (بیٹے کو باپ سے احترام سے پیش آنا چاہیے۔)

خانم نے پھر اسے پیار کرنا شروع کر دیا۔ ''میرے بچے تو اپنے نانا پر گیا ہے۔ یہی تو شرفا کی پہچان ہے۔''

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ خانم کے شوہر حسین بادانی آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی خانم نے کہا۔ ''منہ ہاتھ دھو کر حیاط (صحن) میں بیٹھو میں ابھی اجاق (چولہا) جلا کر کھانا گرم کر لیتی ہوں'' اور وہ باورچی خانہ کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ کیوں کہ انہیں اندازہ تھا کہ شوہر ایک فنجان قہوہ پی کر صبح کو نکلا تھا۔ یقیناً اسے بھوک ستا رہی ہوگی۔

حسین بادانی کی کمر تو پہلے ہی جھکی ہوئی تھی محمود کی دھمکی سے اور بھی جھک گئی تھی۔ فکر مندی نے جھریوں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ کہیں سے رقم مل جائے۔ ابھی بھی وہ ایک تاجر کے پاس سے لوٹا تھا، ناکامی کا غصہ تو تھا ہی وہ سلمان پر برس پڑا۔ ''جس کے گھر میں جوان بیٹا ہو اس کا باپ ٹکے ٹکے کے آدمیوں کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے تف ہے تمہاری زندگی پر۔''

''پدر بزرگوار!'' سلمان ادب سے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں، ہمارے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے والد رضا شاہ کبیر کیسے معمولی سپاہی سے شہنشاہ بن گئے تھے.....''

''ماشاء اللہ تو حضرت تخت ایران پر نظر گڑائے ہیں۔ کب تک تاج پوشی ہوگی؟'' حسین بادانی نے اس کی بات کاٹ کر طنزیہ انداز میں کہا۔

''پدر بزرگوار! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ میں بھی رضا شاہ کبیر کی طرح معمولی سپاہی سے شہنشاہ بن کر دکھاؤں گا یعنی انہی کے نقش قدم پر چل کر انہی کی طرح بہت بڑا آدمی بنوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ان کے دور میں غربا کو تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں تھا۔ انہوں نے بیرک میں روسی سپاہیوں کی مدد سے تعلیم حاصل کی.....''

سلمان کے سلسلہ کلام کو پھر قطع کر کے وہ بولے۔ ''مگر میں نے تو تمہیں تعلیم دلا دی ہے۔ اب اسے تم کام میں نہیں لا رہے ہو تو میں کیا کروں۔''

باپ کو سلمان پر برستے دیکھ کر روحیہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ باپ نے ڈانٹ دیا کہ خاموش رہ۔ تب ہی سلمان بولا۔ ''پدر بزرگوار! رضا شاہ کبیر نے کتنی پلاننگ سے 1920ء میں ''کاسک بریگیڈ'' کے تمام روسی افسروں کو نکال باہر کیا اور خود افسر اعلیٰ بن گئے۔ ایک معمولی سپاہی سے سپہ سالار بننے کی منزل پا لی پھر انہوں نے اس دور کے نامور صحافی ضیاء الدین طباطبائی کو اپنے ساتھ ملایا۔ طباطبائی کا قلم، رضا شاہ کبیر کی تلوار دونوں نے مل کر انقلاب کا راستہ ہموار کر لیا۔ ''عوام ان کے ہمنوا بن گئے۔''

''تو جناب بھی انقلاب لانے والے ہیں، کہیں آیت اللہ خمینی کے ہمنوا تو نہیں بن گئے۔ تو سن لیں اگر یہ خبر محلے میں پھیلی تو ادارہ شہربانی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ یاد ہے ناں وہ سڑک کنارے ملا احمد بامیانی رہتے تھے۔ ادارہ شہربانی نے ان کی کیا حالت کی تھی۔ ان کے ناخن تک جموروں سے کھینچ لیے تھے۔ لاش کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی کیوں کہ وہ خمینی کے پیغام کو پھیلا رہے تھے۔ شاہ کے خلاف لوگوں کو بھڑکا رہے تھے۔''

''پہلے پوری بات تو سنیے۔'' سلمان کی آواز میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ ''رضا شاہ کبیر نے جب عوام کو ہمنوا پایا تو 3000 سپاہیوں کی فوج لے کر ''قزوین'' سے بڑھے اور اکیس فروری 1921ء کو بغیر ایک قطرہ خون بہائے حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (بادشاہت کا خاتمہ نہیں۔ سیاسی حکومت کا خاتمہ) نئی حکومت میں ضیاء الدین طباطبائی وزیر اعظم بنے اور رضا شاہ کبیر وزیر جنگ، سپہ سالار اعلیٰ۔ ضیاء الدین صحافی تھے۔ صاف گو تھے اس لیے دولت مند طبقہ مخالف ہو گیا جب کہ رضا شاہ کبیر نے کسی کو رنجش کا موقع نہیں دیا یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ احمد شاہ نے طباطبائی کو معزول کر کے نیا وزیر اعظم مقرر کیا مگر رضا شاہ اپنی جگہ جمے رہے۔ وہ نہایت چالاکی سے غیر ملکیوں کو ملک سے نکالتے رہے تاکہ ایرانیوں کو ان کا منصب ملتا رہے اس طرح عوام و خواص ان کے ساتھ رہے

گی۔ جب ملک کی دفاع پوری طرح مضبوط ہوگئی تو 1923ء میں وہ خود وزیراعظم بن گئے اور شہنشاہ احمد شاہ کو یورپ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ 31 اکتوبر 1925ء میں پارلیمان نے احمد شاہ کی شہنشاہیت کے خاتمے کا اعلان کیا اور 13 دسمبر کو رضا شاہ کبیر کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ 25 اپریل 1926 کو تاج پوشی بھی کر دی گئی۔''

حسین بادانی سلمان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا کتنا قابل ہے کتنا علم رکھتا ہے۔

سلمان بولتا رہا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ مقصد مدنظر رکھنا چاہیے۔ میں بھی اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نکھٹو ہوں۔ کام نہیں کرتا۔''

''اگر تم کسی قابل ہوتے تو مجھے محمود کے آگے بھیک نہ مانگنی پڑتی۔'' حسین بادانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''محمود پر فاتحہ پڑھو لو کھانا کھاؤ۔ میرے ہیرے جیسے بیٹے نے محمود کا قرض اتار دیا۔'' خانم طشت اٹھائے آ رہی تھیں وہیں سے بولیں۔

''کیا کہا ذرا پھر سے بولو۔'' کمیل کو چک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

خانم نے طشت کو حیاط (صحن) میں بچھی تخت خواب (چارپائی) پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا بیٹا تہران سے بہت رقم لے کر آیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ رقم!'' حسین بادانی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''یہ رہی۔'' کہہ کر انہوں نے خفتان (بڑی فراک) کے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دکھائی۔ نوٹ دیکھ کر حسین بادانی کے چہرے پر حیرت در آئی۔ وہ بولے۔ ''واقعی اتنی رقم لایا ہے؟''

''ہاں محمود سے نجات کے لیے ہی تو وہ جی توڑ محنت کر رہا تھا۔'' ماں ہونے کے ناطے انہوں نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

''پدر بزرگوار! میں چاہتا ہوں کہ آپ محمود کو رقم دے کر بینڈ نوٹ واپس لے لیں اور ایک رخت شوخانہ ... لانڈری کھول لیں اس کام میں بہت منافع ہے پھر کل میں نے سنا تھا کہ آپ خانم سے اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے جس نے رخت شوخانہ کھول رکھا ہے۔''

''میری تو کب سے یہ آرزو ہے۔'' حسین بادانی حسرت سے بولے۔

''خانم کو میں نے پچاس ہزار تومان دیے ہیں مزید لانے کے لیے جا رہا ہوں۔'' کہہ کر وہ گھر سے نکل آیا۔ حسین بادانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

سلمان ایک بار پھر فاکیہ سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اسے اسی جگہ بلایا تھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ اس سے ملا تھا، ایستگاہ آتوبوس۔ (بس اسٹینڈ) کے نزدیک۔ اس نے سڑک پر پہنچ کر ٹیکسی پکڑی اور بس اسٹینڈ گیا اور پارک کے نزدیک اسی پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا جہاں اس سے کچھ دیر پہلے ملا تھا۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ فاکیہ آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''واہ میرے مٹی کے شیر تم تو وقت پر آ گئے۔ آؤ اب ہم نئی مہم پر چلتے ہیں تاکہ تم جلد سے جلد امیر کبیر بن جاؤ۔''

''نئی مہم پر تو ضرور چلوں گا مگر یہ بھی بتا دو کہ اس عکس بندی کا کیا ہوگا جو جیولرز کے کیمرے نے محفوظ کیا ہے۔'' سلمان نے سوال کیا۔

''تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ ہر الجھن سے نکالنا میرا کام ہے۔'' فاکیہ بولی۔

''مگر یہ بھی تو سوچو کہ محکمہ شہربانی (پولیس) میں کیسے کیسے چالاک لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ میری تصویر کے سہارے مجھے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ روزنامہ (اخبار) میں اس تصویر کو شائع کریں گے اور لوگ مجھے خود پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔'' سلمان کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''ان سب سے بچانا میرا کام ہے اس لیے میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو ورنہ میں چلی اور اگر میں چلی گئی تو تم خود سوچو کیسے کیسے مصائب تمہیں گھیر لیں گے۔ تم گلے گلے تک مصائب کے دلدل میں دھنس چکے ہو۔''

اس کا کہنا واقعی درست تھا۔ وہ مصائب میں گھر چکا تھا۔ اس کے حکم پر چلنا سلمان کی مجبوری بن چکی تھی۔ فاکیہ نے اسے کئی زاویے سے پھانس لیا تھا اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ کتنے امن چین سے اپنے گھر میں رہ رہا تھا وہاں صرف ممانی کی بدزبانی کے علاوہ اور کوئی پریشانی نہ تھی کہ فاکیہ زبردستی اس کی زندگی میں گھس آئی اور اندر سے دبا سہا سلمان خود کو شیر محسوس کرنے لگا اور اسی جذبے کے تحت اس نے ممانی کے غنڈے بھائی کا بدزبانی پر سر پھاڑ دیا اور پھر اس ڈر سے بھاگ نکلا کہ پولیس اسے پکڑ لے گی۔ اس وقت اسے وہ تمام منظر پردہ سیمیں پر گزرتے نظر آ رہے

تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اس محلے میں داخل ہوا ہے اور اسے خانم نے بیٹا کہہ کر گلے لگا لیا ہے۔ اسے کھینچتی ہوئی گھر کے اندر لے کر آئی ہے۔ جیسے ہی وہ اندر آتا ہے سامنے ہی اسے ایک انتہائی خوبصورت لڑکی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ پرستان سے آئی ہوئی پری ہے۔

سلمان نے بس ایک نظر میں ہی اس کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مثل آہو آنکھیں، رنگت ایسی جیسے دودھ سے بھرے سفید چینی پیالے میں کسی نے یاقوت ڈال دیا ہو۔ ستواں ناک اور شہد سے لبریز لالیں لب۔ اس کی نگاہیں ایک بار جو جھکیں تو پھر حد ادب سے اٹھ نہ سکیں، تبھی ایک اور لڑکی اندر سے نکل کر اس کمرے میں آ گئی۔ وہ پہلی والی لڑکی سے کچھ چھوٹی تھی۔ اس کے نین نقش بڑی سے ملتے جلتے تو تھے مگر اس جیسے نہ تھے۔ وہ اس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس چھوٹی لڑکی نے آگے بڑھ کر سلمان کے ہاتھ پکڑ لیے اور لگاوٹ بھرے لہجے میں بولی۔

''برادر اکبر.....! آپ کہاں چلے گئے تھے، کیوں گئے تھے؟''

اس لڑکی کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے زمانے بھر کا الم ایک فنجان میں گھول کر اسے جرعہ جرعہ پلا دیا گیا ہو جو اب الفاظ کی صورت میں نکل رہے ہیں۔ ہر لفظ شہنائی کی غم آلود سوز میں نہا نہا کر ادا ہو رہے ہوں۔ دل کی گہرائی سے نکل نکل کر سر ابھار رہے ہوں۔ سلمان بھی اس کے الفاظ کے سحر میں ڈوب گیا تھا۔ سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ لوگ اس سے اس قسم کا برتاؤ کیوں کر رہے ہیں؟

''بولیے برادر، آپ کو ہمیں دکھ پہنچا کر کیا ملا ہے؟'' لڑکی کے اس سوال پر سلمان سوچنے لگا۔ اتنے سارے لوگوں کو مغالطہ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ دونوں عورت مرد، محلے والے اور یہ لڑکی سب کے سب اس کو کوئی اور نام کیوں دے رہے ہیں؟ بڑی لڑکی نے ابھی بھی دوری بنا رکھی تھی مگر اس کی نگاہیں بھی سوالیہ تھیں، کچھ پوچھتی ہوئی سی۔ سلمان نے پھر نگاہیں اٹھا کر بڑی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کا آنا اسے پسند نہ آیا ہو۔

''شیریں.....!'' عورت نے پکارا۔

''جی خانم.....!'' بڑی والی لڑکی کے یاقوتی ہونٹوں سے مؤدب آواز ابھر کر فضا میں جلترنگ بجا گئے۔ سلمان نے جان لیا کہ لڑکی کا نام شیریں ہے، وہ اسم بامسمی تھی، شیرینی سے لبریز۔

''بھائی کو گرم پانی دے، وہ ہاتھ منہ دھو لے؛ پھر قہوہ گرم کر۔ ہاں، آج میں بہت خوش ہوں۔ آذربائیجان والے فنجان میں سب کو قہوہ دینا۔''

''جی خانم.....!'' کہہ کر شیریں اندر کی طرف چلی گئی۔

''اے روحیہ.....! تو کھڑی منہ کیا تک رہی ہے؟ جلدی سے تنور پر جا، چار روٹیاں لے آ۔'' عورت نے کہا تو روحیہ بھی چل دی۔ اب اس کمرے میں بڑی بی اور بڑے میاں رہ گئے تھے۔ سلمان اب بھی اس معمے کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

''جاؤ جا کر تازہ دم ہو جاؤ۔ پانی گرم ہو چکا ہوگا۔'' بڑی بی نے سلمان سے کہا۔

''جی خانم.....!'' وہ اندازے سے اندر کی جانب چل دیا۔ اس وقت بھی اس کے دل میں ایک ہی بات تھی کہ وہ کسی طرح ایک بار پھر اس جلوہ قاتل کی ایک جھلک دیکھ لے۔ اس نے اندر پہنچ کر ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ شیریں تو نظر نہیں آئی مگر روحیہ نظر آ گئی۔ وہ اس کے قریب آ کر بولی۔ ''آیئے بھائی جان.....! میں نے حمام میں تولیہ رکھ دیا ہے، آپ جلدی سے غسل کر لیں۔ اتنی دیر میں، میں آپ کے لیے شہد میں روٹی بھگو لیتی ہوں۔ یہ آپ کو بہت پسند ہے ناں.....!

وہ ادھر چلا گیا جدھر روحیہ نے اشارہ کیا تھا۔

وہ نہا کر تر و تازہ ہو گیا۔ سامنے تخت پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ روحیہ اس کی منتظر تھی مگر سلمان کی آنکھیں شیریں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ اپنی پیاسی نظروں کو سیراب کرنا چاہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ جو والہانہ پن اس گھر کے دیگر افراد کی آنکھوں میں ہے، اس کا عشر عشیر بھی شیریں کی آنکھوں میں نہیں ہے۔ وہ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں پراسرار سوال ہے جیسے اسے شک ہو کہ سلمان ڈھونگی ہے، سب کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ اس بات کا احساس ہوتے ہوئے بھی وہ اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔

روحیہ سے اس نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بتائے گئے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ ہوا کے دباؤ سے خود بخود بند ہو گیا۔ اس نے پروانہ کی کیونکہ یہ ایک عام سی بات تھی۔ دیوار کی طرف چہرہ کیے لیٹا ہوا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے اس کی پیٹھ پر کسی نے ہاتھ رکھا ہو۔ ''احوالتان چطور است۔'' (مزاج کیسے ہیں؟) یہ آواز بھی سنائی دی تھی۔ وہ چونک کر مڑا۔ سامنے ہی فاکیہ کھڑی تھی۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر سلمان نے کہا۔ ''تم.....تم یہاں بھی پہنچ گئیں؟''

''جہاں جہاں تم، وہاں وہاں میں۔ جب میں کسی کا ساتھ پکڑتی ہوں تو دم آخر تک

ساتھ نبھاتی ہوں۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتی تو تم حوالات میں سڑ رہے ہوتے۔ میں نے ہی دوسری بار بی جان پولیس اسٹیشن کے انچارج کی آواز میں تمہارے پتے کی تصدیق کی تھی۔''

''بہت بہت شکریہ..... اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تشریف آوری کی وجہ.....؟''

''مبارک باد دینے آئی ہوں۔ بڑا لمبا ہاتھ مارنے کی کوشش کی ہے۔ لونڈیا بڑی جاندار ہے۔'' وہ لڑکی ہو کر بھی اوباش مردوں کے لہجے میں بول رہی تھی۔

''تمہارا دماغ تو درست ہے؟ مجھے اس لڑکی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

''اچھا..... جبھی تم اسے بھوکی نظروں سے گھور رہے ہو۔ ارے بھائی، میں تو خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکی سے قریب ہونے کی کوشش کرو۔ میں اپنی زندگی میں جو حاصل نہ کر سکی، وہ یہ لڑکی حاصل کر لے۔''

''گویا تم تماشا دیکھنا چاہتی ہوں۔ شرم کرو، شرم۔''

''تمہیں اگر زندگی میں کچھ کرنا ہے، آگے بڑھنا ہے تو میری ہر بات کو مان کر چلو، جیسا میں کہوں، ویسا ہی کرو ورنہ نقصان میں رہو گے۔''

''کیا اسی جگہ کھڑے کھڑے امیر کبیر بنو گے؟'' فاکیہ کی آواز پر سلمان چونک گیا اور خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ بس اسٹینڈ سے بس نکل رہی تھی اس کے ہارن کی گونج نے اسے پوری طرح حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا۔ اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ''چلو کہاں چلنا ہے؟''

''ٹیکسی روکو، اس میں سوار ہو کر مینار ساعت پہنچو، میں وہیں ملوں گی۔'' فاکیہ نے کہا اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ سلمان کے پاس دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں تھا اس لیے وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ بولا۔ ''مینار ساعت'' اور سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مینار ساعت کا علاقہ شرفاء کے لیے نہیں ہے۔ نیون سائن اور وہاں کھڑی عورتوں کو دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا مگر فاکیہ کا حکم تھا اس وجہ سے وہ جانے پر مجبور تھا۔

خیالات کا تسلسل تب ٹوٹا جب ڈرائیور نے ٹیکسی روکی۔ سلمان نے چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا پھر جیب سے دو تومان نکال کر ٹیکسی والے کے ہاتھ پر رکھ دیے اور نیچے اتر آیا۔ وہ حیران نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ سڑک پر سگریٹ پیتی لڑکیاں ادھر اُدھر کھمبوں، دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ ان کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ یہ کس پیشے سے تعلق رکھتی ہیں۔

''ارے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔'' فاکیہ کی آواز سماعت سے ٹکرائی مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ سلمان سمجھ گیا کہ وہ نظروں سے پوشیدہ رہ کر پھر اس سے کوئی کام کرانا چاہتی ہے۔

''آں دختر سیار خوشگل است۔'' (وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے) سلمان نے فاکیہ کو جلانے کے لیے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی، لڑکی واقعی خوب صورت ہے۔ آثر بائیجانی ہے ناں، صرف پانچ تومان میں مل جائے گی مگر ابھی تو وہ کرو جس کے لیے آئے ہو۔ سامنے بلیو لیگون کیسینو کا بورڈ دیکھ رہے ہو ناں اس میں داخل ہو جاؤ۔''

''تو کیا اب مجھے قمار خانے میں بھی جانا پڑے گا۔''

''بالکل نہ صرف جانا پڑے گا بلکہ جوا کھیلنا بھی پڑے گا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے تم کچھ ہی دنوں میں امیر کبیر بن سکتے ہو۔ میں بتاؤں گی تم اسی نمبر پر مال لگانا پھر دیکھنا رقم کیسے آتی ہے۔''

فاکیہ کا پلان بہت سادہ تھا اور دولت کے حصول کا نہایت آسان ذریعہ بھی۔ مگر سلمان کے لیے بہت مشکل، اس لیے کہ کچھ بھی ہو، وہ ایک عالم دین کا بیٹا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ جوا کھیلنا حرام ہے۔ وہ کیا کرے، ابھی اسی سوچ میں وہ کھڑا تھا کہ فاکیہ نے کہا۔ ''سوچنے کے لیے پوری زندگی پڑی ہے۔ ابھی عمل کا وقت ہے، یہ وقت گنوا دو گے تو ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔''

بات سچ تھی۔ وہ ان لوگوں کو زندگی کی خوشیاں دینے کے لیے یہاں تک آیا تھا۔ اگر کسی بھوکے کو کھانا کھلانے کے لیے چھوٹا سا گناہ سرزد ہو جائے تو برا کیا ہے، اس خیال کے آتے ہی وہ نئے سرے سے ہمت باندھ کر آگے بڑھ گیا۔

سامنے ایک وسیع و عریض ہال تھا جس کی سامنے والی دیوار پر شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک میزیں بچھی ہوئی تھیں جن پر چار چار کے گروپ میں لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے..... ہر کھلاڑی کے سامنے پیتل کے ٹوکنوں کا ڈھیر تھا۔ دیوار کے سہارے طرح طرح کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ان مشینوں کے گرد لوگ کھڑے ہوئے بازی لگا رہے تھے۔

''سامنے والی مشین پر جا کر پہلے سات پر 500 تومان لگاؤ اس سے جو رقم حاصل ہو وہ پوری رقم پانچ پر لگا دینا۔'' فاکیہ نے کہا تو سلمان اسی مشین کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

مشین کے سامنے پہنچ کر اس نے پانچ سو تومان کا ایک ٹوکن سات کے ہندسے پر رکھ دیا۔ مشین کا کانٹا گھوما، اس کے ساتھ کھیلنے والے دوسروں کی نظریں بھی اس گھومتے ہوئے کانٹے پر جم گئیں۔ کانٹا نہایت تیزی سے گھومتا ہوا اب اپنی رفتار آہستہ کر رہا تھا۔ رفتار آہستہ ہو رہی تھی اور لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ کانٹے کی رفتار اب مزید ہلکی ہوگئی تھی، وہ چیونٹی کی رفتار سے گھومتے ہوئے سات پر آ کر رک گیا۔ سات پر رقم لگانے والوں کے چہرے کھل اٹھے۔ وہاں کھڑے مشین مین نے سب کو ٹوکن دینا شروع کر دیا۔ سلمان کو بھی پانچ ہزار تومان کا ٹوکن ملا۔ سلمان نے ٹوکن لے کر دوسرے راؤنڈ پر لگانے کے لیے نمبرز کو دیکھنا شروع کر دیا۔ کئی لوگوں نے مختلف نمبرز پر ٹوکن رکھ دیے تھے مگر سلمان ہنوز ٹوکن پکڑے پسندیدہ نمبر دیکھ رہا تھا کہ مشین مین نے نمبر چلا دیے۔ کانٹا گردش کرنے لگا۔ سلمان نے جلدی سے پانچ ہزار تومان کے ٹوکن نمبر پانچ پر رکھ دیے۔ پھر وہی ہوا۔ کانٹا آ کر پانچ پر رک گیا۔ کاؤنٹر مین نے 80 ہزار تومان کے ٹوکن اسے دے دیے۔

''اب دوسری مشین کی طرف بڑھو اور اس پر پانچ ہزار تومان لگا دو۔'' فاکیہ کی سرگوشی سن کر سلمان دوسری مشین کی طرف بڑھا۔ اس مشین میں ایک بڑی سی گول پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ پلیٹ پر لمبی لمبی ابھری ہوئی دھاریاں درمیانی حصے سے نکل کر کناروں تک آ رہی تھی۔ اس لمبے لمبے خانوں میں مختلف اشکال بنے ہوئے تھے۔ سلمان نے ریڈ ڈائمنڈ پر پانچ ہزار تومان لگا دیے۔ مشین گھومنے لگی۔ پلیٹ پر بال اچھلنے لگا۔ پلیٹ گھومتے گھومتے رکی تو بال ریڈ ڈائمنڈ والے خانے میں تھا۔ کاؤنٹر مین نے 80 ہزار تومان کا ٹوکن اسے دے دیا۔ اسی طرح وہ کئی کاؤنٹر پر کھڑا ہوا۔ ایک گھنٹے میں وہ دس لاکھ تومان جیت چکا تھا۔ وہ مین کاؤنٹر پر ٹوکن لے کر آیا۔ ٹوکن کے بدلے کیش لے ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی بڑا سا بوکے لے آئی کہ یہ کیسنو کی طرف سے ہے۔ آج کے خوش نصیب آپ ٹھہرے ہیں۔

بڑے سے شاپنگ بیگ میں نوٹوں کا بنڈل لے کر وہ باہر آیا۔ باہر آ کر فاکیہ نے کہا۔ ''دیکھا، ایک ہی جھٹکے میں کتنا بڑا آدمی بنا دیا۔ اب تمہیں کل پھر آنا ہے اور اتنی ہی رقم لے کر جانا ہے۔ اس طرح تم ان لوگوں کی بھرپور مدد بھی کرو گے اور اس حسینہ عالم کو بھی حاصل کر لو گے۔''

''مگر میں تو اس کے بھائی کی حیثیت سے اس گھر میں ہوں۔''

''اس کا حل بھی میں نکالوں گی، تم بے فکر رہو۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ٹیکسی اسٹینڈ تک آئے اور سلمان ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ گندا علاقہ پیچھے چھوٹ گیا۔ وہ رہائشی علاقے میں آ گیا شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی نے ملک کو ترقی دینے کے نام پر، مشرق میں مغرب سجا دیا تھا۔ مسلمانوں کو یورپ کے بے لگام معاشرے کا چسکا لگا دیا تھا۔ نتیجتاً ہر وہ برائی کھینچی چلی آئی تھی جو مغرب میں کینسر کی طرح پھیل چکی ہے مگر رہائشی علاقوں میں خاص کر غرباء کے اخلاق میں اب تک روایات کے اسیر باقی ہیں اسی وجہ سے وہاں کی مسجدوں میں کم صحیح مگر لوگ نظر آتے تھے۔ گھروں میں پاکیزہ ماحول بھی زندہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلمان کو لوٹ کر محلے میں اترتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ٹیکسی سے اتر کر تیز تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔ آنگن میں رکھی کرسی پر محمود بیٹھا تھا۔ اس نے سلمان کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''دردست چپ تو چیست؟'' (تیرے بائیں ہاتھ میں کیا ہے؟)

سلمان نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''بگزار یداد یں داستان را۔'' (چھوڑو ان باتوں کو) تب ہی خانم نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ محمود کے منہ نہ لگے اس لیے اس نے سیدھے سیدھے پوچھا۔ ''آپ کی رقم مل گئی؟''

''آدھی ملی ہے، صرف چالیس ہزار تومان۔''

''بیس ہزار تومان اور چاہیے؟''

''نہیں، تیس ہزار!''

''کیوں، آپ کی کل رقم ساٹھ ہزار تومان ہے۔ ناں؟''

''تمہارا باپ تمہاری شادی کرائے گا تو چار سال بعد تم دو میاں بیوں سے دو تین بچے نہیں ہو جائیں گے؟ میں نے بھی اپنی رقم کی تم لوگوں سے شادی کرائی ہے۔ اب اس کے بچے ہوں گے کہ نہیں۔ مجھے اصل رقم کے بچے نہیں دو گے؟''

''یہ کہو ناں سود چاہیے۔''

''توبہ توبہ سود حرام ہے، نفع دو نفع۔''

سلمان نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور شاپنگ بیگ سے نکال کر تیس ہزار تومان

دے دیے۔ وہ رقم دیکھ کر بولا۔ ''اتنی رقم کہاں سے لائے؟''

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔''

وہ بھی کم بدمعاش نہ تھا اس نے خانم کی طرف مڑ کر کہا۔ ''خانم! طراران ہر جا موجود ستند، مخصوصاً در شہر ہای بزرگ۔ طراران نسبتاً چابک تر یافتہ می شوند۔'' (جیب کترے ہر جگہ ملتے ہیں۔ خاص طور پر بڑے شہروں میں۔ بڑے ہوشیار جیب کترے ہوتے ہیں)

سلمان سمجھ گیا کہ وہ اس پر چوٹ کر رہا ہے مگر میں بولا کچھ نہیں۔ اس کی خاموشی کو محمود نے ہمیشہ کی طرح بزدلی سمجھا اور بولتا رہا۔ ''بوسیلہ قطار مسافرت می کنید یا بوسیلہ اتوبوس ہر گاہ در ہجوم مردم می روید کیسہ شما محفوظ نیست۔'' (ریل گاڑی کا سفر ہو یا بس کا۔ آپ کسی ہجوم میں چلے جائیں آپ کی جیب محفوظ نہیں) وہ باتیں خانم سے کر رہا تھا مگر نشانہ سلمان تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ محمود اس پر الزام لگا رہا ہے کہ اس نے چوری سے یہ رقم اکٹھی کی ہے۔ مگر سلمان اس کے طنز کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا اور وہ مسلسل طنز کیے جا رہا تھا۔ ''بعض اوقات زادراہ مسافران رامی رباید۔'' (بعض اوقات مسافروں کے راستے کا خرچ بھی اڑا لیتے ہیں)

اب اس کی باتیں سلمان کی برداشت سے باہر ہو گئیں تو اس نے تقریباً چیخنے کے انداز میں ڈانٹا۔ ''او ٹھگنے شیطان! تمہاری رقم مل گئی۔ اب بابا کے ہاتھ کا لکھا نوٹ واپس کرو اور اپنی راہ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری برداشت جواب دے جائے۔''

سلمان کے لہجے نے اسے سہما دیا۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا اور شستہ لہجے میں بولا۔ ''ارے ارے تم تو ناراض ہونے لگے۔ ہمارا اس گھرانے سے رابطہ تمہاری پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ ناراض کیوں ہوتے ہو میں چلا جاتا ہوں۔''

اس نے پرونوٹ بابا کو دیا اور پھر دروازے پر پہنچ کر بولا۔

''ہاں ذرا رونقی سے ہوشیار رہنا۔ وہ بھی مخمصے میں ہے کہ تم اتنی بڑی رقم کہاں سے لے آئے ہو۔''

سلمان سمجھ گیا کہ اس بدمعاشی کا ذمے دار وہ خود ہے اسی نے رونقی کے کان بھرے ہوں گے۔ وہ غنڈا بھی تو اسی کا ساتھ ہے پورے ''رے'' میں اس جیسا کمینہ شاید ہی کوئی اور ہو۔

یہ شہر تو ہمیشہ سے کشت وخوں، عیاری و مکاری کے لیے مشہور تھا۔ اسی شہر کو بطور جاگیر حاصل کرنے کے لیے عمر سعد جیسے عالم و فاضل نے امام حسینؑ کو شہید کرنے والی فوج کو کمانڈ کیا۔

اگر اس شہر میں ابی قاسم شاہ عبدالعظیم جیسی پاکیزہ ہستی نہ آتی۔ تبلیغ کے ذریعے لوگوں کی ذہنیت نہ بدلتی تو یہ شہر اب تک عیاری و مکاری کا منبع بنا رہتا۔ شہر والوں کی ذہنیت بدل گئی۔ دین کی طرف لوگ لوٹ آئے مگر اب بھی کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جن کے اندر وہی پرانا جراثیم موجود ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں محمود کا بھی شمار ہوتا تھا۔ مگر سلمان کو اس کا ڈر نہیں تھا کیوں کہ اس کی پشت پر فاکیہ جو موجود تھی۔ فاکیہ اکیلی اس جیسے ہزاروں سے نمٹ سکتی تھی۔ فاکیہ ہی کی مدد سے اسے گھیرا جا سکتا ہے۔ وہ ابھی اسی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ حسین بولے۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا، ہر کام جوش سے نہیں ہوش سے کیا جاتا ہے۔ اس مکار کی فطرت سے تم بھی واقف ہو گے۔ یہ دو منہ کا سانپ ہے۔ کس طرف سے ڈسے گا آخر وقت تک اندازہ نہیں ہوتا تم نے اس سے بیر مول لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔''

''مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ بابا جان آپ فکر نہ کریں یہ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔'' سلمان نے تسلی دی۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اس کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس کی دوستی شہدوں بدمعاشوں سے بھی ہے اور ادارہ شہربانی سے بھی۔ وہ ان میں سے کسی کی بھی مدد لے کر تمہیں پریشان کر سکتا ہے۔''

''شہدوں سے نمٹنے کے لیے میرے بازو میں قوت ہے۔ رہا ادارہ شہربانی، تو میری دوستی بھی تہران کے کئی اعلیٰ افسران سے ہے۔ میں دونوں طرح سے نمٹ لوں گا۔ بس آپ فکر نہ کریں۔''

''ارے کیسے فکر نہ کروں، تجھے چوٹ لگے گی تو کیا مجھے درد محسوس نہیں ہوگا۔'' باپ کا لہجہ آج بدلا ہوا تھا۔

''میں نے کہا ناں میں اس سے نمٹنے کی قوت رکھتا ہوں۔'' کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی دیا۔

کمرے میں آ کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا۔ خانم کے دل سے ڈر نکالنے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا کہ میں اکیلا ہی محمود کے لیے کافی ہوں۔ مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ یہ بات معمولی نہیں ہے۔ محمود..... ایک سازشی آدمی ہے۔ ایک بار پہلے بھی شیریں کے لیے سازش رچا چکا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ پوری طرح بدنام ہو چکی ہے۔ اس بار وہ اس سے بھی زیادہ

خطرناک سازش رچائے گا اور اس بار اس کا نشانہ بھی وہ بن سکتا ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس وقت پورے ایران میں آپریشن کلین اپ جاری ہے۔ پیرس میں بیٹھے آیت اللہ خمینی کے پیروکاروں کو چن چن کر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اگر کسی کے بھی خلاف یہ افواہ اڑا دی جائے کہ وہ اسلام پسند ہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اسے کارآگاہ (محکمہ خفیہ) والے فوراً قراول خانہ (تھانہ) بلا کر تفحص (تفتیش) شروع کر دیتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر ایسی ایسی ایذائیں دیتے ہیں کہ سوچ کر ہی روح کانپ جائے۔

محمود یقیناً یہی آسان راستہ اختیار کرے گا۔ سلمان اسی پر غور کر رہا تھا کہ کس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے تب ہی دروازے پر کھٹکا ہوا اور اس کے خیالات کے تار و پود بکھر گئے۔ اس نے حیرت بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ بس اک پل میں موسم کا مفہوم بدل گیا تھا۔ خزاں کی رت میں بہار اُتر آئی تھی۔ من کے اداس آنگن میں خوشی کے پھول کھل اٹھے تھے۔ اب تک وہ اڑتے پرندے کا سایہ تھی جسے پکڑنا چاہو تو بھی پکڑ نہ پاؤ۔ ہاتھ رکھو تو وہ ہاتھ کے اوپر اٹھ آئے مگر اس وقت وہ مجسم حقیقت بن کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں طشت تھا اور طشت پر خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ یقیناً وہ کھانا لے کر آئی تھی۔

اس نے طشت کو سریر (پلنگ) پر رکھ دیا۔ کھانے کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل رہی تھی مگر سلمان کو اس خوشبو پر بھاری کنوارے بدن کی خوشبو لگ رہی تھی۔ طشت رکھنے کے بعد شیریں بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ خود نہیں آئی ہے اسے بھیجا گیا ہے۔ شاید روحیہ گھر میں نہیں تھی اسی لیے خانم نے اسے بھیجا تھا۔ اس نے خوان پوش ہٹا کر طشت آگے کر دیا اور دستی پنکھا جھلنے لگی تاکہ سلمان سکون سے کھانا کھا لے۔ کھیاں تنگ نہ کر سکیں۔ اس ادا پر وہ سرشار و مخمور ہو گیا۔ اس کے دل میں گلاب مہک اٹھے۔ وہ نظروں کے راستے اسے دل میں اتارنے لگا۔

''مجھے کیا دیکھ رہے ہیں۔ کھانا کھائیں۔'' اس نرم جھڑکی پر سلمان سنبھل گیا۔ اس نے قرص (روٹی) کا ٹکڑا اٹھایا اور سالن میں ڈبو کر منہ میں رکھ لیا۔ نوالہ چباتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''بولو۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتی ہو۔''

''بالکل صحیح اندازہ ہے۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ تم میرے بھائی نہیں ہو۔''

''آں کیا کہا؟''

''ہاں تم میرے بھائی نہیں ہو۔ کیوں کہ تمہاری نظریں حد درجہ بے باک ہیں ایسی نظریں بھائی کی نہیں ہوتیں۔''

سلمان کے قدموں تلے دھرتی ڈولنے لگی تھی کیوں کہ شیریں کا ایک ایک لفظ حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ عورت کا ہر مسام مردوں کی نظروں کے لیے کسوٹی ہے۔ بس ایک پل میں وہ تجزیہ کر لیتی ہیں کہ کس کی نظروں میں کیسا پیغام ہے۔ اسے یاد تھا کہ اس کے ایک دوست نے کہا تھا کہ لڑکیوں کی یہ عجیب عادت ہے، خود کھڑکی میں کھڑی جھانکتی رہیں گی مگر جب کوئی ان کی طرف دیکھتا ہے تو ''بدذات'' کہہ کر کھڑکی بند کر دیتی ہیں اور پھر کسی درز سے دیکھنے والے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ یقیناً شیریں بھی اس کا تجزیہ گہرائی سے کرتی رہی ہے تب ہی تو اتنا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر گئی ہے۔ یہ بات اس کے لیے بہت زیادہ خطرناک تھی۔ یہ گھر اس کے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر پتا نہیں کیوں اس وقت سلمان کو وہ ایسی خطرناک نہیں لگ رہی تھی بلکہ پیاری بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چہرہ تھامے اسی کو دیکھ رہی تھی اور سلمان کی ذہنی رو پڑی بدل رہی تھی۔

اب وہ سوچنے لگا تھا کیسا خوب صورت چہرہ ہے، اک کتاب سا چہرہ جو رحل چشم پہ دھرا ہے اور دل میں خواہش ہے کہ کاش کسی طرح ورق الٹتے رہیں۔ تلاوت گیسو کرتا رہوں، اور اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ شیریں کا چہرہ سپاٹ رہا۔ نہ خوشی کی جھلک نہ ناگواری کی رمق۔ وہ چہرہ ایک پتھر کی مورت بنا رہا جب کہ سلمان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے گنگناتے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کی نظر لعلیں لبوں پر تھی۔ وہ لب پھر ایک بار ہلے اور وہ بولی۔ ''تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے یہ بات اوروں کو بھی بتا دیا ہو گا تو سنو! میں نے اشارے کنائیہ میں خانم کو ہوشیار کرنا چاہا مگر تم مجھ سے بھی ہوشیار نکلے۔ دولت کی چھڑی گھما کر خانم، بابا سب کو قبضے میں کر لیا۔ اب اگر میں بتاؤں بھی تو وہ یقین نہیں کریں گے، اس لیے کہ سب کی نظروں میں تم نے اپنے وقار کو بلند کر لیا ہے۔''

اس جملے نے سلمان کے حواس لوٹا دیے اور اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا پھر بولا۔ ''تمہارا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔''

شیریں نے نہایت نرمی سے اپنے ہاتھوں کو چھڑایا پھر بولی۔ ''میرا بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں ہے کہ اسے اتنی تنخواہ ملے۔ وہ جہاں بھی ہوگا مزدوری کر رہا ہوگا۔ اور مزدوری میں کرنسی نوٹ نہیں سکے ملتے ہیں۔'' کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میری ایک التجا ہے۔ تم خاموشی سے کہیں اور چلے جاؤ تا کہ خانم اور بابا کی نظروں میں تمہارا وقار قائم رہے۔''

''اگر میں چلا گیا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟ محمود جیسے لوگ پیس کر رکھ دیں گے۔''

''قسمت سے کوئی لڑ پایا ہے اگر یہی کچھ ہماری قسمت میں ہے تو یہ ہو کر رہے گا تم گیا کوئی بھی قسمت کے لکھے کو مٹا نہیں پایا ہے۔'' کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

سلمان کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ شیریں کے انکشاف نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اگر وہ یہ گھر چھوڑتا ہے تو اس گھر کے مکینوں کا کیا ہوگا۔ محمود جیسے لوگ تو انہیں چبا جائیں گے۔ ان سارے مسائل کا حل صرف اور صرف فاکیہ تھی وہی حل نکال سکتی تھی۔

سلمان نے تکیہ پہ سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے انہی مسائل پر غور کرنے لگا۔ تب ہی فاکیہ آ گئی۔ اس نے سلمان کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟''

''ایک اور الجھن جو پیدا ہو گئی ہے۔''

''یہ الجھن خود تمہاری خرید کردہ ہے۔ تم ہی تو شیریں کی خوب صورتی پر مرمٹے ہو۔ اگر تم اسے ندیدوں کی طرح دیکھتے نہیں تو کبھی ایسا موقع نہیں آتا۔''

''اچھا تو تمہیں اس کا بھی علم ہے۔'' سلمان نے آنکھیں تریر کر کہا۔ ''گویا تم مجھ سے چھپ کر میری جاسوسی کرتی ہو۔''

''جب وہ کھانا کھلانے کے لیے تمہیں پنکھا جھل رہی تھی تو میں اتفاقاً آ گئی تھی اور اس کی پوری گفتگو سن لی۔''

''تو اب بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ یہ گھر چھوڑ دوں؟''

''جوں کے ڈر سے کمبل نہیں پھینکا جاتا۔ حالات کا مقابلہ کرو۔ ویسے میں بتا دوں شیریں تم سے نفرت نہیں کرتی۔ اگر وہ نفرت کر رہی ہوتی تو شاید تم ایک منٹ کے لیے بھی اس گھر میں نظر نہیں آتے۔''

''میری زندگی تو کھلونا بن گئی ہے۔'' سلمان کا لہجہ یاسیت بھرا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی یاسیت ابھر آئی تھی۔ گزرے موسموں کے سارے دکھ سلوٹوں کی صورت ابھر گئے تھے۔

''گہری نیند میں سوئے ہوئے آدمی پر چند چھینٹیں پانی کی ماری جائیں تو وہ خواب میں بارش دیکھنے لگتا ہے۔ حالات کی ایک معمولی سی ضرب نے تمہیں اتنا مایوس کر دیا کہ تم پتوار پھینک کر کشتی کو موجوں کے حوالے کرنے پر تل گئے۔ تم ایک باحوصلہ مرد ہو ننھے سے بچے نہیں۔'' فاکیہ بولی۔ ''اگر تم نے حوصلہ ہار دیا تو سوچو ان لوگوں کا کیا ہوگا۔ ابھی تو تمہیں اپنی ماں بہنوں کے بارے میں بھی غور کرنا ہے۔ کیا انہیں وہیں اپنی ممانی کا ظلم و ستم سہنے کے لیے چھوڑ دو گے؟ تمہیں ڈھیروں دولت کی ضرورت ہے اور دولت حاصل کرنے کا انتظام میں کر رہی ہوں۔''

''جوا کھیلنا مجھے پسند نہیں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''گناہ ثواب کے بارے میں سوچو گے تو گزر گئی زندگی۔ حالات کے مقابلے پر تب ہی کامیاب کہلاؤ گے۔ جب تمہارے پاس دولت کا ڈھیر ہوگا۔'' فاکیہ کی بات سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے چلو کہاں چلنا ہے؟''

''اسی کیسنو میں جہاں تمہیں بہت کچھ سمجھا جا رہا ہے۔ لوگوں نے ''جادوگر'' نام دے رکھا ہے۔ کئی پرانے کھلاڑی تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں تا کہ تم جس نمبر پر رقم لگاؤ وہ بھی اسی کو آزمائیں۔

''جادوگر، حیرت ہے ایسا نام کیوں دیا گیا۔'' سلمان کا استعجابی لہجہ سن کر فاکیہ بولی۔

''اس لیے کہ کیسنو کے بڑے بڑے ''شارپر'' بھی تم سے مات کھا گئے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر تم سے ہر قسم کے کھیل پر رقم لگوائی اور تمہیں فتح ملی فلش کھیلا تو میں نے گڈی سے پتے بدل کر تین ایکے کرائے۔ ''پن بال'' پر تمہارے نمبر پر بال لا کر رکھا۔ ''واچ پرل'' میں ''ایرو'' روکا۔ گویا تم نے جادو جیسا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہے بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔'' سلمان ہنس کر بولا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ آنگن میں خانم تار میں پردے گوشت کے پارچوں کو دھوپ میں سوکھنے کے لیے ٹانگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بولیں۔ ''جان مادر! کہاں کا قصد ہے؟''

''بازار جا رہا ہوں۔'' سلمان نے جواب دیا ہی تھا کہ روحیہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''برادر بزرگ! میرے لیے قند لیتے آیئے گا۔'' مٹھائی کا نام سن کر سلمان کے دل

میں ہوک سی ابھری کہ اس کی بہن بھی بازار جانے کا سن کر یہی فرمائش کرتی تھی۔ ساری بچیاں ایک سی ہوتی ہیں، خواہ روحیہ ہو یا.....

''تم نہ بھی کہتیں تو میں قندضرور لاتا کیوں کہ مجھے معلوم ہے میری لجوج ملوچک (نٹ کھٹ گڑیا) کو قند پسند ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔ ''اس سے پہلے تو کبھی نہیں لائے۔''

''میری خواہر نا قلہ (شریر بہن) اس وقت جیب خالی ہوا کرتے تھے مگر اب رب کعبہ کے طفیل بہت پیسے ہیں۔'' سلمان اس کے سر پر بندھے اسکارف کو چٹکی سے کھینچ کر بولا۔

''تو پھر مجھے دو تومان دو۔'' ناک سیکوڑ کر بولتے ہوئے اس نے اپنی داہنی ہتھیلی آگے بڑھا دی۔

''دو کیوں، یہ لو سو تومان، بازار جا کر اپنی پسند کے کپڑے لے آؤ۔ نوروز قریب ہے ناں!'' سلمان نے جیب سے سو تومان نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

رقم پا کر اس کی خوشی دیدنی تھی اور اسے خوش دیکھ کر سلمان کو راحت مل رہی تھی۔ خانم نے رقم دیکھ کر کہا۔

''تو اس کے مطالبات پورے کر کر کے شورہ پشت بنا دے گا۔ کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو کئی پوشش (لباس) موجود ہے۔''

''نوروز بھی تو سر پر آ پہنچا۔ اسی کے لیے دیا ہے۔''

''جب سب کا پوشش تیار ہوگا تو کیا اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔'' خانم نے غصیلی نظروں سے روحیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بازار اسی مقصد سے تو جا رہا ہوں۔ آپ کا اور ابا کا، دونوں کا پوشش میں اپنی پسند سے لاؤں گا۔ شیریں کے لیے پسند کر آؤں گا۔ پھر وہ جا کر دیکھ لے گی۔ اگر وہی سوت (روایتی لباس) پسند آیا تو لے لے گی ورنہ اپنی پسند سے لے آئے گی۔'' بولتے ہوئے سلمان نے آش پز خانے (باورچی خانہ) میں بیٹھی شیریں کی طرف دیکھا مگر اتنی دور سے وہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اس کے جملے پر اس کے چہرے پر کیسا ردعمل ظاہر ہوا ہے۔ اگر اسے ناگوار بھی لگتا تو بھی وہ اس کے لیے لباس لاتا۔ کیوں کہ وہ اس گھر کے لیے ایسا خوش قدم بننا چاہتا تھا کہ ہر طرف خوشیوں کے پھول کھل اٹھیں۔ ان لوگوں کی ترستی ہوئی زندگی سیراب ہو جائے۔ اپنی بات ختم کر

کے وہ باہر نکل آیا۔ گھر کے طاق نصرت (دروازے) سے باہر آ کر فاکیہ سے بولا۔ ''تم نے دیکھا، میری ایک چھوٹی سی پیشکش نے ان کے چہرے پر کیسی خوشیاں لا دیں۔''

''اور اگر میں ظاہر ہو کر بتا دیتی کہ یہ دانا ڈالا جا رہا ہے تاکہ شیریں جال میں آ جائے۔'' فاکیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں فوراً چیختا یہ بھوتنی ہے، کسی بھوت کی مسز اور وہ تینوں خوف سے زرد ہو جاتیں۔ تم جو بھی کہتی اس پر وہ یقین ہی نہیں کرتیں نا سواشیریں کے۔'' کہہ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکی اور اس میں سوار ہو گیا۔ اس بار فاکیہ بھی اندر آ گئی تھی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔ ٹیکسی والے کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ اس وقت ایک کی بجائے دو مسافر بیٹھے ہیں۔

ٹیکسی کیسنو کے سامنے رکی۔ اسے دیکھتے ہی گیٹ پر کھڑے پہریدار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوا۔ کئی آدمی اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ کئی لوگوں نے درمیان میں ہی بازی روک دی تھی۔ سلمان سیدھا پن بال کے کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس نے رقم لگانے کے لیے ٹوکن آگے بڑھایا تھا کہ کیسنو کی مخصوص وردی میں ملبوس تین چار آدمی آ کر اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

❁

سلمان نے چونک کر ان چاروں کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں حیرت و استعجاب تھا اور ان چاروں کے تیور خطرناک تھے۔ ان کے جسموں پر کیسنو کے مونوگرام والی وردیاں تھیں۔ اگر وردیاں نہ بھی ہوتیں تو بھی وہ اپنے حلیے کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے کیوں کہ ہر ایک کا چہرہ کرختگی کا نمونہ تھا۔ سب کے چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ حرام کھانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حرام غذا سے بننے والا خون بھی حرام بنتا ہے اور حرام خون کی جھلک چہرے پر صاف نظر آتی ہے۔ ان کے چہروں پر مکروہ پن پُتا ہوا تھا۔ سب کی کمر سے پستول لٹک رہے تھے اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ان سب کے ہاتھ ہولسٹر پر رکھے ہوئے تھے۔ گویا ایک ہی جھٹکے میں وہ پستول نکالنے کی پوزیشن میں کھڑے تھے۔ سلمان نے بڑبڑانے کے انداز میں فاکیہ کو مخاطب کیا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

فاکیہ وہاں کھڑے لوگوں کو خاک نظر آتی اسی لیے وہ مزے سے ان سب کے سروں پر

گردش کر رہی تھی۔ اس نے زمین پر اترتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری شہرت کا سبب ہے۔ میں ابھی ابھی ایڈمینسٹریٹر کے کمرے سے آ رہی ہوں۔ اسے شک ہے کہ تم بے ایمانی کرتے ہو۔ یہ لوگ تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے آئے ہیں۔ مگر خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوناں۔''

فاکیہ کے جواب نے اس کے حوصلے کو کوہ ہمالیہ بنا دیا اور وہ بے خوفی سے آگے بڑھا۔ اس نے 7 نمبر پر ایک بڑی رقم کا ٹوکن رکھ دیا۔ اس کے ٹوکن رکھتے ہی اس نمبر پر ٹوکنوں کی برسات ہوگئی۔ اس کے پیچھے منتظر کھڑے لوگوں نے بھی اسی نمبر پر ٹوکن رکھنا شروع کر دیا تھا۔

سلمان ابھی ٹوکن رکھ کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ ان میں سے ایک جو خاصا قد آور تھا اور اس کی وردی پر پھول لگے ہوئے تھے، آگے بڑھا۔ اسے نزدیک آتا دیکھ کر سلمان بولا۔ ''چہ حکایتی است؟'' (کیا معاملہ ہے)

آگے بڑھنے والے نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''دردست چپ تو چیست؟'' (تیرے بائیں ہاتھ میں کیا ہے؟)

سلمان نے جواب دینے کی بجائے بایاں ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے شک کو رفع کرنا چاہتا ہے کہ کہیں ہاتھ میں چمبک وغیرہ تو نہیں ہے جس کی مدد سے پن بال کے کانٹے کو روکا جا سکے۔ اس نے سلمان کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر آستین کی بھی تلاشی لے لی پھر بولا۔ ''ہاں اب بتاؤ کانٹے کیسے روکتے ہو؟''

''بے ایمانی کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو میری آنکھوں کا کمال ہے کہ میں گردش کو گنتا رہتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ خانوں کا شمار بھی کرتا رہتا ہوں۔ میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ کانٹا رکھنے سے پہلے میں اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کس خانے میں رکے گا۔'' سلمان نے کہا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ یہاں بڑے بڑے شارپر آ کر منہ کی کھا چکے ہیں۔'' اس نے کڑے تیور سے جواب دیا۔

''وہ شارپر ہوں گے مگر میں شارپر نہیں ہوں البتہ دماغ کا تیز ضرور ہوں اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تم کھیلو۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تم کس طرح چالاکی دکھاتے ہو۔''

اس کا لہجہ، آواز کی کرختگی سلمان کو گدگدا رہی تھی۔ اس نے ہنسی روکتے ہوئے ازراہ مذاق پہلے داہنے ہاتھ کو جھٹکا دیا پھر دونوں پاؤں پر وزن ڈال کر اکڑ و بیٹھ گیا اور فوراً ہی کھڑا بھی

ہو گیا۔ اس کی اس حرکت پر گارڈ چونک گئے۔ وہ سب ایک ایک قدم آگے بڑھ آئے اور اس طرح سے وہاں کے فرش کو دیکھنے لگے جیسے وہاں کوئی سوئچ ہو جس کو دبا کر گیم روکا جا سکتا ہو۔

اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس قدر آور نے سلمان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اپنے پستول کی تمام گولیاں اس پر خالی کرنے کا خواہش مند ہو مگر سلمان نے اس کی جانب توجہ ہی نہیں دی۔ اس کی توجہ پن بال بورڈ کی طرف بھی نہیں تھی کیوں کہ اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ فاکیہ اسے کامیاب کرا ہی دیتی۔ اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بال کی تقریباً تمام میزیں خالی پڑی تھیں۔ زیادہ تر کاؤنٹر بھی خالی تھی..... بس یوں سمجھ لیں کہ زیادہ تر لوگ پن بال بورڈ کے کاؤنٹر کے گرد آ گئے تھے۔

سلمان ابھی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک شور سا اٹھا۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ سمجھ گیا تھا کہ 7 نمبر آیا ہے۔ وہ جیتی ہوئی رقم کا ٹوکن لینے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر مین نے خود آگے آ کر اسے تھیلیاں دیں۔ تھیلیاں لے کر سلمان دوسری ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہاں فلش کھیلا جا رہا تھا۔ اسے ادھر آتے دیکھ کر کھلاڑیوں میں سے ایک نے کہا۔ ''آغائی! ادھر آ جائیں۔''

سلمان اس شخص کے برابر میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے جسے سلمان نے گرم جوشی سے تھام لیا۔ وہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آغا! آپ کی اتنی عمر بھی نہیں پھر ایسی شارپنگ کیسے آ گئی؟''

''میرے دوست! یہ شارپنگ نہیں قسمت کا کھیل ہے۔ اس وقت میرا ستارہ عروج پر ہے۔ میں جہاں بھی رقم لگاؤں گا مجھے فائدہ ہی ملے گا۔''

''تو اس ٹیبل پر بھی قسمت آزمائیے۔''

سلمان سمجھ گیا تھا کہ یہ کیسینو کا شارپر ہے۔ ہر کیسینو میں ایک دو ایسے بندے ضرور رکھے جاتے ہیں جن کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی جیبیں خالی کرائے۔

سلمان نے اس کی خالی کردہ کرسی سنبھال لی۔ پتے دوبارہ بانٹے گئے۔ سلمان کے سامنے بھی تین پتے ڈالے گئے تھے کہ فاکیہ کی آواز سنائی دی۔ ''سلمان! پتے بانٹنے والا بھی شارپر ہے اس نے دانستہ چھوٹے پتے ڈالے ہیں پھر بھی تم بازی لمبی لگاؤ گے۔ بڑی رقم جیتنے کا اسے موقع دو کیوں کہ اگلی دو بازیاں تم جیتو گے۔''

سلمان نے ڈھائی ہزار تومان کی بازی لگا دی۔ یہ بازی نیلے سوٹ والے نے جیتی۔

اس کے سامنے ٹوکنوں کا ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ اس نے گڈی لے کر پھر پتے بانٹے سلمان نے اس بار بھی ہزار تومان کی بلائنڈ کھیلی۔ ایک ایک کر کے باقی تینوں نے بھی بلائنڈ کھیلی تیسرے راؤنڈ میں سلمان نے رقم ڈبل کر دی ان تینوں کو بھی جوش آ گیا انہوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ چھٹے راؤنڈ میں سلمان نے چار ہزار کی چال چلی۔ باقی تینوں نے بھی اتنی ہی رقم کے ٹوکن بڑھا دیے۔ کھیل بہت ہیجان خیز بن چکا تھا۔ ہر ایک کا چہرہ جوش میں سرخ پڑ چکا تھا۔ دیکھنے والے بھی ہیجان محسوس کرنے لگے تھے۔ ٹیبل کے گرد اچھی خاصی بھیڑ لگ چکی تھی۔ ٹیبل کے درمیان میں ٹوکنوں کا بہت بڑا انبار لگ چکا تھا کہ فاکیہ نے سلمان کو مخاطب کیا۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ تم شو (Show) کر دو۔ میں نے ایک ایکا گڈی سے اور دو ایکے دو کھلاڑیوں سے لے کر ملا لیا ہے۔ اب تمہارے پاس تین ایکے ہیں۔ کہیں یہ لوگ بے ایمانی پر نہ اتر آئیں اس لیے تم شو کر دو۔''

سلمان نے چال چلنے کے لیے تو مان اٹھائے مگر فوراً رکھ دیے پھر بولا۔ ''بازی بہت زیادہ لمبی ہو چکی ہے۔ میری ہمت جواب دے رہی ہے اس لیے شو کر رہا ہوں۔ کیا آپ لوگوں کی اجازت ہے؟''

باقی تینوں کھلاڑی بھی اکتا رہے تھے اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا اور سلمان نے اپنے پتے الٹ دیے۔ پتے دیکھ کر سب کے چہرے اتر گئے۔ ان سے بڑے پتے اور ہو تے ہی نہیں اس لیے کسی نے بھی چال نہ چلی اور سب نے اپنے اپنے پتے الٹ دیے۔ سب سے بڑا پتا سلمان کا تھا اس لیے تمام ٹوکن اس کے حصے میں آ گئے اس نے کل پانچ بازی کھیلیں اور تقریباً تین لاکھ تومان جیت کر کیسینو سے نکل آیا۔ اس لیے کہ رات کافی ہو چکی تھی۔

وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ شیریں کے گھر والوں کے حالات یکسر تبدیل کر سکتا تھا۔ ان کی غریبی کو دور کر کے خوش حال گھرانے کی صف میں لا سکتا ہے۔ وہ تومان سے بھرا بیگ لے کر ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ ٹیکسی جیسے ہی اسٹارٹ ہوئی فاکیہ نے کہا۔ ''اب تم آرام سے جا کر اپنی محبوبہ کا درشن کرو، میں بھی چلی ورنہ تم کہو گے کہ کباب میں ہڈی بننے آ گئی۔''

اس کے جانے کا سن کر سلمان نے بھی اطمینان کی سانس لی کہ وہ مذاقاً بھی ایسی کوئی حرکت کر سکتی تھی۔ جو خواہ مخواہ کی بدمزگی پیدا کر دیتی۔ ٹیکسی اپنے راستے پر دوڑتی رہی۔ اب اس کا محلہ نزدیک آتا جا رہا تھا کہ یکا یک ٹیکسی رک گئی۔

''کیا ہوا بھائی، رک کیوں گئے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''اسے ہم نے روکا ہے۔'' داہنی جانب کی کھڑکی پر جھک کے ایک شخص نے کہا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اتنی کرختگی عام لوگوں کے چہروں پر کہاں ہوتی ہے۔

''مگر کیوں روکا؟'' سلمان نے سوال کیا۔

''کیوں کہ مجھے غلط لگ رہا تھا کہ تم اتنی بڑی رقم اکیلے لے کر جاؤ۔'' اس نے پستول دکھا کر کہا۔

''تو گویا تم ڈاکو ہو؟'' سلمان نے معصوم بن کر پوچھا۔

''اسے خدمت کہتے ہیں ڈاکا نہیں۔ یہ دولت بڑی بُری چیز ہے۔ تم کسی بھی مصیبت میں پھنس سکتے ہو اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ یہ بیگ ہمیں دے دو۔'' اس شخص نے پستول نچا کر کہا۔

''گویا تم رقم لیے بغیر نہیں ٹلو گے؟ ٹھہرو میں خود باہر آتا ہوں۔'' اس نے اتنا کہہ کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے فاکیہ کو آواز دی۔ لگتا تھا وہ کہیں قریب میں تھی کیوں کہ دروازہ کھلنے سے پہلے ہی آ گئی۔ اسے دیکھ کر سلمان شیر ہو گیا۔ اس نے ڈاکو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کیوں نہ ہم تمہیں اس جسارت کی تھوڑی سی سزا بھی دے دیں۔''

ابھی سلمان ٹیکسی سے اتر ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے بھی پستول نکال لیا اور بولا۔ ''بیگ اندر ہی رہے گا صرف تم نیچے اترو گے۔''

''اچھا! لو میں نیچے اتر رہا ہوں مگر تم تو اپنے ہاتھ سے سانپ پھینکو۔ یہ کاٹ بھی سکتا ہے۔''

سلمان کی بات سن کر اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اپنی بے ساختہ چیخ کو روک نہ سکا۔ اس کے ہاتھ میں پستول کی جگہ کالا سانپ پھنکار رہا تھا۔ پستول بھی کالا تھا اور سانپ بھی۔ دونوں ہی موت تقسیم کرتے ہیں مگر ایک جان دار اور دوسرا بے جان۔ ایک ٹریگر کے اشارے پر چلتا ہے اور دوسرا اشارے کا محتاج نہیں، اپنی مرضی کا مالک ہے۔ مرضی کے مالک سے سب ہی ڈرتے ہیں۔ ڈرائیور بھی پستول پھینک کر ڈر سے چیختا ہوا ٹیکسی سے اتر کے بھاگتا چلا گیا تھا۔

اسے یوں بھاگتے دیکھ کر اس کا ساتھی جس نے ٹیکسی رکوائی تھی۔ پستول کی طرف جھپٹا تب ہی سلمان نے کہا۔ ''برادر عزیز! پستول نہیں سانپ ہے دور رہو۔'' اس کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ اسے اٹھاتے اٹھاتے رک گیا، ساتھ ہی ساتھ اس نے اچھال بھری تھی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا کیوں کہ پستول اسے بھی پھنکارتا ہوا سانپ نظر آیا تھا۔ فاکیہ دور کھڑی اس منظر کا لطف

لے رہی تھی۔

دوسرا شخص دور ہٹ کر سنبھل چکا تھا مگر حیرت اب تک اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی کیوں کہ دور ہٹتے ہی پستول اپنی اصل شکل میں نظر آنے لگا تھا۔

''یہ..... یہ کیسا سحر ہے۔ کیا تم ساحر ہو؟'' وہ سلمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''مجھ سے کچھ پوچھنے سے پہلے کپڑے تو پہن لیتے۔'' سلمان نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔

اس شخص نے اپنے جسم کی طرف دیکھا واقعی اس کے جسم پر کپڑوں کے نام پر صرف انڈرویئر باقی تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ سڑک سنسان تھی وہ جلدی سے ٹیکسی کی طرف بھاگا مگر سلمان نے اس کے چوکھٹے پر زوردار گھونسا مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا سلمان نے لات مار کر اسے ٹیکسی کے نیچے کر دیا۔ تب ہی اسے سامنے سے آتی ایک کار دکھائی دی۔ سلمان اسے چھوڑ کر سڑک کے نزدیک پہنچ گیا اور اس نے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ کار رک گئی سلمان آگے بڑھ کر بولا۔ ''ٹیکسی خراب ہو گئی ہے۔ پلیز لفٹ دے دیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کہتے ہوئے ڈرائیونگ کرنے والے نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیا۔

اپنے محلے کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے کار رکوالی اور نیچے اتر کر اس نے سرکاری حکم کے مطابق دو تومان کار کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ ڈرائیو کرنے والے نے بھی کچھ نہیں کہا گویا وہ رقم لینے پر راضی تھا۔ سلمان نے سلام کیا اور محلے کے اندر داخل ہو گیا۔

مرکزی دروازے کو پار کر کے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا اس کا مزاج بھنا گیا۔ آنگن میں بچھی کرسی پر محمود بیٹھا تھا۔ کہتے ہیں اچھے نام کے حامل کا کردار بھی اچھا ہوتا ہے۔ مگر محمود پر یہ مثل صادق نہیں آتی تھی۔ وہ تو سرتاپا خدا سے بغاوت پر آمادہ تھا۔ سود کا کاروبار خدا سے بغاوت ہی تو ہے۔

''اب آپ کو کیا شکایت ہے؟'' سلمان نے کڑے تیور سے کہا۔

''ارے عزیز ما' تم ناحق غصے میں آ رہے ہو۔ میں اس گھر میں تب سے آ رہا ہوں جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ شرعی حکم ہے کہ ایک دوسرے سے ملتے رہو۔''

''اچھا تو آپ شریعت کو بھی مانتے ہیں۔''

''تو کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔''

''مسلمان اسے نہیں کہتے جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا، مسلمان کی پہچان تقویٰ ہے۔ کیا تم نماز روزے کے پابند ہو کبھی زکوٰۃ دی ہے؟ چلو نکلو دفع ہو۔'' سلمان دہاڑا۔

اس کے غصے کو دیکھ کر خانم بھی خاموش رہ گئی۔

''جاتا ہوں جاتا ہوں مگر یاد رکھو مجھ سے دشمنی مہنگی پڑے گی۔'' کہتا ہوا محمود باہر نکل گیا۔

اسے بھگا کر سلمان اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے ابھی وہ لیٹا ہی تھا کہ قہوہ لے کر شیریں آ گئی۔ آج خلاف توقع اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے طشت کو سلمان کے نزدیک رکھا اور بیڈ ہی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آج تم نے خوش کر دیا۔ آج مجھے لگا کہ کوئی میرا محافظ بھی ہے۔ ورنہ آج تک تو میں یہی سمجھتی آئی تھی کہ میری حفاظت کرنے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ بھائی میرا بزدل ہے اور باپ ضعیف۔'' اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''انسان کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔ خواہ دوسروں کو آزار پہنچاتے رہو یا مسیحا بن کے انسانیت کے جسم سے کانٹا کانٹا چنتے رہو، زندگی کی شام ہو ہی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم لوگوں کے لیے ڈھال بنا ہوا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے شیریں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی مگر وہ دو صاف آنکھیں ایسی تھیں جیسے مسجد کا صحن جہاں کوئی گند نہیں صرف تقدس ہلکورے لیتا ہوا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' فنجان میں قہوہ انڈیلتے ہوئے شیریں بولی۔

سلمان نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا۔ اس کے لال گلابی ہاتھ زبردست تھے اور من مانیوں پر آمادہ تھے۔ اس نے ہاتھوں کے کٹورے میں شیریں کے چہرے کو بھر لیا۔ وہ ہاتھوں کی گلابیوں سے جام الفت پینا چاہتا تھا کہ شیریں گھبرا کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

شیریں عمر کے اس حصے میں کھڑی تھی جب آنکھوں میں خواب اور دل میں امنگیں جاگتی ہیں۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ میرا بھائی نہیں اس کا ہمشکل ہے یعنی صرف ایک لڑکا ہے اور وہ ایک لڑکی۔ ایسی لڑکی جس کی شادی میں رکاوٹ ہی رکاوٹ ہے۔ اس لیے اس کے دل میں کشش تو پیدا ہو گی ہی اور اس کا ادراک بھی اسے ہو چکا تھا کہ اس کے دل کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے اور اس انقلاب کی وجہ سلمان کی آنکھیں تھیں، ان آنکھوں میں چھپا پیغام تھا اور اسی وجہ

سے اس نے سلمان کی حقیقت کسی کو نہیں بتائی تھی کیوں کہ اس کی دھڑکن کی لے سلمان کے نام کی مالا جپنے لگی تھی۔ اس وقت بھی دل نے بغاوت کر دی تھی۔ جیسے ہی سلمان نے اپنی ہتھیلی کے رحل پر اس کا چہرہ رکھا تھا اسے یوں لگا تھا جیسے گدگدانے کے انداز میں تجسس کی انگلیاں اس کے احساس کے گداز حصوں میں کھبنے لگی ہیں اسی وجہ سے وہ نیچے اتر آئی تھی اور اسکارف درست کرتے ہوئے جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے چہرے سے خانم اس کی چوری نہ پکڑ لیں اس لیے سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہر عکس خود آئینہ ہے کیوں کہ ہر سایہ اپنی زبان بولتا ہے اس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ اس کا دل بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہ دل اس کے سینے میں صرف دھڑک رہا ہے مگر اس کی ہر دھڑکن سلمان کے نام کی گردان کر رہی ہے جب کہ اسے علم تھا وہ جتنا قریب ہے اتنا ہی دور۔ لوگ اسے اس کا سگا بھائی سمجھ رہے ہیں اور سگے بھائی سے شادی ہونا ناممکن بات ہے۔

اس نے کمرے کی لائٹ بند کر دی اور کمرے سے پھر باہر آ گئی۔ وہ آنگن کے اس حصے کی طرف بڑھتی چلی گئی جدھر اس کے ابو سریر (چارپائی) بچھا کر دوپہر میں آرام کرتے تھے..... وہ اسی پیڑ کے نیچے جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کی نظریں آسمان کو تکنے لگیں۔

آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ چاندنی ہر سو کھیت کر رہی تھی مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ٹھنڈی چاندنی اسے گدگدا رہی ہے اور نرم ہوائیں جس میں نامعلوم پھولوں کی باس رچی ہے کچھ کہہ رہی ہیں۔

یہ شب کی ہوا بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے یا پھر نشہ بلا کے جذبات بھڑکا دیتی ہے۔ اسے بھی اپنے انگ انگ میں عجیب سی سرسراہٹ نامعلوم بے خودی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا حل کیا ہو اس نے سوچا، اب وہ ننھی بچی تو ہے نہیں، وہ دور گزرے زمانہ گزر چکا ہے۔ بچپن تو کھلونے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی عمر کی مٹھی سے بھی وہ کھلونے کی طرح چھوٹ گیا تھا۔ نوجوانی کی دہلیز بھی چھوڑنے والی تھی۔ اسی دور کو جوانی کے ٹوٹ کر آنے کا دور کہتے ہیں۔ لڑنا جھگڑنا بچپن کی ضرورت ہے تو خواب دیکھنا جوانی کی۔ ابتدا میں خواب دیکھا کرتی تھی مگر حالات کے عصا نے تمام خوابوں کو بھگا دیا تھا اب وہی خواب ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بھوک کے وقت سوکھی روٹی بھی مزہ دیتی ہے۔ اتنے عرصے بعد اس کے در دل پر دستک ہوئی تھی۔

اس لیے وہ من کے دوار کھلونے پر صدفی صد آمادہ تھی۔ مگر حالات کی نزاکت کو بھی محسوس کر رہی تھی۔ کیسے یہ بحر آتش پار ہو گی اسی پر غور کرتے کرتے ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں سے وہ مدہوش ہوتے ہوئے بالآخر نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

سلمان بھی اپنے کمرے میں لیٹا ہوا اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ یہ چاہت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ اسے صحیح سمت دینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ فاکیہ سے مدد لی جائے۔ اس سے کہا جائے کہ وہ شیریں کے اصل بھائی کو لے آئے اور تب سلمان با آسانی شیریں کا ہاتھ مانگ سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ مدتوں بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔

فاکیہ سے مدد لینے کا سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ ذہن پر سکون ہوا تو اس نے سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی ایک دوسری صورت ذہن کے پردہ سیمیں پر ابھر آئی۔ وہ چہرہ جو اسے سب سے عزیز تھا مگر اک عرصے سے اس نے مڑ کر خبر نہ لی تھی۔ وہ چہرہ تھا اس کی ماں کا۔ اس کی ماں جسے وہ بہت چاہتا تھا، پتا نہیں اب وہ کس حال میں ہو گی۔ وہ اپنے ابو کو یاد کرنے لگا۔ وہ جب مشہد سے چھٹیوں پر آئے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ ہو سکتا ہے امی نے یا ماموں نے انہیں خبر بھیج کر بلوا لیا ہو۔ وہ ان ہی سب باتوں پر غور کرتے کرتے سو گیا۔

صبح کا ناشتہ لے کر روحیہ آئی تھی۔ قہوہ اور بھنے ہوئے آلو۔ اس غیر معقول غذا کو اس نے بے رغبتی سے کھایا پھر پوچھا۔ ''تمہاری تمام کتابیں موجود ہیں ناں؟''

''برادر بزرگ! میرے پاس پوری کتابیں کب رہی ہیں؟''

''اچھا تو آج مجھ سے دس تومان لے لو جتنی بھی کتابیں کم ہیں نئی لے لینا۔''

''پانچ ریال الگ سے بھی دیں گے مجھے کچھ کاپیاں بھی لینی ہیں۔''

''پانچ ریال کیوں دو تومان لے لینا۔'' کہہ کر وہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر سلمان کو اپنی بہن یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی تو اتنی ہی معصوم ہے۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری ممانی نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ امی تو ہر ظلم منہ بند کر کے سہہ لیتی تھیں مگر وہ تو پل بھر میں بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ تمام ظلم اسی کے نام لکھ گئے ہوں گے۔

وہ لیٹے لیٹے یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ فاکیہ خود ہی آ گئی۔ اس کے آتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے فاکیہ نے کہا۔ ''کیسی رہی؟''

''مگر تم نے تو کہا تھا میں نہیں آؤں گی۔''

''ہاں یہی سوچا تھا مگر ایک ضروری بات تمہیں بتانا بھول گئی تھی اسی لیے آنا پڑا۔''

''وہ بات تو الگ رہی مگر میری بھی ایک بات سن لو۔''

''اچھا تم ہی پہلے بتا دو۔''

''میری خواہش ہے کہ اب اس ڈرامے کا اینڈ ہو جانا چاہیے۔ شیریں کے بھائی کو آجانا چاہیے۔''

''مگر کیوں؟ اگر وہ آ گیا تو تمہیں محلے بھر کے جوتے پڑیں گے کہ جوان لڑکیوں والے گھر میں تم دھوکے سے بھائی بن کر رہ رہے تھے۔'' فاکیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''اس لیے میرا خیال ہے کہ تم اس خیال کو دل سے نکال دو۔''

''میں شیریں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں، اس حالت میں تو ناممکن ہے کہ حسین صاحب اور خانم راضی ہوں، سگے بھائی بہن میں بھی کبھی شادی ہوتی ہے؟ وہ آ جائے گا تو میری حیثیت بدل جائے گی اور تب میں رشتہ ڈالوں گا تو فوراً قبول کر لیا جائے گا۔''

''اس کے لیے مجھے تمہارے گرد پھیلایا ہوا حصار ختم کرنا ہوگا اور جیسے ہی وہ حصار ختم ہو گا تمہاری اصل شکل سب کو نظر آنے لگے گی۔ ابھی تو ان سب کو تمہارا چہرہ شیریں کے بھائی جیسا لگ رہا ہے۔''

''ویسے بھی میں نے ان لوگوں کے لیے اتنا کچھ کر دیا ہے کہ انہیں غریبی نظر نہیں آئے گی۔''

''اگر تم یہی چاہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔ میں اس لڑکے کو تہران سے بلا لیتی ہوں۔ لیکن جب وہ آئے گا تو پھر سوچا ہے صورت حال کیسا رخ اختیار کرے گی؟''

''بالکل، مجھے معلوم ہے۔ اس کا حل یہ سوچا ہے کہ میں کل اپنے گھر کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ عید کے بعد امی کو لے کر آؤں گا۔ وہ رشتہ مانگیں گی تو یہ لوگ بھی انکار نہیں کریں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی مگر یہ بھی سن لو کہ میں ایک مہینے تک تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گی کیوں کہ پرسوں سے رمضان شروع ہے اور رمضانوں میں ہماری قوت سلب ہو جاتی ہے۔''

''اس ایک ماہ میں شاید ہی کبھی تمہاری ضرورت پڑے کیوں کہ میں اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رہوں گا اور میرے ساتھ اچھی خاصی رقم ہوگی۔ رقم سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس لیے

ممانی یا اس کا بھائی بھی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔''

''اگر تم سمجھتے ہو کہ وہاں میرے بغیر وقت گزار لو گے تو ٹھیک ہے میں وہاں جانے کا انتظام کر دوں گی۔ کل ہی خانم کے بیٹے کو بلوا لیتی ہوں اور جب وہ آتو بوس (بس) سے اترے گا تو سیڑھیوں سے پھسل کر سڑک پر سر کے بل گرے گا اور بے ہوش ہو جائے گا۔ کچھ دنوں تک وہ خاموش رہے گا پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے گا۔ اس دوران اس نے کسی سے کہا بھی کہ میں تہران سے لوٹا ہوں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' فاکیہ نے اپنی پوری پلاننگ بتائی۔ اس پلاننگ میں کہیں کھوٹ نہیں تھا اس لیے سلمان نے بھی کچھ نہیں کہا۔

''یہ سن لو اس ایک ماہ میں تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ تمہاری ممانی کا بھائی یا خود ممانی کوئی سازش رچ سکتی ہے۔''

''بے فکر رہو اب میں وہ پرانے والا سلمان نہیں ہوں، اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔''

''پھر بھی تم یہ انگوٹھی رکھ لو وقت پر بہت کام آئے گی۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''جب تک یہ تمہارے ہاتھ میں رہے گی تمہیں غیب سے رقم ملتی رہے گی۔ کبھی ہاتھ تنگ نہیں رہے گا۔''

فاکیہ سے انگوٹھی لے کر اس نے اپنی انگلی میں پہن لی پھر بولا۔ ''ٹھیک اب کل ملاقات ہوگی میں ذرا سو لوں تاکہ کل کا سفر اچھا رہے۔''

''تم سو اور میں چلی مگر یاد رکھنا میں رمضانوں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔''

''ہاں ہاں یاد ہے اب میرا پیچھا چھوڑو مجھے آرام کرنے دو۔''

فاکیہ مسکراتی ہوئی بس ایک پل میں غائب ہو گئی۔ سلمان بھی یادوں کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے تھک کر نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ شاید شیریں یا روحیہ آئی تھی اور اسے سوتا دیکھ کر لوٹ گئی تھی کیوں کہ رات میں اس نے کھڑکیوں کی چٹخنی لگا دی تھی مگر اس وقت کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس سے ہوا کے ساتھ دھوپ بھی آ رہی تھی۔ سلمان نے جلدی سے بستر چھوڑا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے آنگن میں چلا آیا۔ خانم صحن میں رکھی لکڑیاں چیر رہی تھی۔ انہوں نے سلمان کو آتا

دیکھ کر کلہاڑی روک لی پھر مسکرا کر بولیں۔ ''تم دونوں بھائی بہن کی کوئی حرکت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تم دن چڑھے سونے لگے ہو اور شیریں آنگن میں ہی تمام رات گزار دیتی ہے۔''

''اے نک چڑھی بلی۔'' سلمان نے خانم کی بات کو نظر انداز کر کے روحیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جلدی سے ناشتہ لا، بھوک سے میرا دم نکل رہا ہے۔''

''ارے برادر بزرگ! یہ آپ نے کیا کہا، میں بلی ہوں تو آپ بلے، کٹکھنے بلے۔'' روحیہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''میں ٹھہرا ایک شریف انسان اور تو بلی او بلی او بلی۔'' کہتا ہوا سلمان چہرہ صاف کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد روحیہ ناشتہ لے کر آ گئی۔ آج ناشتہ پہلے کے بہ نسبت زیادہ بہتر تھا۔ برنج (چاول) اور بیضہ سلمان کو بہت زیادہ پسند تھا۔ اس نے رغبت سے کھایا پھر فنجان میں قہوہ نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان دو غذاؤں کو یکجا کرنا طبی نقطہ نظر سے غلط ہے پھر بھی وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ آج بھی اسی کی پسند پر برنج بھیجا گیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے سوچا کہ ایک چکر سوق (بازار) کا لگا لے۔ اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ بہن کے لیے تحفہ تو لینا ضروری ہے۔ اسی خیال سے وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تھا کہ خانم نے پوچھا۔ ''جان مادر کہاں کا قصد ہے؟''

''بس یوں ہی سوق تک جا رہا ہوں۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''ایسی کون سی خریداری کرنا ہے؟''

''ایک بلا لیتا آؤں گا اپنی بلی کے لیے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''بردار بزرگ! آپ نے اب مجھے بلی کہا تو میں آپ سے کٹی ہو جاؤں گی ہاں!'' روحیہ تنگ کر بولی۔

''اچھا اچھا میری نک چڑھی بلی اب تمہیں بلی نہیں کہوں گا۔'' کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' جیسے ہی وہ باہر نکلا اس آواز نے اسے روک لیا۔ اس آواز میں اتنی شفقت اتنی حلاوت تھی کہ وہ خود کو روک نہ سکا اور مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے پیچھے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جسے وہ مطلق پہچانتا نہیں تھا۔ نکلتا ہوا قد، گندم کی بالیوں جیسی رنگت، مضبوط ہاتھ پیر، کشادہ پیشانی اور ہلکی خشخشی داڑھی۔ وہ سرتا پا سحر آفرین شخص

تھا۔ سلمان کو رکتا دیکھ کر وہ مزید قریب آ گیا تھا۔ سلمان اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''جناب من! میں آپ کے اسی محلے میں رہتا ہوں۔ مجھے لوگ احمد ہانی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ آپ سے ملاقات کروں۔ یہیں اسی گلی میں مکان ہے اگر مناسب سمجھیں تو قہوے کی ایک ایک پیالی ہو جائے۔''

سلمان اس خیال سے کہ یہ شخص معتبر اور خوش، اطوار ہے ایسا شخص ضرورت کے وقت کام آ سکتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ شخص اسے اپنے گھر کے دروازے تک لایا پھر اسے باہر کھڑا کر کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر آ کر بولا۔ ''اندر تو آ جائیں۔''

سلمان نے اندر داخل ہو کر کمرے پر نظر ڈالی۔ فرش پر دبیز قالین، معمولی سا فرنیچر مگر اس کی سیٹنگ میں نفاست کا کمال ''یقیناً یہ لوگ اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ احمد ہانی واپس آ کر برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کرتے کیا ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال تو بیکار بیٹھا ہوا ہوں۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''یہ تو بری بات ہے۔ انسان کو بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔'' اس کی کھوجی نظریں سلمان کے پاتال کی خبر لانے کی سعی میں تھیں۔ ایسی تیز نظریں اس کے لیے ہیجان کا باعث تھیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ اسے خاموش پا کر احمد ہانی نے کہا۔ ''پچھلی یادوں کو کبھی کبھی گزرتے وقت کی دھوپ نہ دو تو وہ نکھرنا چھوڑ دیتی ہے۔ دماغ پر امور دفتری کا بوجھ نہ ڈالو تو وہ زنگ خوردہ دروازے کا قبضہ بن جاتا ہے کہ ضرورت پر جب دروازے کے پلڑے کو دھکیلو تو وہ چرچڑاہٹ کے ساتھ کھلتا ہے اس لیے دماغ کو بے مہار نہ چھوڑو کسی نہ کسی کام میں لگاؤ۔ اگر کچھ اور نہ ممکن ہو تو دینی کاموں میں وقت دو۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی بیگم چھوٹے چھوٹے دو فنجان اور قہوے کا چھوٹا سا سماور لے کر داخل ہوئی۔ اس نے نہایت سلیقے سے طشت کو سنٹر ٹیبل پر رکھا اور فنجان میں قہوہ ڈالنے لگی۔ اس نے خود کو چادر میں پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ احمد ہانی کی زندگی میں مذہب کی پابندی سخت ہے۔

ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ سلمان نے سوچا کیوں کہ اسلام پسند لوگ شہنشاہ کے ناپسندیدہ افراد میں شمار ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مسجد کے باہر کار آگاہ (سی آئی ڈی) کے لوگ مستعدی سے نظر رکھتے تھے پھر عام لوگوں کا یہی خیال تھا کہ شاہ تو ملک کی ترقی کے

لیے کوشاں ہے اور یہ ملا ملک کو صدیوں پیچھے لے جانے کی کوشش میں ہیں۔ اتنی سختی کے بعد بھی اسلام پسند حلقہ عاشقوں جیسے جنون، دیوانوں جیسی لگن کے ساتھ اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے کام میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے مجالس سید الشہدا جو تھی۔ ایسے لوگ، ذاکر کربلا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بیان کرنے کے نام پر حالات حاضرہ پیش کرتے۔ اشارے اشارے میں شاہ کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ کہنے کو وہ یزید، شمر، عمر ابن سعد اور ابن زیاد کا ظلم بیان کرتے مگر حاضرین سمجھ جاتے کہ یہ شاہ کی تاناشاہی پر تنقید کر رہے ہیں۔ ملک میں 60 فیصد اہل تشیع کی ہے اور پڑوسی ملک عراق جو اہل تشیع کا مرکز ہے کیوں کہ وہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار ہے جو شیعت کا محور بنا ہوا ہے اور عراق میں 73 فیصد آبادی اہل تشیع کی ہے۔ جب مذہب پر بات آئے گی تو عراق کے لوگ بھی ایرانیوں کی مدد کو دوڑ پڑیں گے۔ اس لیے شاہ اس قسم کی مجلس پر پابندی نہیں لگا پا رہا تھا۔ یقیناً احمد ہانی کا تعلق بھی انہی اسلام پسندوں سے ہے۔ سلمان مسلسل یہی سوچ رہا تھا۔

''جب بھی موقع ملے درس میں چلے جایا کریں، عاقبت ہی سنورے گی۔'' احمد ہانی بولا۔

''مگر جناب میں اسلام کو اوڑھنا بچھونا بنانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو رمضان آیا تو دو چار روزے رکھ لیے۔ عید بقرعید پر نمازیں پڑھ لیں۔ اس سے زیادہ پابندی مجھ سے نہیں ہوتی۔'' سلمان نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''خیر ہر انسان اپنا جواب دہ خود ہے۔ میرا جو فرض تھا پورا کر دیا ویسے میں نے آپ کو مذہب کی طرف راغب کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے بلکہ ایک خاص بات بتانی ہے۔''

''جی فرمائیں۔'' سلمان ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''مجھے آج اطلاع ملی ہے کہ آپ کے گھر میں اس وقت خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہیں۔''

سلمان نے چونک کر دیکھا۔ شاید وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

اسے یوں منہ پھاڑے اپنی جانب دیکھتے پا کر احمد ہانی بولا۔ ''دراصل حکم دین ہے کہ اپنے پڑوسی کے دکھ و خوشی میں شریک رہو۔ دکھ کا مداوا کرنا بھی کارِ ثواب ہے۔''

بات صد فیصد صحیح تھی۔ اس لیے سلمان کچھ نہ بولا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ ان دنوں دونوں ہاتھوں سے دولت جمع کر رہے ہیں؟''

احمد ہانی نے سلمان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ نرم بھی تھا اور شفیق بھی۔

''آپ نے درست سنا ہے۔'' سلمان نے اس طرح کہا جیسے ہارا ہوا جواری اپنی ہزیمت کا اقرار کرتا ہے۔

''انسان کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ بھوک ہے۔ پیٹ کی بھوک اور بدن کی بھوک اور اس بھوک سے کئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ کئی خارزار بنتے ہیں۔ خواہشات کا جنگل کھڑا ہو جاتا ہے۔ محرومیوں کے دشت تیار ہو جاتے ہیں۔ انسان خواہشوں کا غلام ہے اور جب اس کی خواہشات تکمیل پانے کی بجائے پامال ہوتی ہیں تو اس کا انفرادی کرب معاشرتی انتشار کا سبب بنتا ہے اور سماجی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ تہذیبی اقدار ٹوٹنے لگتی ہے۔ ناانصافیوں کے ناگ پھن پھیلائے کھڑے ہونے لگتے ہیں اور تب یہ معاشرہ سچ مچ جنگل بننے لگتا ہے۔ مگر جنگل راج کبھی کامیاب نہیں ہوتا اسی لیے اسلام نے صبر و قناعت کی تلقین کی ہے' صبر معراج دیتا ہے مگر تم نے صبر کا راستہ کھوٹا کر دیا ہے۔''

''مگر مجھے تو سماج سے کچھ لینا دینا نہیں اور نہ ہی سماج میں گھلنے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکیلا ہوں، خود میں مست رہتا ہوں۔''

''اور اسی لیے تم غلط راستے سے دولت لا رہے ہو۔ دولت جو خود غلط ہے۔''

''جی نہیں انسان پاکیزہ ہے دولت بھی پاکیزہ ہے۔ غلط راستے سے آ کر بھی دونوں پاکیزگی کا مظہر ہیں۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے۔ میں مولانا تو نہیں مگر دین کا جانکار ہوں اس لیے ہم پر بھی فرض ہے کہ معاشرے کو بگڑنے نہ دیا جائے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ غلط راہ کا انتخاب غلط ہوتا ہے۔'' وہ بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں ڈال رہا تھا۔

''یہ بات آپ سے کس نے کہہ دی؟'' اس نے بے خیالی میں ہتھیلی رگڑی ایسے جیسے ہتھیلی میں پھانس چبھ گئی ہو۔

''جس سے انسیت ہوتی ہے دل ادھر کھنچ جاتا ہے۔ جب دل کھنچتا ہے تو توجہ مرکوز ہوتی ہے اور پھر مطلوب کی ہر حرکت نظروں میں رہنے لگتی ہے۔''

''گویا آپ میری جاسوسی کرتے ہیں؟''

''اسے غلط معنوں میں نہ لو، بس میرا مقصد ایک ہے کہ تمہیں تباہی کے راستے سے کھینچ

لوں۔'' وہ کسی منجھے ہوئے مقرر کی طرح بولا۔ ''میری استدعا ہے کہ جو اجو دینی اعتبار سے حرام ہے اسے چھوڑ دو۔ حالانکہ دانا کہتے ہیں دیدہ دوست عیب مبین بنود (یار کی یاری سے غرض عیبوں سے کیا واسطہ)

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مگر میں نمازی بننے سے رہا۔'' سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''نمازی۔'' وہ بھی قہقہہ لگا کر بولا۔ ''نماز سب سے آسان مگر سب سے مشکل عبادت ہے۔ فجر کی ادا کرو تو ظہر سر پر آ جائے۔ ظہر پڑھ لیا تو عصر پھر مغرب پھر عشاء ہے ناں مشکل؟ مگر سب سے اہم اس لیے کہ ظہر پڑھی تو عصر کی فکر لگ گئی۔ عصر پڑھی تو مغرب کی فکر عود کر آئی۔ نماز پڑھنے کے بعد نماز بچانے کی فکر۔ نماز کا ثواب بچانے کے لیے گناہوں سے اجتناب۔ گناہوں سے بچے تو قرب خدا ملا۔ قرب خدا ملا تو زندگی ہی نہیں عاقبت بھی سدھر گئی۔'' وہ تقریر کرنے پر اتر آیا تھا۔ ''انسان جب دن میں دس بار کہے کہ ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' تو کیا خدا کو رحم نہیں آئے گا۔ وہ مدد دینے پر آمادہ نہیں ہوگا؟''

''معاف کیجیے گا میں نے یہ بھی تو دیکھا ہے کہ تہجد گزار بھی آفات و بلیات کے گھیرے میں آتے رہتے ہیں۔''

''خدا خود کہتا ہے کہ اے بندے مجھ سے مانگ تیری حاجت میں پوری کروں گا۔ رہا سوال دعا قبول کیوں نہیں ہوتی تو دعا مانگنے والے کا اعمال بھی دیکھ لو۔ دس گھنٹے حکم خدا کے خلاف ورزی اور ایک بار خدا سے مناجات۔ پھر دعا کیسے قبول ہوگی۔؟''

''بات تو ٹھیک ہے، اچھا میں چلتا ہوں۔'' سلمان کھڑا ہوا تو وہ بولا۔

''تمہیں بلایا میں نے ہے۔ اس لیے جانے کی اجازت بھی میں ہی دوں گا۔''

''تو فرمائیں، مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟'' سلمان نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ شارپ مائنڈ نوجوان ہیں مگر آپ نے اپنی دماغی قوت کو منفی راہ پر لگا دیا ہے۔ اسے مثبت راہ پر لائیں۔ اس وقت وطن عزیز کو آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

''وطن پر کون سی آفت آن پڑی ہے؟ اچھا خاصا ترقی کرتا ہوا ملک ہے۔'' سلمان کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''غلط! اسے ترقی نہیں کہتے۔ ترقی تو وہ تھی جو ماضی میں ہمارے اجداد نے کی تھی۔ خواہ وہ بغداد ہو یا ہسپانیہ۔ ہم نے دنیا کو علم کی راہ دکھائی اور اب یہ نام نہاد غاصب شہنشاہ جس کے باپ نے عیاری سے اس ملک پر قبضہ کیا، وہ ہمارے وطن عزیز کو امریکی آقاؤں کے اشارے پر الف ننگا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے جن چیزوں کی ممانعت کی ہے، اسے ہی یہ رائج کر رہا ہے۔ اسلام نے پردے کا حکم دیا اور یہ حکم جاری کر رہا ہے کہ عورتیں بے پردہ رہیں، پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔''

سلمان بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا مگر بولا کچھ نہیں، وہی بولتا رہا۔ ''اسلام نے شراب کو نجس ترین شئے قرار دیا ہے اور یہ گلی گلی میں ''بار'' کھلوا رہا ہے۔ اسلام نے جوا کھیلنے سے منع کیا اور ''کسینو'' کھولنے کے لیے قرضے فراہم کر رہا ہے۔ اب بولو جو احکام خدا کی نفی کرے، کیا اسے حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہے؟''

اس کے بولنے کا انداز اتنا منفرد تھا کہ سلمان پلکیں تک جھپکانا بھول گیا تھا۔ اس کی کسی بھی بات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے سلمان خاموش رہا۔

''سلمان! یاد رکھو کہ ہم زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ خدا نے خود کہا ہے کہ ''ہم زمین پر اپنا خلیفہ بھیج رہے ہیں۔ اے فرشتو! اسے سجدہ کرو۔'' اس لیے خلیفۃ الارض ہونے کے سبب اس کے احکامات کی تعمیل ہم پر فرض ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارا ساتھ دو۔ نہی عن المنکر کو رائج کرو۔''

''مگر میں کیسے ساتھ دوں؟''

''تم کیا معذور ہو جو انکار کر رہے ہو؟ نہی عن المنکر کے لیے ہر مسلمان کو ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔ تمہارے جیسا تیز دماغ نوجوان اگر ہمیں مل جائے تو منزل پہ پہنچنے کی رفتار دوگنی ہو جائے گی۔''

''اگر مجھے اس لائق سمجھتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دینے پر راضی ہوں۔'' سلمان بولا۔

''انشاء اللہ! میں آپ کو تہران میں جناب شریعت مدار کے پاس بھیج دوں گا، وہ آپ کی پوری رہنمائی کریں گے۔ انہی کی زیر نگرانی آپ کو آگے بڑھنا ہے۔''

''آپ ان کے نام نامہ لکھ دیں۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے کاغذ قلم لیا اور خط لکھنے لگا۔

خط لکھ کر اس نے خط کو لفافے میں بند کیا پھر اس پر پتا لکھ کر اس نے سلمان کی طرف بڑھایا۔ سلمان نے الوداعی مصافحہ کیا اور گھر کی طرف چل پڑا تا کہ جلد سے جلد تیاری کر لے اور اپنی امی کو لانے کے لیے نئی سفر پر روانہ ہو جائے۔

گھر پہنچ کر بھی وہ خیالات کے گرداب سے ابھر نہ پایا۔ وہ اس گھر کو چھوڑنا چاہتا تھا اور یہ گھر اس پر مسلط ہوتا جا رہا تھا پھر شیریں کا وجود تھا۔ یہ نام وہ تھا جسے وہ اپنی زبان پر نہیں لاتا تھا لیکن اس کے کانوں میں یہ نام پائل کی جھنکار بن کر گونجتا رہتا تھا۔ وہ کچھ دیر کو بھی فارغ بیٹھتا تو اس کے لفظ، اس کے لہجے، اس کے تیور، اس کی باتیں، اس کے چاروں طرف گنگنانے لگتیں۔ اسے لگتا کہ شیریں نے اس کے چاروں اور چاہ کا احساس بو دیا ہے، تبھی تو وہ جب سامنے بیٹھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ہے۔ جب وہ چلتی ہے تو اس کے پاؤں دیکھنے لگتا ہے۔ ہنستی ہے تو اس کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے۔ گویا وہ شیریں کا ہر انگ، ہر روپ اپنی آنکھوں میں اتار لینا چاہتا ہو۔ وہ اسی کے سراپے کو آنکھوں میں بسائے گھر میں داخل ہوا تھا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جس کی عمر طویل ہوتی ہے، وہ یاد کرتے ہی آ دھمکتا ہے۔ وہ شیریں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شیریں کھانے کا طشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر سلمان کے دل میں جذبوں کی بجلی کڑکی، رگوں میں پسندیدگی کا طوفان مچلا، دماغ میں چاہت کی قوس قزاح جاگی اور اس کے اندر کا مرد انگڑائیاں لینے لگا۔ مگر وہ خاموش آہ بھر کر رہ گیا جو دل سے اٹھی اور دل میں ہی دم توڑ گئی۔ ایسی آہ رعب حسن ہی ممکن بناتی ہے۔

بعض لڑکیاں اس قدر حسین، اس قدر نفیس، اتنی باوقار اور کچھ ایسا رعب حسن لیے ہوتی ہیں کہ مرد ان کی تمنا تو کرتے ہیں لیکن چھوتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عورت چھونے ہی کے لیے بنائی گئی ہے پھر بھی وہ رعب حسن سے تھرا جاتے ہیں۔ نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پاتے۔ شیریں بھی حسن کا ایسا مجسمہ تھی کہ انگ انگ سے رعب حسن پھوٹتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلمان کی تمام چاہتیں جذبہ، اظہار سے خالی رہیں۔ اس نے فقط ایک جملہ کہا۔ ''تم آ گئیں، کھانا لائی ہو؟''

''اگر تمہیں پسند نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں لے جاتی ہوں۔'' شیریں نے اٹھلا کر کہا۔

حاسے جانے کی تمنا ہر جواں دل میں ہلکورے لیتی ہے۔ شیریں کے دل میں بھی

جذبے کی بیل پروان چڑھنے کی تمنائی تھی مگر اب تک حالات کی جکڑ بندھ نے موقع نہیں دیا تھا۔ اب جو خوشحالی آئی، پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگی تو جوان جذبے بھی امنڈنے لگے اور جب اس حقیقت کا ادراک ہوا، حقیقت نے قرار کا ثبوت پیش کیا کہ سلمان اس کا سگا بھائی نہیں ہے تو جوان دل کی پکار اسی کی جانب جھکنے لگی۔ یہی وہ وجہ تھی کہ وہ سب سے چھپ کر اپنے پیار کا اقرار کرنے لگی کیونکہ وہ سلمان کی آنکھوں میں بھی پیار کا اقرار دیکھ رہی تھی۔

''بھوک تو ہے نہیں مگر تم لائی ہو، اس لیے میں تمہیں نہ سہی مگر تمہارا لایا ہوا کھانا سہی، میں کھا لوں گا۔'' سلمان نے ہنستے ہوئے کہا اور طشت کو اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کہا۔ ''میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ امی کو لانے تا کہ جلد سے جلد تمہیں اپنا بنا سکوں۔''

جملہ ختم کر کے سلمان نے شیریں کی طرف دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے لاتعداد جگنو اس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھے ہوں پھر یک دم ہی وہ چمک ماند پڑ گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ناچتے ہوئے مور نے گویا اپنے پیر دیکھ لیے۔ شیریں کے لب کتاب کے اوراق کی طرح پھڑ پھڑائے۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟''

''کیوں؟ اس میں کیا قباحت ہے؟''

سلمان نے اس کے بگلے کے پروں جیسے گورے ہاتھ پر نظروں سے استر کاری کرتے ہوئے کہا حالانکہ وہ خود اچھی طرح جانتا تھا کہ اس پوری کہانی میں اڑچن کہاں ہے۔

شیریں جوانی کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی۔ مردوں کی نظروں کو پہچاننے لگی تھی۔ اسی تجربے نے سلمان کے جھوٹ کو پکڑا تھا۔ نظروں کے فرق ہی سے تو اس نے سلمان کو پہچانا تھا۔ اس وقت بھی جب سلمان کی نظروں کو اپنے ہاتھ پر پھسلتے، گوری کلائی پر پھیلے ریشم جیسے سنہرے روئیں میں سرسراتے پایا تو اس نے تپش سے محفوظ ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ کو تہہ چادر کر لیا۔

اس حرکت کو سلمان نے بھی محسوس کر لیا تھا اور مجوب ہو کر رہ گیا تھا۔ شیریں نے سر جھکا کر کہا۔ ''تم جیسے ہی یہ بات کہو گے، گھر والے محلے والے، سب تمہارے دشمن بن جائیں گے کہ ایک سگا بھائی بہن سے شادی کا پیغام دے رہا ہے۔''

''میں سوچتا ہوں، شاید کوئی راہ نکل آئے، تم جاؤ۔'' کہہ کر سلمان بھی باہر نکل گیا مگر سڑکوں کی رونق میں بھی اس کا دل نہیں لگا اور وہ آدھے گھنٹے میں ہی لوٹ آیا۔

سلمان کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ آندھی طوفان کی طرح شیریں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی تھی۔ اس نے آتے ہی جوش جذبات میں سلمان کے کندھے کو پکڑ لیا اور بولی۔ ''تم ..... تم کچھ نہیں کر سکتے ..... وہ ..... وہ کمینہ چال چل گیا۔''

''کون ..... کون چال چل گیا۔''

''محمود! اس نے پتا نہیں کہاں سے فتویٰ لا کر خانم کو دکھایا ہے اور خانم نے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔''

''کیا .....؟'' سلمان اچھل پڑا تھا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ اسے یوں ہی مان لیا جاتا۔ اس کا غصہ اوپر ہی اوپر چڑھتا رہا۔ اسے یہ بات بہت بری لگی تھی۔ اسے شیریں کی آنکھوں سے چھلکتے پیالے تڑپا گئے تھے۔ وہ جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، اسے دیکھ کر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خانم سے ضرور پوچھے گا کہ انہوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ پھر بھی بات کی گہرائی میں اترنے کے لیے اس نے پوچھا۔

''وہ فتویٰ کہاں کا ہے؟''

''نجف اشرف کا۔''

''فتویٰ میں کیا لکھا ہے؟''

''مجھے تو جعلی لگتا ہے مگر خانم ماننے پر تیار نہیں۔ فتویٰ میں لکھا ہے، ''اگر مرد کا کوئی نہیں اور اس کے بہکنے کا احتمال زیادہ ہے اور جس عورت کا نام لکھا گیا ہے، وہ عمر کے اس حصے میں ہے اور بہکنے کے مواقع بھی ہیں کیونکہ جیسا لکھا گیا ہے کہ والدین غربت کی وجہ سے شادی نہیں کرا پا رہے ہیں تو مشورہ طلب کنندہ کو فوراً اس سے شادی کر لینا چاہیے۔'' اب پتا نہیں محمود نے کیا کیا لکھا جس کی وجہ سے علماء مغالطے میں آ گئے اور انہوں نے یہ بات لکھ دی اور بجائے تحقیق کے، خانم اس مشورے کو فتویٰ مان کر راضی ہو گئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں ان سے خود بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے اب ایک ہی حدف تھا کہ کسی طرح بھی وہ اس شادی کو رکوا دے۔ اگر اس سلسلے میں اسے اپنا راز کھولنا بھی پڑے تو وہ کھول دے۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اس شخص کا انہوں نے رشتہ قبول کر لیا جس نے اس گھر کی تباہی میں مرکزی کردار ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

وہ باہر جانے کے لیے کھڑا ہوا تھا مگر پھر فوراً بیٹھ گیا پھر اس نے جاتی ہوئی شیریں سے کہا۔ ''خانم سے کہو کہ میں نے بلایا ہے۔''

شیریں کے جانے کے دو منٹ بعد خانم داخل ہوئیں۔ ''جان مادر! تم نے بلایا۔''

''ہاں!'' کہہ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ پھر خانم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا واقعی شیریں کی شادی محمود سے طے کر دی ہے۔''

''ہاں! کیونکہ وہ فتویٰ لے کر آیا تھا۔ فتویٰ سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔''

''وہ فتویٰ جعلی بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''یہ دینی معاملہ ہے، اس میں دخل نہ ہی دو تو بہتر ہے۔ علماء پر شک کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ نجف اشرف سے فتویٰ آیا ہے۔ اس فتوے پر شک کرنا عاقبت خراب کرنا ہے۔''

''پھر بھی رشتہ دینے سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لیتیں۔'' سلمان نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''یہ میرا نہیں، تیرے باپ کا فیصلہ ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا۔'' خانم نے کڑے تیور سے جواب دیا۔ شاید اسے شوہر کے فیصلے کو غلط کہنا پسند نہیں آیا تھا۔ بیوی ہر حال میں بیوی ہوتی ہے۔ شوہر لاکھ برا سہی مگر وہ اسے برا نہیں سمجھتی۔ اسی کی بات کو افضل سمجھتی ہے اسی لیے تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ابھی اسے گئے ہوئے بمشکل دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ حسین صاحب نے آواز دے کر آنگن میں بلایا۔ ان کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔ وہ تمتماتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ ''تم نے چند پیسے کیا کما لیے خود کو اس گھر کا مالک سمجھنے لگے۔ تمہاری اوقات کیا ہے؟ تم نے مجھے معذور سمجھ لیا ہے۔ ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں بہت دم ہے۔''

حسین صاحب غصے میں تنتنا رہے تھے۔ زور زور سے بولنے کی وجہ سے ہونٹوں کے کناروں پر جھاگ آ گیا تھا۔ ''میں نے اس گھر کی مدد اپنی مرضی سے کی ہے، کسی پر احسان نہیں کیا مگر آپ کا فرض تھا کہ آپ مجھ سے مشورہ کر لیتے۔'' سلمان نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ میں تیرا غلام ہوں جو تجھ سے پوچھوں، یہ گھر میرا ہے، شیریں میری بیٹی ہے اس لیے میں جو چاہوں، کروں گا۔''

''اس گھر پر میرا بھی حق ہے۔''

''کس نے کہہ دیا؟ جب تک میں زندہ ہوں، تیرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں جب چاہوں، تجھے عاق کر کے سب چیزوں سے محروم کر دوں۔''

''ٹھیک ہے، میں واپس تہران جا رہا ہوں۔'' سلمان نے آخری حربہ آزمایا۔ اس نے سوچا کہ ابھی انہیں رقم کی ضرورت ہے اس لیے ان کا مزاج ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ مگر وہ تو اور بھڑک اٹھے۔ چیخ کر بولے۔

''تجھے روکا کس نے ہے؟ کل کا گیا آج ہی چلا مگر فتویٰ کے خلاف نہیں کروں گا۔ مجھے مرنا ہے۔ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔''

''ارے ابا! وہ فتویٰ جعلی ہے۔ آپ قم جا کر دکھائیں، وہاں کے علماء تصدیق کر دیں گے۔''

''ارے، جعلی ہے تو کیا ہوا؟ مولوی صاحب کا نام تو ہے نا۔ وہی کافی ہے بس۔''

''اللہ رسول ﷺ کے نام پر کوئی کچھ بھی کہہ دے تو آپ مان لیں گے؟''

''ہاں، ہاں! اللہ رسول ﷺ کے نام پر کوئی جھوٹ بھی بولے تو یقین کر لوں گا۔ اللہ خوش ہوگا۔ عذاب تو اسے دے گا، مجھے نہیں۔''

سلمان سمجھ گیا کہ ایسے جاہل سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا کمرے میں لوٹ آیا۔ شیریں وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے کہا۔ ''اس کا ایک حل موجود ہے۔''

''کیا؟''

''ہم دونوں یہ گھر چھوڑ دیں اور تہران چل کر نئی زندگی شروع کریں۔''

سلمان سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اگر تم یہی چاہتی ہو تو میں تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہوں۔''

''تو پھر دیر نہ کرو، فوراً تیاری کر لو۔'' شیریں بولی۔

''تیاری مجھے نہیں، تمہیں کرنی ہے۔ میں اسی ایک کپڑے میں صحیح ہوں۔'' سلمان نے اپنے لباس پر نظر ڈال کر کہا۔ اس وقت وہ کچھ جذباتی نظر آ رہا تھا۔ اس نے جیب سے رقم نکال کر دیکھی چھوٹے بڑے بہت سارے نوٹ تھے۔ تقریباً پانچ ہزار تومان تھے۔ یہ معمولی رقم نہ تھی۔ وہ با آسانی تہران پہنچ سکتے تھے۔ پھر اس نے اپنی انگشت انگشتری پر نظر ڈالی۔ فاکیہ کی دی ہوئی انگوٹھی اب تک انگلی میں تھی۔ فاکیہ نے بتایا تھا کہ جب بھی رقم کی ضرورت پڑے، تمہاری

ضرورت یہ انگوٹھی پوری کر دے گی۔ گویا وہ تہران کے بڑے سے بڑے ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا۔ اس نے شیریں سے کہا۔ ''تو پھر گھر سے نکل کر سیدھے بس اسٹاپ پر پہنچو، میں بھی آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں سڑک پر پہنچ رہی ہوں، تم بھی وہیں آ جاؤ۔''

''اچھی بات ہے۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب یہ گھر اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ اس گھر کو سنبھالنے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا مگر سب کچھ مٹی میں مل گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ خانم آنگن میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ بھاری قدموں سے باہر کی طرف چل دیا۔

گھر سے نکل کر وہ سڑک کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ گلی سے نکل کر جب وہ سڑک پر پہنچا تو ایک بند دکان کے سامنے شیریں کھڑی نظر آئی۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ نزدیک پہنچ کر بولا۔ ''بس کا انتظار فضول ہے۔ ٹیکسی سے گرگان چلتے ہیں پھر وہاں سے ٹرین کے ذریعے تہران۔''

''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو! کہیں محلے کے کسی فرد نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔'' شیریں نے لرزتی آواز میں کہا۔ وہ حد سے زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خوف ہلکورے لے رہا تھا۔ بار بار وہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ ادھر ادھر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ سلمان نے سامنے سے آتی ایک ٹیکسی کو روکا اور گرگان تک چلنے کی بات کی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے نہایت شائستگی سے معذرت کی اور کہا کہ آپ یہیں کھڑے رہیں میں اسٹینڈ سے وہاں جانے پر رضامند ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔

وہ دونوں پھر سے دکان کے سائے میں آ گئے۔ شیریں بالکل خاموش تھی لیکن لب ہل رہے تھے۔ شاید وہ کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ عام حالات میں کتنے لوگ اللہ کی صدق دل سے یاد کرتے ہیں؟ ہاں، اگر کوئی پریشانی آ جائے تو ضرور اسے پکاریں گے۔ خواہ وہ پریشانی خود ان کی ہی پیدا کردہ کیوں نہ ہو۔ اس وقت یہ بھی نہیں سوچتے کہ کہیں یہ کام خدا کو ناپسندیدہ تو نہیں؟

سلمان ابھی خیالوں کی دنیا سے باہر بھی نہیں آیا تھا کہ ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ ''آپ نے گرگان کے لیے ٹیکسی طلب کی ہے؟''

''جی ہاں!'' یہ کہہ کر سلمان نے ہینڈ پر ہاتھ رکھ دیا۔

سلمان نے دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے شیریں کو اشارہ کیا۔ شیریں تیز تیز

قدموں سے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی تیزی نے ڈرائیور کو ہوشیار کر دیا۔ وہ گہری نظروں سے چادر میں لپٹی شیریں کا جائزہ لینے لگا۔

''اے! منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ گاڑی چلاؤ۔'' سلمان کو اس کا یوں دیکھنا برا لگا تھا۔ ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ اس نے اندر بیٹھ کر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دور جانے کے بعد بولا۔ ''لڑکے پریشان نہ ہو، میں ہر خطرے سے بچانے میں طاق ہوں۔''

''خطرہ! خطرہ کیسا؟'' سلمان بولا۔

''سنولڑکے! میں نے اس سڑک پر زندگی گزار دی ہے، بند لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتا ہوں۔ تم اس لڑکی کو بھگا کر لے جا رہے ہو۔'' ڈرائیور نے بیک ویو مرر میں دیکھ کر کہا اور پھر ایک بٹن دبا دیا۔ اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان ایک شیشہ آ گیا۔ سلمان کی چھٹی حس نے اشارہ کر دیا کہ کچھ غلط ہوا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''ٹیکسی روکو!''

''اب یہ منزل پر پہنچ کر ہی رکے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے رفتار بڑھا دی۔ سلمان نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ لاک ملا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی بہت بڑی مصیبت میں وہ پھنس چکا ہے۔ وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے سے نبرد آزما رہا مگر کوئی راہ نہ دکھائی دی۔ کسی طرح بھی دروازہ کھل کر نہ دیا۔ اس نے باہر نظر ڈالی۔ اس کے لیے یہ علاقہ نیا تھا، اجنبی تھا۔ وہ ادھر پہلی بار آیا تھا۔ شیریں کے لیے بھی یہ علاقہ اجنبی تھا اس لیے وہ دونوں سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ٹیکسی کا رخ کدھر ہے؟ تبھی ٹیکسی والے نے سڑک چھوڑ دی اور کچے راستے پر اتر آیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ٹیکسی رکی۔ سلمان نے کھڑکی سے دیکھا وہ ایک جھونپڑا نما مکان تھا۔ آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ اس مکان سے دو بندوق بردار باہر نکلے جیسے انہیں پتا ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ پھر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص باہر آیا۔ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کہا۔ ''مجھے اکبر کہتے ہیں اور بردہ فروشی میرا پیشہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ اگر زیادہ اکڑ دیکھانے کی کوشش کی تو مار کر یہیں دفن کر دیئے جاؤ گے۔''

شیریں نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ عورت کی پکڑ سہارا بھی دیتی ہے اور کمزور بھی بنا دیتی ہے۔ اس وقت وہ اس لمس کی وجہ سے۔ اس کی حفاظت کے خیال سے خود کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔

وہ دونوں بندوق برداروں کے پہرے میں آگے بڑھنے لگے۔ بندوق برداروں نے

جھونپڑے سے ایک پابند سلاسل لڑکی کو بھی ساتھ لیا تھا۔ وہ سب ایک بڑی سی وین میں ٹھنس کر بیٹھ گئے تھے۔ مسلسل بغیر رکے نصف گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد یہ لوگ ایک گنجان آبادی والے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ بڑا پر رونق علاقہ معلوم ہوتا تھا۔ سلمان کو حیرت تھی کہ اگر یہ بردہ فروش تھے تو ان کا آبادی سے کیا تعلق؟ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ ان کا ٹھکانہ آبادی سے بھی کوسوں دور ویرانوں میں ہوگا۔

پھر جب انہیں ایک بلند و بالا اور وسیع و عریض قلعہ نما عمارت کے دیو ہیکل گیٹ کے قریب لایا گیا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

دیو ہیکل چوبی گیٹ پر چار مسلح دربان موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر دربان نے فوراً گیٹ کھلوا دیئے۔

وین اندر داخل ہوگئی۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا۔

یہاں روشنی کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ زیادہ تر مشعلیں روشن تھیں اور کیروسین آئل کے ہنڈولے روشن تھے۔ قلعے کی اندرونی عمارت بہت خوبصورت اور قدیم طرز تعمیر کا اچھوتا نمونہ تھا۔ اس کا وسطی دروازہ بھی بلند و بالا تھا اور محرابی تھا۔ شیشم کی بیش قیمت لکڑی کے اس بھاری بھرکم دروازے کے دونوں پٹ بند تھے۔ یہ لوگ وین سے اتر کر ایک قطار میں باادب کھڑے ہو گئے تھے۔ سلمان کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ اس کے سر کو جھکانے کے لیے اکبر نے اس کے سر کے پیچھے اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔ سلمان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اکبر نے اس حسین و جمیل اور زرق برق لباس والی دوشیزہ جسے وہ اپنے ساتھ لے کر باہر آیا تھا اس کے گلے میں آہنی کڑے کے ساتھ زنجیر منسلک کر کے اس کا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس بے چاری کو نہایت بے دردی کے ساتھ گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھیوں کی قطار سے چند قدم آگے اس محرابی دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جب کہ سلمان اور شیریں اس کے عقب میں اس کے ساتھیوں کے ساتھ کھڑے رہ گئے.....

قلعے کے وسطی دروازے کے آس پاس بھی مسلح محافظ نظر آئے۔ وہ سب باوردی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خم دار تلواریں اور کارتوسوں والی بندوقیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر بھی ان بردہ فروشوں کی طرح بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ایک دربان اکبر کی طرف بڑھا۔ اکبر نے اس سے کہا۔

''آغا سے کہو جا کر، تمہارا مال حاضر ہے، ہمیں دام دے دو۔''

اس کی بات پر تلوار بہ دست دربان نے غور سے پہلے اس دوشیزہ کی طرف دیکھا پھر سردار سے بولا۔ ''اس کی زنجیر کھول دو۔ آغا کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ میں اسے لے جا کر ان کے سامنے پیش کر دیتا ہوں اور دام بھی لے آتا ہوں۔''

اکبر نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دوشیزہ کے گلے سے آہنی کڑا کھول دیا۔ دربان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوشیزہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تو بدرجہء اتم موجود تھے لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ آزاد ہوتے ہی اس نے شعلہ بار لہجے میں دربان سے کہا۔ ''تمہارے آغا نے مسعود کی بہو کو اغواء کر کے بہت بڑی اور سنگین غلطی کی ہے مگر سن لو کان کھول کر کہ میرا نام بھی بانو صریر ہے اور مت بھولو کہ میں ایک غیرت مند بھائی رستم کی لاڈلی بہن بھی ہوں۔ جس کا ڈنکا بجتا ہے۔ وہ اس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔''

اس کے لہجے کی گھن گرج میں جانے کیسا رعب تھا کہ اکبر کے چہرے پر اس لمبے چوڑے تعارف نے ایسی دھاک بٹھائی کہ وہ خائف سا نظر آنے لگا، تاہم وہ چپ رہا البتہ دربان نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہم جانتے ہیں، ہمارے آغا بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ غلطی تمہارے بھائی رستم کی تھی۔ اس نے آغا سے وعدہ خلافی کیوں کی تھی؟ چلو اندر.....'' یہ کہہ کر اس نے دو مزید دربانوں کو بھی اشارے سے بلا لیا پھر وہ تینوں بانو کو اندر لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہی دربان دوبارہ نمودار ہوا۔ اسکے ہمراہ دو دربانوں کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بچھیاں تھمی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بچھیاں انہوں نے اکبر کی طرف اچھال دیں۔ اس کے بعد یہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اکبر نے دوبارہ سب کو وین میں بیٹھنے کو کہا۔

کافی طویل مسافت کے بعد سنگلاخ اور بنجر پہاڑی دامن میں پہنچے تو یہاں مشعلوں اور کیروسین آئل کی روشنی میں ایک نئی دنیا آباد نظر آئی جسے دیکھ کر سلمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

پہاڑیوں میں گپھائیں بنائی گئی تھیں۔ سرکنڈوں کے جھونپڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک بلند و بالا پہاڑی میں سنگی ہال نما کمرا بنایا گیا تھا جس کے آگے لوہے کی سلاخیں ایستادہ تھیں۔ ایسے ہی سلاخ دار سنگلاخ قید خانے دو اور بھی تھی۔ یہ دو قید خانے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے مگر اندر سے چنائی دیوار نے انہیں دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

ایک میں مرد قیدی نظر آ رہے تھے جب کہ دوسرے میں جوان عورتوں اور لڑکیوں کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ سلمان کو مردوں والے قید خانے بہ الفاظ دیگر جیل خانے میں ڈال دیا جب کہ شیریں کو عورتوں والے قید خانے کے اندر دھکیل دیا گیا۔

اس قید خانے میں سخت بدبو اور سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ کئی قیدی ننگ دھڑنگ تھے۔ فرش پر گھاس پھونس بکھری ہوئی تھی۔ اس مکدر اور تنگ و تاریک سے ناگوار ماحول میں سلمان کا دماغ پھٹنے لگا۔ یہاں بارہ تیرہ کے قریب اور بھی قیدی تھی۔ کچھ ادھر ادھر نڈھال سے پڑے ہوئے تھے۔ چند اسے دیکھ کر آنکھیں پھاڑے تکنے لگے۔

نہ جانے بے چاری شیریں کا دوسرے قید خانے میں کیا حال ہو رہا ہوگا؟ سلمان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا؟

یہاں بردہ فروشوں کی بڑی کثیر تعداد تھی۔ قیدیوں سے باتوں کے دوران بڑے لرزہ خیز انکشاف ہوئے۔ بہ قول ان کے، بردہ فروشوں کے سردار کا نام اکبر تھا۔ اس کا کام مہنگے داموں غلام سپلائی کرنا تھا۔ ذرا ذرا سی حکم عدولی پر اکبر جسے قیدیوں نے ظالم کا نام دے رکھا تھا بڑی اذیت ناک سزائیں دیتا تھا۔

''کیا فروخت ہونے کے بعد کسی غلام نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی؟''

''کی تو تھی۔'' ایک قیدی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر بھاگ کر کہاں تک جا سکتا تھا؟ اسے فوراً دھر لیا گیا اور ظالم کے حوالے کر دیا گیا۔ ظالم نے اسے تین دنوں تک مسلسل انسانیت سوز تشدد میں رکھا اور پھر دوبارہ اسے انہی لوگوں کے حوالے کر دیا تھا جنہیں اس نے فروخت کیا تھا پھر کسی میں فرار ہونے کی جرأت نہ ہو پائی۔'' اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ اکثر ان لوگوں سے سخت چٹانوں کے توڑنے کا بھی مشقت طلب کام لیا جاتا ہے۔

''اور عورتوں لڑکیوں کا یہ کیا کرتے ہیں؟'' سلمان نے لرزتے دل سے پوچھا۔

''ان بے چاریوں کا تو ہم سے زیادہ برا حشر ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی پر اس بدنصیب عورت کو برہنہ کر دیا جاتا ہے اور پھر انہیں عیش پرستوں کی باندیاں بنا دیا جاتا ہے۔'' سلمان یہ سن کر سرتاپا لرز اٹھا۔

''کیا قانون کے رکھوالوں کو یہ سب نہیں معلوم؟''

''قانون.....؟'' ایک دوسرا قیدی استہزائیہ لہجے سے بولا۔ ''یہاں صرف طاقت کا

قانون چلتا ہے اور رہا قانون کے رکھوالوں کا سوال تو یہ ظالم بھی اسی کی پیداوار ہے۔''

سلمان اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے اب شیریں کی فکر ستانے لگی تھی اور دل میں دعا مانگنے لگا تھا کہ کہیں خوف زدہ اور بدحواس ہو کر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

رات گزری، صبح ہوئی پانچ قیدی قید خانے سے زنجیریں ڈال کر نکالے گئے ان کی شاید قیمت لگ چکی تھی۔ اس طرح عورتوں کے قید خانے سے بھی سات عدد عورتوں کو باہر نکالا گیا۔ کسی کو رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی اجازت نہ تھی لیکن اچانک سلمان کو عورتوں والے قید خانے سے کسی کی نسوانی چیخیں بلند ہوتی سنائی دیں۔ وہ ٹھٹک گیا۔ قیدیوں کو آنے والوں کے سپرد کرنے کے بعد اس چیختی چلاتی عورت کو باہر نکالا گیا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی اور ہاتھ جوڑ کر سردار سے داد و فریاد کر رہی تھی کیونکہ اس کے جسم پر ایک تار تک نہ تھا۔ سلمان اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

''اور چیخو، اور چلاؤ.....شور مچاؤ.....'' اسے بالوں سے پکڑ کر دائیں بائیں گھسیٹتا ہوا وہ خونخواری سے بولا پھر اس کے چہرے پر زور سے تھپڑ جڑ دیا۔ عورت کے حلق سے اذیت ناک چیخ نکل گئی اور وہ ایک دوسرے موٹے بردہ فروش کے ساتھ جا ٹکرائی۔ باقی سب نیم دائرے کی صورت میں کھڑے بردہ فروش شیطانی قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی گرسنہ نظریں عورت کے بدن پر چپکی ہوئی تھیں، پھر جو کچھ ہر ایک کی نظروں کے سامنے ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ اس کی بعد عورت کو جانے کی اجازت ملی اور وہ اسی حالت میں، برہنگی سے بے پرواہ، دوبارہ قید خانے کی طرف دوڑ گئی۔

سلمان کی رگوں میں خون کی جگہ جیسے لاوا دوڑنے لگا۔ کنپٹیاں غیظ و غضب کے مارے پھٹنے لگیں مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ تو خود پابہ زنجیر تھا۔ سوائے سنگی دیواروں سے سر ٹکرانے کے، اور کیا کر سکتا تھا؟

انسانیت کی یہاں جس طرح تذلیل کی جا رہی تھی، اس کی مثال اس نے اور کہیں نہ دیکھی تھی۔ اسے سب سے زیادہ طیش ان عیش پرستوں پر آ رہا تھا جن کی یہ لوگ پیداوار تھے۔ وہ خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ اسے توفیق اور طاقت دے کہ وہ اس خونی اور ذلیل انسانوں کے گروہ کا خاتمہ کر سکے یا پھر فاکیہ کو بھیج دے۔ کھانے کے نام پر انہیں سوکھی روٹیاں اور پتلی دال دی

گئی۔ ان میں اُبلے ہوئے چاول بھی شامل تھے۔ اس طرح انہیں ان کی قید میں رہتے ہوئے تین دن بیت گئے۔

یہ لوگ ان سے بڑی کڑی مشقت بھی لیتے تھے۔ پیروں میں زنجیریں ڈال کر چٹانی پتھر بھی تڑوائے جاتے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں کی حالت زیادہ دگرگوں تھی۔ انہیں جان بوجھ کر مختصر اور پھٹے ہوئے کرتے پہننے کو دیئے جاتے اور ان سے بھی یہ مشقت طلب کام لیا جاتا۔ نگرانی کے لیے بردہ فروشوں کی پوری ٹیم ہوتی تھی جو ہاتھوں میں ہنٹر تھامے سروں پر مسلط رہتے تھے۔ ذرا بھی کوئی مرد یا عورت سستی کا مظاہرہ کرتا تو ان پر ہنٹروں کی بوچھاڑ کر دی جاتی۔ ایک موقع پر پتھر کوٹنے کے دوران سلمان نے شیریں کو تسلی دیتے ہوئے یہ ہدایت بھی کہ صبر و برداشت کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کرے اور کوئی ایسی غلطی ہرگز نہ کرے جس سے ان کی بے عزتی ہو۔

اچانک سلمان پر ایک بردہ فروش کی نگاہ پڑ گئی۔ اسے شیریں سے باتیں کرتے دیکھ کر اس نے سلمان پر تابڑ توڑ ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔ وہ تکلیف کے مارے چلانے لگا۔ شیریں نے یہ منظر دیکھا تو بے اختیار چیختی ہوئی اس پر آن گری۔ اس ظالم بردہ فرش نے اس پر بھی ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔

سلمان نے شیریں کو خود سے ہٹا دیا اور اس بردہ فروش پر جھپٹ پڑا۔ اگرچہ اس کے ایک پیر میں آہنی کڑا پڑا ہوا تھا جس سے منسلکہ زنجیر دوسرے قیدی کے پاؤں میں لگے کڑے سے جڑی ہوئی تھی مگر اس کے ہاتھ اور دوسرا پاؤں آزاد تھا۔

بردہ فروش تنومند تھا، ڈیل ڈول میں بھی کم نہ تھا۔ سلمان نے اس کے ہنٹر کو پکڑ لیا اور ایک گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ ہنٹر کے دستے سے اس کی گرفت چھوٹ گئی تھی۔ وہ سلمان نے اپنے قبضے میں کرتے ہی بے تحاشا اس پر برسانے شروع کر دیئے۔ اسی اثناء میں دوسرے بردہ فروش غراتے ہوئے اس پر پل پڑے۔ اس کا پاؤں زنجیر سے بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ ان کا زیادہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

شیریں اس کی حالت پر پچھاڑیں مار مار کر رونے لگی تو اس پر بھی ہنٹر برسائے جانے لگے۔ سلمان پر ہنٹروں کی بارش کے ساتھ لاتوں، مکوں اور ٹھوکروں کا بھی استعمال ہوا، اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا گیا۔ وہ بے حال سا ہو کر پتھریلی زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے وجود میں اتنی اذیتیں آزما ڈالی گئیں کہ وہ ہوش و حواس سے بالکل ہی بیگانہ ہو کر رہ گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو تنہا زمین پر پڑے پایا یعنی وہ قید خانے میں نہیں تھا، یہ کھلی جگہ تھی۔ اکبر اس کے سر پر ملک الموت بنا کھڑا تھا۔ اس کی لال انگارہ برساتی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ باقی چند ساتھی بھی قریب میں کھڑے خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ سلمان کا چہرہ اور جسم پانی سے شرابور تھا، شاید اسے ہوش میں لانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

''تم نے ہمت کیسے کی میرے آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی؟'' اکبر اسے ہوش میں آتا دیکھ کر خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔

''میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تمہارے ساتھی نے مجھے جان بوجھ کر ہنٹر مارنا شروع کر دیئے تھے۔ مجھے اس کی بے خطا مار کھانے پر طیش آ گیا تھا'' سلمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

اس وقت وہ بردفروش بھی وہیں موجود تھا۔ سردار نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سردار کی استفساریہ نظروں کا مطلب بھانپ کر بولا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے سردار! یہ اس اپنی ساتھی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔''

''ہاں.....! یہ سچ ہے۔'' سلمان نے پینترا بدلا۔ ''وہ بیمار ہے، میں اس کی دوادارو کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

سلمان نے دانستہ ڈاکٹر کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق سردار کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور وہ اس سے استفساریہ بولا ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

''ہاں.....!''

''یہ تو اور اچھی بات ہوگئی۔ ہم تمہیں پھر اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ تمہیں فروخت نہیں کریں گے۔ ہمیں ڈاکٹر کی اشد ضرورت پڑتی رہتی ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

سلمان کے بتانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ علاج معالجے کی بہانے ان کے قریب رہے ورنہ اگر یہ اسے کسی کے پاس فروخت کر دیتے تو وہاں نہ جانے کیا حالات ہوتے؟ مگر درحقیقت اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ کہیں فروخت ہونے سے محفوظ رہنا چاہتا تھا لہٰذا اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ ترکیب آئی تھی۔ وہ اتنا وقت گزارنا چاہتا تھا کہ رمضان گزر جائیں اور فاکیہ لوٹ آئے۔ وہ مزید بولا۔

''ہاں! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کسی اور کا غلام بننے کے بجائے تمہارا غلام بنا رہوں۔

کیونکہ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' سلمان نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ سے کام لیا۔ ''مگر میں اپنی ساتھی کے بغیر ادھورا ہوں۔ وہ میری اسسٹنٹ نرس ہے۔''

''اچھا! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہمیں اپنی تیمارداری کے لیے بھی عورتیں درکار ہیں۔ تم اب سب سے پہلے ہمارا علاج کرو گے۔'' وہ بولا۔

''مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی ہوگی۔'' سلمان نے لہجے کو فدویانہ بناتے ہوئے مکاری سے کہا۔

''میری بیوی روشنا کافی روز سے بیمار ہے۔ خود میرے سر میں اکثر بڑا شدید درد ہو رہتا ہے، ہم شہر نہیں جا سکتے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' سلمان نے کہا۔ ''میں تم کو امراض میں استعمال ہونے والی دواؤں اور انجکشنوں کی فہرست بنائے دیتا ہوں۔ تم وہ تو شہر سے منگوا کر یہاں رکھ سکتے ہو ناں؟''

اس نے فوراً سر ہلا دیا۔

اس کے بعد سلمان کو الگ سنگی کمرے میں ڈال دیا گیا۔ یہ تھا تو چھوٹا مگر بہرحال صاف حالت میں تھا۔ شیریں کو بھی اس کے ساتھ ہی کر دیا گیا۔

لیکن اگلے دن اس کے جھونپڑے میں تین بردہ فروش داخل ہوئے۔ وہ یہی سمجھا کہ ان کا کوئی ساتھی بیمار ہوگا اور وہ اسے اور شیریں کو لینے آئے تھے۔

''اے لڑکی.....!'' چلو ہمارے ساتھ ایک بردہ فروش نے شیریں کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ خود سلمان بھی پریشان ہو گیا۔

''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' سلمان نے ذرا ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''قیدی عورتوں کے پاس۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں.....؟'' سلمان نے پوچھا تو وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا

''وہ عورتیں اسے دلہن بنائیں گی۔ ہمارا سردار آج رات اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اس کی بات پر سلمان کے اوسان خطا ہو گئے جب شیریں ایک خوفزدہ سی چیخ مار کر اس سے چمٹ گئی۔

''نن.....نہیں.....نہیں! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''تمہیں چلنا ہوگا ہمارے ساتھ.....'' وہ درشت لہجے میں بولا اور ساتھ ہی اپنے

دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے لپک کر شیریں کو دبوچ لیا۔ سلمان نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو اس پر بیک وقت گنیں تان لی گئیں۔

''تمہیں جو کہنا ہے، سردار سے جا کر کہو۔'' یہ کہہ کر وہ چیختی چلاتی شیریں کو بے دردی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے جھونپڑے سے باہر لے گئے۔ شیریں سلمان کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔

سلمان غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا سیدھا سردار کے جھونپڑے میں جا پہنچا۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست پڑا ہوا تھا۔ سلمان کو غصے کی حالت میں اپنے سردار کے جھونپڑے میں داخل ہوتے دیکھ کر آٹھ دس مسلح بردہ فروش بھی اندر چلے آئے۔ سلمان نے سردار سے کہا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم میری ساتھی لڑکی سے زبردستی شادی رچانا چاہتے ہو؟''

''ہاں! تم نے ٹھیک سنا ہے۔'' وہ نشے کی پنک میں بولا۔

''کیوں.....؟ ہم سے تمہیں کیا شکایت ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''ہماری مرضی.....!'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''ہمیں تمہاری ساتھی لڑکی بہت بھا گئی ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ یہ بھی دوسری لڑکی کی طرح فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔ ہم اسے اپنی مستقل خدمت گزاری میں رکھنا چاہتے ہیں۔'' اس کی بات پر سلمان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے بپھرے ہوئے تیور بھانپ کر اس کے مسلح حواریوں نے اس پر اپنی گنیں سیدھی کر لیں۔

''ڈاکٹر! اپنی حیثیت پہچانو، یہ مت بھولو کہ ہم نے تمہارے پاؤں سے زنجیر کھول دی ہے تو تم آزاد ہو۔ تمہاری حیثیت اب بھی یہاں ایک قیدی کی سی ہی ہے..... لیکن اگر تم نے ہمارے حکم کے آڑے آنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو تمہاری حالت قیدیوں سے بھی بدتر کر دی جائے گی۔ جاؤ اب.....''

ناچار وہ اپنے جھونپڑے میں واپس آ کر اپنا سر پکڑے بیٹھ گیا۔ وہ شیریں کی طرف سے بری طرح پریشان ہو رہا تھا اور چشم تصور میں شیریں کی قابل رحم حالت کا تصور کرنے لگا کہ اس بے چاری کی کیا حالت ہو رہی ہو گی؟ اسے سردار پر بھی بری طرح طیش آ رہا تھا کہ اس نے محض اپنی گندی نفسانی خواہش میں اندھے ہو کر شیریں جیسی معصوم اور نرم و نازک لڑکی کو بیوی بنانے کی سازش رچی تھی۔ اس سانحے کے بعد شیریں بے چاری تو جیتے جی مر جائے گی۔ شیریں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں، ان عوامل پر غور کر رہا تھا مگر مغز ماری کرنے کے باوجود اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایک یہی خیال آتا تھا کہ سردار کو کسی طرح ہلاک کر دے مگر کیسے؟ پھر وہ کہاں جائے گا؟ جان تو پھر بھی اس کی اور شیریں کی خطرے میں رہے گی۔ اس کے خونخوار کارندے ان کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔

سوچ سوچ کر دماغ پاگل ہو رہا تھا، کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے؟ اس طرح ہوتے ہوتے رات ہو گئی۔ وہ جھونپڑے سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ عورتوں نے شیریں کو دلہن بنا لیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے کارندوں نے بندوقوں کی نالوں سے ٹھوکے دے کر واپس جھونپڑے کے اندر محبوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی بے بسی پر کڑھ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ رات سر پر تھی۔

باہر سردار کی شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ اندر جھونپڑے کے دروازے کی جھری سے باہر یہ سب دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ اور تب اس نے مارو اور مر جاؤ کے مقولے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے جھونپڑے کے اندر سے باہر کا جائزہ لیا تو اسے صرف دو کارندے جھونپڑے کے باہر کھڑے دکھائی دیئے۔ وہ واپس پلٹا اور زور زور سے چلانے لگا۔ ایک کارندہ اندر داخل ہوا۔ سلمان نے اس کی گن جھپٹ کر اس کے سینے پر لات جڑ دی وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ باہر جشن کا ہلا گلا مچا ہوا تھا۔ اس نے بندوق جھپٹتے ہی اس کارندے کی طرف رخ کر کے لبلبی دبا دی۔ بندوق نے کارتوس اگلا اور دوسرے ہی لمحے وہ کارندہ خون میں تڑپنے لگا۔ اسی وقت دوسرا کارندہ اندر داخل ہوا۔ اس نے دوسرا کارتوس اس پر فائر کر دیا۔ کارتوس کے چھروں نے اس کا سر اڑا دیا۔ اس نے آن واحد میں دونوں خون آلود لاشوں سے کارتوسوں کی بیلٹس نکالیں اور اپنے سینے پر باندھ لیں پھر دو کارتوس لوڈ کیے۔ دفعتاً باہر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ہی چیخ و پکار مچ گئی۔ سلمان پہلے تو یہی سمجھا کہ فائرنگ کی گئی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس نے باہر جھانکا اور دنگ رہ گیا باہر پچیس تیس گھڑ سوار ہاتھوں پر رائفلیں اٹھائے سردار کے ساتھ برسر پیکار تھے اور انہیں گولیوں سے بھون رہے تھے۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور ایک چٹانی آڑ لے کر بہ غور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کوئی دوسرا گروہ لگتا تھا جو ان بردہ فروشوں پر پل پڑا تھا۔

یہ ایک سنہری موقع تھا۔ ان کے رنگ میں بھنگ پڑ چکا تھا۔ قیدیوں کی جیسے مراد بر آئی

تھی۔ وہ سب چٹانی دروں کے پیچھے چھپنے کے لیے دوڑے۔ ایسے میں سلمان شیریں کو تلاش کرتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ میدان جنگ کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ شیریں کی تلاش کے دوران اس نے یہ احتیاط بھی رکھی تھی کہ کہیں وہ نو وارد حملہ آور گروہ کی گولی کا نشانہ نہ بن جائے اس لیے وہ کوئی جوابی فائرنگ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اس نے بھی بدلہ لینے کی ٹھانی اور اکبر کے کارندوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گھڑ سوار حملہ آور اسے ان پر حملہ کرتے دیکھ چکے تھے اور یہ سمجھ گئے تھے کہ وہ بھی کوئی قیدی ہے۔

اس طرح وہ بھی ان کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ شیریں کو بھی تلاش کرتا رہا۔ بالآخر وہ اسے ایک آڑ میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھر تھر کانپتی نظر آ گئی۔ اس کے جسم پر ابھی تک دلہنوں والا لباس تھا۔ وہ سلمان کو دیکھ کر جی اٹھی۔ سلمان نے اسے ابھی وہیں دبکے رہنے کی ہدایت کی اور گاہے بہ گاہے کارتوس فائر کرتا ہوا سردار کے جھونپڑے کے قریب پہنچ گیا، مگر جب وہ وہاں پہنچا تو اکبر غائب تھا۔

وہ تیزی سے باہر نکلا۔ چند گھڑ سوار حملہ آور اس کے قریب آ گئے۔ سلمان نے چلا کر ان سے کہا۔

''سردار فرار ہو گیا ہے..... اسے پکڑو۔'' یہ کہہ کر وہ بھی ایک طرف دوڑا۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ اکبر کے لوگوں کی لاشیں تھیں۔ ان کی محدود فائر والی بندوقیں بھلا کب تک گھڑ سوار حملہ آوروں کی جدید رائفلوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

اچانک سلمان کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ پہاڑی کی شمالی سمت کی طرف دوڑا۔ گھڑ سوار ابھی تک بچے کھچے لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ اس نے جس طرف کا رخ کیا تھا، ادھر اکبر کی اونٹنیاں اور سانڈنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ایک اونٹنی سوار پر پڑی۔ طباق چاند کی روشنی میں اسے اکبر صاف نظر آ گیا۔

اس ظالم کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر سلمان کی نظروں کے سامنے ایک ایک ظلم گھوم گیا۔ اس نے جوش غیظ سے با آواز بلند اسے للکارا اور پھر اس کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ کارتوس چلنے کی دھماکے دار آواز گونجی اور اس نے اکبر کو اونٹنی سے نیچے گرتے دیکھا۔ سلمان اور اس کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے نزدیک جا پہنچا۔ کارتوسوں کے مہیب چھروں نے اسے بری طرح زخمی کر ڈالا تھا۔ وہ پتھریلی زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ سلمان اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس کا چہرہ

خون سے لت پت ہو رہا تھا۔

سلمان نے انتہائی خوفناک نظروں سے اسے گھورا اور پھر بندوق کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ نادار اور کم زور بے گناہ انسانوں کو تذلیل کرنے والا آج اسے خود دہشت زدہ اور رحم طلب نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

''اکبر مجھے خوشی ہے کہ آج تیرے جیسے ذلیل کتے کا بھیانک انجام میرے ہاتھوں ہونے والا ہے۔''

اکبر زخموں سے کانپ رہا تھا۔ پھر بمشکل اپنے دونوں خون آلود اور کپکپاتے ہاتھوں کو جوڑ کر اپنی جان بخشی کی معافی مانگنے لگا، مگر سلمان اس ننگ انسانیت اور سفاک و بے رحم شخص کو کس طرح زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے لبلبی دبا دی۔ ایک دھماکہ ہوا، اس کا بھیجا تو کیا سر ہی اڑ کر بکھر گیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا.....؟'' اچانک ایک بھاری اور گونج دار آواز سلمان کے عقب میں ابھری۔ وہ چونک کر پلٹا تو سامنے ایک لمبا تڑنگا مگر چھریرے جسم والا شخص کھڑا تھا۔ وہ اس کا ہم عمر تھا، نوجوان سا۔ اس نے گھیر دار مخصوص مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ عقب میں اس کے ساتھی کھڑے تھے۔ انہوں نے اڈیال کی لکڑی کی مشعلیں تھام رکھیں تھی۔

''میں نے اس سے اپنی ساتھی پر ظلم کا بدلہ لیا ہے۔'' سلمان نے اس سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، ہم بھی اسے جہنم واصل کرنے ہی آئے تھے۔'' وہ سانولا اور پر جوش نوجوان بولا۔ ''لیکن مجھے اپنی بہن کے بارے میں اس سے پوچھنا تھا کہ اس رذیل نے اسے کہاں غائب کیا ہے؟ کیونکہ یہاں تلاش کے باوجود مجھے میری بہن نظر نہیں آئی ہے۔''

سلمان اس کی بات پر چونکا اور فوراً اس کے ذہن میں زرق برق لباس والی دوشیزہ گھوم گئی جسے اکبر نے جانے کہاں سے اغواء کرنے کے بعد اسے فروخت کر دیا تھا۔ اس کا نام بانو صریر تھا جس نے اکبر کو للکارا بھی تھا کہ وہ آغا مسعود کی بہو اور رستم کی لاڈلی بہن ہے۔

''تمہاری بہن کا نام ''بانو صریر'' تو نہیں ہے؟'' سلمان نے اچانک اس سے پوچھا تو اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بانو صریر کا بھائی رستم ہی تھا۔ اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی لاڈلی بہن کو اکبر کے گروہ نے اغواء کیا تھا۔ سلمان نے اسے ساری کتھا سنا ڈالی اور یہ بھی بتایا کہ اکبر نے اس

کی بہن کو فروخت کر دیا ہے۔ وہ قہر و غضب میں میں بھر اٹھا۔ ''اب مجھے اس ذلیل سے بھی حساب لینا ہے۔ میرے پاس گھوڑے کم ہیں۔ تم اکیلے ان پہاڑوں سے نکل جاؤ گے ناں؟'' اس نے پوچھا تو سلمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رستم پھنکتا ہوا لوٹ گیا۔ سارے قیدی رہا کر دیئے گئے۔ سلمان نے شیریں کو ساتھ لیا اور اس منحوس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا۔

وہ ساری رات انہوں نے ایک تنگ و تاریک پہاڑی غار میں گزاری اور پھر صبح ہوتے ہی ان دونوں نے آبادی کا رخ کیا۔ آبادی چند میل کی مسافت پر تھی۔

❁

زندگی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ جب وہ خطرے میں گھر جائے تو انسان بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ قسمت کی دیوی مہربان ہو تو کوشش کامیاب ٹھہرتی ہے۔ سلمان کی کوشش بھی کامیاب ٹھہری تھی۔ وہ دونوں بھی اس مصیبت سے نکل آئے تھے۔ زندگی بچ گئی تھی۔ وہ بکنے سے بچ گئے تھے۔ اتنے بڑے بردہ فروشوں کے چنگل سے نکل آئے تھے۔ یہ مقام شکر تھا۔ وہ دونوں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سیدھے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں بام سے نکلے ہوئے چار روز ہو چکے تھے اور اب تک تہران پہنچ نہیں پائے تھے۔

تہران بڑا شہر تھا۔ بڑے شہر کی گود وسیع ہوتی ہے۔ وہ سب کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے۔ انہیں بھی یہی امید تھی کہ وہ وہاں کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہو جائیں گے کیونکہ فاکیہ نے ایک ماہ کا وقفہ مانگا تھا اور ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ بس کچھ ہی دنوں کی تو بات تھی۔ پھر وہ ہوتے اور فاکیہ ہوتی۔ گویا ان کی پشت اتنی مضبوط ہو جاتی کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی بھی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔ مگر یہ وقفہ، فاکیہ کی غیر حاضری کا وقفہ بہت دشوار تھا۔ اگر وہ موجود رہتی تو کیا وہ بردہ فروشوں کے چنگل میں پھنس سکتے تھے؟ اس لیے جلد از جلد وہ محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں بھاگتے جا رہے تھے۔ شیریں کی حالت دگرگوں تھی۔ اس بیچاری سے قدم بھی اٹھائے نہیں جا رہے تھے مگر وہ ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ بستی جو انہیں دور سے بہت قریب نظر آتی تھی ابھی بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ وہ اسی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں کئی افراد ملے مگر کسی نے توجہ نہ دی اور برابر سے گزر گئے۔ وہ خود بھی سوال و جواب سے بچنا چاہتے تھے۔ تبھی سلمان نے سامنے سے آتی ہوئی ادارہ شہربانی (پولیس) کی گاڑی دیکھی۔ اس کے ذہن میں

جیسے کسی نے سرگوشی کی کہ یہ ہمارے لیے خطرے کی بات ہے۔ وہ ہم سے سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ ہمارا پتا ٹھکانا پوچھ سکتے ہیں، میں نہ اپنے گھر کا پتا بتا سکتا ہوں اور نہ شیریں کے، دونوں جگہ کا میں مجرم ہوں۔

اسی لیے گاڑی کی طرف سے لاتعلق بنا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ فائرنگ کی آواز پر بستی والوں نے ادارہ شہربانی (پولیس) کو خبر کر دی ہو گی یا پھر بستی میں ہی پولیس اسٹیشن ہوگا اور وہ فائرنگ کی وجہ جاننے آ رہے ہوں گی۔

پولیس کی نظروں سے بچ کر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ لوگ بھی بردہ فروشوں سے ملے ہوئے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے بھی پھانس لیں، اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے رفتار دھیمی کر دی تاکہ شیریں کے ساتھ چل سکے۔ آژان (پولیس والوں) نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی اور ان کے برابر سے گزر گئے۔

گاڑی کے گزرتے ہی اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے پاس جو رقم تھی وہ بردہ فروشوں نے چھین لی تھی۔ انگلی میں فاکیہ کی دی ہوئی انگوٹھی تھی۔ اسے بھی اتارنے کی کوشش ہوئی تھی مگر وہ انگوٹھی اتر کر نہ دی تھی۔ اب یہی انگوٹھی کام آ سکتی تھی۔ فاکیہ نے بتایا تھا کہ تمہیں جب بھی رقم کی ضرورت پڑے یہ انگوٹھی دے دے گی۔ ابھی تک اس انگوٹھی کو اس نے آزمایا نہیں تھا کیونکہ راہ چلتے ہوئے آزمایا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر اس انگوٹھی کی خاصیت کا پتا شیریں کو چل جاتا تو یہ انگوٹھی اس کے دل میں خوف کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے وہ کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔

''یہ راستہ تو شیطان کی آنت ہے۔ ختم ہو کر ہی نہیں دیتا۔'' بالآخر شیریں نے خاموشی کو توڑا

''بس اب کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' سلمان نے اسے حوصلہ دیا۔

وہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ پیچھے سے آنے والا ایک کالسکہ (تانگہ) ان کے قریب سے گزرا۔ تانگے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سلمان گرتے گرتے بچا مگر شیریں خود کو سنبھال نہ سکی۔ وہ اندھے منہ گری تھی۔ اسے گرتے ہوئے تانگے والے نے دیکھ لیا تھا۔ اس میں شرافت کا مادہ باقی تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے تانگہ روک لیا اور پھر وہ اچھل کر نیچے اترا۔

وہ ایک پختہ عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی پھلکی خشخشی داڑھی تھی۔ قریب آ کر بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں تکلیف پہنچی۔ کہاں جانا ہے؟ اگر کہو تو میں پہنچا دوں۔''

''اس بستی تک۔'' سلمان نے جلدی سے کہا۔

''تو آؤ! میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔''

سلمان نے شیریں کو سہارا دے کر پیچھے کی طرف چڑھایا اور خود کوچوان کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جانے کے بعد کوچوان نے پوچھا۔ ''کس کے گھر جانا ہے؟''

''دراصل ہم راستہ بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں۔'' سلمان نے جلدی سے کہا۔

''اچھا اچھا! تو جانا کہاں ہے؟'' اس بار اس نے ایک ایسا سوال کر دیا تھا جس نے سلمان کو دہلا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب خود اس کو بھی معلوم نہ تھا کیونکہ اُس علاقے کے بارے میں اسے علم نہیں تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟ کیونکہ انہیں تو بردہ فروش لے کر آئے تھے۔ سلمان کو خاموش دیکھ کر وہ شخص بولا۔ ''مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے۔ آج تم لوگ میرے مہمان رہو گے۔ پھر کل صبح جہاں جانا چاہو گے میں پہنچا دوں گا۔''

یہ پیشکش سلمان کو اپنے حق میں لگی۔ اس نے فوراً شکریہ کہہ دیا اور خاموش ہو گیا۔

اس شخص کو شاید زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ وہ خود ہی بولتا چلا گیا۔ ''آج کل حالات بڑے خراب ہیں۔ جہاں دیکھو شاہ کے مخالف سر اٹھا رہے ہیں۔ کہیں تمہارے پیچھے بھی تو آژان (پولیس) نہیں لگی ہوئی ہے؟'' پھر خود ہی ہنستے ہوئے بولا۔ ''نہیں! تم تو مولوی ہو نہیں جو پولیس تمہارے پیچھے لگے گی۔''

سلمان نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو اس نے خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔ باتوں کے درمیان راستہ طے ہوتا گیا اور وہ بالآخر بستی تک پہنچ ہی گئے۔

اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ سلمان ایک پھندے سے نکلتا تھا اور دوسرے پھندے میں پھنس جاتا تھا۔ اب اس کی دعا یہی تھی کہ نیا کوئی پھندا کھڑا نہ ہو۔ کالسکہ (تانگہ) جا کر ایک اقامت کدہ (بنگلہ) کے سامنے رکا۔ بنگلے کی حالت خستہ تھی۔ مگر کھنڈر بتا رہا تھا کہ عمارت بلند تھی۔ یہ بنگلہ اچھے وقتوں کی یادگار تھا۔ اس کے مکین عزت والے ہوں گے۔ اپنے دور میں اونچا مقام رکھتے ہوں گے مگر ابھی اس کی حالت عبرت بھری تھی۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ دس بارہ سال یا اس سے بھی زائد عرصہ گزر گیا ہو گا جب اس پر رنگ و روغن کیا گیا ہو گا۔ ایک طرف وسیع مویشی خانہ بھی نظر آیا مگر مویشی ایک بھی نظر نہ آیا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی ویران ہے کیونکہ گھوڑے کی ناند باہر ہی پڑی تھی۔ وہ اور شیریں ایک جانب کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے

تھے کہ اس شخص نے کہا۔ ''آؤ! اندر چلتے ہیں۔''

وہ شیریں کے ساتھ اس شخص کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ پہلا کمرا اُطاق پذیرائی (ڈرائنگ روم) تھا۔ اس کمرے میں پرانے طرز کے فرنیچر تھے۔ اس کمرے کو پار کر کے وہ ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں دو سریر (پلنگ) بچھے تھے۔ اس نے کہا۔ ''روی رخت خواب دراز بکشید۔'' (بستر پر آرام کرو)

اس کے جاتے ہی شیریں نے کہا۔ ''مجھے یہ شخص کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ زبردستی اپنے گھر مہمان ٹھہرانا کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا ہے؟''

''فی الحال ہمیں سر چھپانے کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا جو ہمیں مل گیا۔ جس عذاب سے ہم بچ کر آئے ہیں اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو گا۔ جب وہاں سے ہمیں آزادی مل گئی تو یہ صاحب کس شاخ کے بوم (الو) ہیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا'' یہ کہہ کر سلمان لیٹ گیا۔

''میں اکیلے تمہارے ساتھ اس کمرے میں کیسے رہوں گی؟'' شیریں نے سر جھکا کر کہا۔

''کیوں؟ میں کھا جاؤں گا کیا؟''

''رات میں جب میں نیند میں بے خبر رہوں اور تم میرے پاس آ گئے تو؟''

''تو..... تو کیا ہو گا؟'' سلمان نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی ہے نا۔ نکاح بھی تو ضروری ہے۔''

''تو نکاح نہ ہونے کا اعلان طبل بجا کر کرو تا کہ لوگ ہمیں سنگسار کرنے کے لیے پتھر لے آئیں۔ بے وقوف لڑکی! ہر ایک سے یہی کہنا ہے کہ تم میری منکوحہ ہو۔ سمجھیں؟''

''تو تم بھی وعدہ کرو کہ تم حد سے تجاوز نہیں کرو گے۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ سلمان کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا۔

''بے فکر رہو! میں ایک شریف لڑکا ہوں۔'' کہنے کو تو سلمان یہ کہہ گیا تھا مگر دل کو کیسے سمجھاتا۔ محبت کی بھی اپنی ایک روایت ہوتی ہے جو زندہ رہتی ہے اور محبت کرنے والے اپنے جذبوں کو خون پلا کر زندہ رکھتے ہیں۔ اگر عشاق کے باوا قیس کو اپنی محبوبہ لیلیٰ کی گلی اور کتے سے پیار تھا تو اسی روایت کے حوالے سے اسے بھی شیریں سے پیار جتانے کا حق تھا۔

شیریں کا شکوہ بجا تھا اور سلمان کے دل کی پکار بھی صحیح تھی۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست تھے مگر فی الحال یہ پیار جتانے کا موقع نہیں تھا اس لیے سلمان اپنے اندر کے طوفان کو

رو کے ہوئے تھا۔ وہ ابن آدم تھا، شاگردِ ابلیس نہیں۔ اس لیے بھی بند کو ٹوٹنے نہیں دے رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ اور کہتی کہ وہی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ تھا۔ بچے کے سر پر خوان تھا جسے اس نے اندر لا کر سلمان کے سامنے رکھ دیا۔

سینی پر سے خوان پوش ہٹا تو بھوک نے اچھل کر اپنی یاد دلا دی۔ اشتہاء انگیز کھانے کی خوشبو ہی تو بھوک کو تیز کرتی ہے۔ اس نے شیریں سے کہا۔ ''بھئی ایسے کھانے دیکھ کر ضبط نہیں ہوتا۔ بھوک بے تاب کر دیتی ہے۔ جلدی آؤ۔''

سلمان کے انداز پر اس شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے شیریں سے کہا۔ ''بیٹی! اس کی شکل بتا رہی ہے کہ واقعی اسے بھوک لگی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔''

شیریں آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سلمان نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ وہ شخص بولا۔ ''تم نے اب تک اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں ہے۔ مجھے نوروز وجدانی بیہبانی کہتے ہیں۔ میرے اجداد بیہبان سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ اجداد کا پیشہ تجارت تھا۔ انہوں نے خوب خوب دولت کمائی مگر میں ٹھہرا احمق ترین۔ کچھ میرے والد نے اور باقی میں نے دونوں ہاتھوں سے دولت اڑا دی۔ اب تو صرف یادیں باقی ہیں کہ ہم باقی باللہ بیہبانی کی اولاد ہیں۔''

نوروز وجدانی کا انداز گفتگو دلچسپ تھا اس لیے کھانے کے ساتھ ساتھ سلمان گفتگو کا لطف بھی لیتا رہا۔ آخری جملہ جب اس نے ادا کیا۔ ''کبھی ہمارے ہاں کا رواج تھا کہ دسترخوان بچھا کر غلاموں کو بھیج دیا جاتا تھا کہ مسافروں کو ڈھونڈ کر لاؤ تا کہ ہم کچھ کھا سکیں۔ اگر مسافر نہیں ملتے تو راہ میں جو بھی ملتا، خواہ اسی علاقے کا کیوں نہ ہو اسے غلام بلا لاتے۔ تب ہمارے بزرگ کھانا کھاتے تھے۔ کبھی کبھی میرے اندر بھی وہ جوش اٹھتا ہے اور میں کسی نہ کسی کو بلا لاتا ہوں۔''

اس کی باتوں سے سلمان کو کچھ راحت ملی۔ اطمینان ہوا کہ یہ اپنی مہمان نوازی کی وجہ سے ہمیں لے آیا ہے۔ دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔

کھانا کھا کر سلمان قیلولہ کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ نوروز وجدانی اندر چلا گیا۔ جاتے وقت کہہ گیا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو اس دستے سے اس گھنٹے پر چوٹ مارنا۔ فوراً کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ شام میں پھر باتیں ہوں گی۔''

نوروز وجدانی کے جاتے ہی شیریں بولی۔ ''آدمی دلچسپ ہے مگر کیا کروں؟ میں نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ کسی پر بھروسا کرنے کو دل ہی نہیں کرتا۔''

''تمہارا دل اندھے کی لاٹھی ہے۔ ہر ایک پر برسنے کو بے تاب رہنے والی لاٹھی۔'' کہہ کر سلمان نے قہقہہ لگایا۔

''اب کیا کرنا ہے یہ سوچو!'' شیریں نے کہا۔

''سوچنے کے لیے وقت پڑا ہے۔ اس اذیت خانے میں آرام کہاں تھا؟ اب موقع ملا ہے تو کچھ دیر سو لوں۔'' کہہ کر سلمان نے کروٹ بدل لی۔ بات غلط نہیں تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ نوحہ کناں تھا۔ وہ آرام کی طلب شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ شاید یہ تھکن کا ہی اثر تھا وہ کچھ ہی دیر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر سویا تھا کہ خود ہی آنکھ کھل گئی شیریں کے بستر پر نظر ڈالی تو وہ اب تک سو رہی تھی۔ سلمان نے پنجرہ (کھڑکی) سے باہر نظر ڈالی۔ دھوپ رخت سفر باندھ رہی تھی۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی اس انگلی پر نظر ڈالی جس میں انگشتری تھی۔ اس کے دل نے صدا دی۔ ''یہ موقع مناسب ہے۔ فاکیہ کے اس تحفہ کو آزما'' اور اس نے اس انگوٹھی کو فاکیہ کی ہدایت کے مطابق بائیں ہتھیلی پر رگڑا، ساتھ ہی ساتھ کہا۔ ''دو ہزار تومان۔''

اتنا کہنا ہی کافی ہوا۔ اس کے سامنے کرارے کرارے دو ہزار تومان کے نوٹ رکھے نظر آئے۔ اس نے جلدی سے اس پر بالش (تکیہ) رکھ دیا۔ اس وقت اس کی خوشی دیدنی تھی۔ فاکیہ نے اپنی کمی پوری کر دی تھی۔ اب اسے زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ یہ سوچتے ہوئے دوبارہ لیٹ گیا مگر اب اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ تبھی اندر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ غیر ارادی طور پر سلمان کی نگاہ شیریں کے بستر پر گئی۔ وہ سوئی ہوئی ضرور تھی مگر اس کے کپڑے بے ترتیب نہیں تھے اور اس نے شال کو جسم پر ڈھک رکھا تھا۔ سلمان نے اندر والے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آ جائیں۔''

سلمان کا اندازہ صحیح تھا۔ نوروز وجدانی قہوہ کا سامان اٹھائے اندر آ گیا۔ اس نے سینی کو بستر پر رکھا اور فنجان کو قہوہ سے لبریز کر کے سلمان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''لو! چستی پھرتی کے لیے یہ ضروری ہے۔''

نوروز وجدانی کی آواز پر شیریں اٹھ گئی۔ اٹھ کر بیٹھتے ہی اس نے جلدی جلدی جسم پر شال درست کی اور سلام کے الفاظ ادا کیے پھر بستر سے اتر کر آگے آ کر قوری (چائے دانی) کو پکڑ لیا اور بولی۔ ''یہ کام میرا ہے۔ میں فنجان پیش کروں گی۔'' پھر اس نے نوروز وجدانی کو قہوہ دیا۔

ابھی سلمان باتیں کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' نوروز وجدانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''شاید پڑوس سے کوئی آیا ہے۔'' وہ اٹھ کر دروازے کے پاس چلا گیا۔

جس جگہ شیریں وسلمان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے دروازہ زیادہ دور نہیں تھا اور وہ دروازے پر ہونے والی گفتگو کو سن سکتے تھے۔

''آغائی نوروز وجدانی گھر پر ہیں؟''

''جی ہاں! فرمائیے۔ کیا کام ہے؟'' نوروز وجدانی کی آواز میں گھبراہٹ اور پریشانی کا عنصر تھا۔

''شحنہ (کوتوال) نے آپکو بلایا ہے۔''

''اچھا!'' نوروز وجدانی نے بہت آہستہ سے کہا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ''شحنہ (کوتوال) نے بلایا ہے، مگر کیوں؟ آغائی! ٹھہریں۔ ابھی آرہا ہوں۔''

نوروز وجدانی واپس پلٹا تو نگاہوں میں خوف تھا۔ بے بسی تھی۔ دکھ تھا اور ساتھ ہی شکوہ بھی۔

''یہ تم لوگوں کی وجہ سے ہوا'' سلمان کو لگا جیسے وہ نگاہیں اس سے کہہ رہی تھیں ''میں نے تو سمجھا تھا کہ تم مہمان ہو۔ مہمان رزق لاتے ہیں۔ تم بھی میرے لیے خوشی کا پیام لائے ہوگے۔ تم آگئے ہو تو میرا دکھ بٹاؤ گے۔ میری ہمت بڑھاؤ گے اور میں زیادہ حوصلے کے ساتھ دنیا کا مقابلہ کرسکوں گا۔ لیکن تم نے..... تم نے تو بس تباہ کردیا۔ ہم تو پہلے ہی تباہ تھے اور اب تم نے یہاں آکر بچی کھچی کسر بھی پوری کردی اور ہم بالکل ہی تباہ ہوگئے۔''

سلمان کا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا، اور وہ اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا مجرم سمجھ رہا تھا۔ اس نے واقعی اس کی زندگی میں، جو پہلے ہی دکھوں کا شکار تھی، اب اور زیادہ زہر گھول دیا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، اور وہ اس سارے معاملے میں پہلی بار اپنے آپکو خوف اور دہشت کا شکار محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر نوروز وجدانی نے کچھ کہہ دیا تو.....؟ پھر کیا ہوگا.....؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کتنا حوصلہ مند آدمی ہے، اور کس حد تک دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

گھر سے نکلنے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ نوروز وجدانی کو کچھ ضروری باتیں بتادے۔

''آغائی رضا۔'' اس نے آہستہ سے ان کے کان میں کہا۔ ''آپ کچھ نہیں جانتے۔ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کچھ نہیں معلوم..... کچھ بھی نہیں معلوم..... بس! شروع سے لے کر آخر تک آپ کا موقف یہی ہوگا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' نوروز وجدانی نے آہستہ سے اس طرح کہا گویا وہ خواب میں بول رہا ہو۔ ''ہاں! میں تو واقعی کچھ نہیں جانتا۔ بے فکر رہیں۔''

سلمان نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ''کچھ نہیں ہوگا اور میں خود ساتھ چل رہا ہوں۔ پریشان مت ہوں۔''

سلمان نے جلدی سے جوتے پہنے۔ کپڑے تو ٹھیک ٹھاک ہی تھے اور ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکلنے لگے تو اچانک شیریں نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ صرف سلمان کی طرف خاموشی سی دیکھا۔ اُف! کس قدر درد تھا ان آنکھوں میں، لگتا تھا کہ ساری دنیا کا کرب اس کی ان دو آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے اور وہ آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلمان نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اس نے بوجھل نظروں سے شیریں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ نوروز وجدانی کے ساتھ ساتھ تھا اور شیریں ان دونوں کے پیچھے تھی۔

دروازے پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک بار پلٹ کر شیریں کی طرف دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔ نوروز وجدانی بھی ساتھ تھا۔ شیریں دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

باہر ایک باوردی آژان (ہیڈ کانسٹیبل) کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھ کر متوازن لہجے میں کہا۔

''آپ کو کلانتری (تھانے) چلنا ہے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

''خیریت تو ہے بھائی۔'' نوروز وجدانی نے کمزور آواز میں کہا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی جو شحنہ نے مجھے فوراً بلایا ہے۔''

''مجھ کو نہیں معلوم۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''میں تو باہر گیا ہوا تھا۔ جیسے ہی کلانتری پہنچا شحنہ نے آپ کی طلبی کا حکم دے دیا۔ شاید کسی تفتیش کے سلسلے میں بلایا ہوگا۔ چلیے۔''

''چلیے!'' نوروز وجدانی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں چل رہا ہوں۔''

وہ تینوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے جہاں عمارت کے احاطے میں پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

جب نوروز وجدانی کے ساتھ سلمان بھی گاڑی کی طرف بڑھا تو ہیڈ کانسٹیبل نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کون ہیں؟ کیا آپ بھی ساتھ چل رہے ہیں۔''

''میں بھی ان کے ساتھ چل رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو۔''

''لو جی! مجھے کیا اجازت دینی ہے؟'' ہیڈ کانسٹیبل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ضرور چلو جی۔ بیٹھ جاؤ گاڑی میں۔''

وہ تینوں پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے علاوہ ایک اور باوردی سپاہی بھی وین میں موجود تھا اور وہی گاڑی چلا رہا تھا۔

سلمان کا دماغ اس ساری صورت حال کے بارے میں بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا اور اس کا کوئی حل نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ نوروز وجدانی کی تھانے میں طلبی خالی از علت نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی ہے۔ جس کے باعث پولیس کو نوروز وجدانی پر شک ہو گیا ہے کہ اس نے ہمیں پناہ دی ہے اور ہم جرم کر کے بھاگ رہے ہیں۔ کہیں کوئی خامی ضرور رہ گئی ہے مگر کہاں؟ آخر مجھ سے کیا چوک ہو گئی جو میں پہچان لیا گیا۔ سلمان غور کر رہا تھا۔

لیکن فی الحال اس بات میں سر کھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ نوروز وجدانی کو کس طرح اس تازہ مصیبت سے چھڑایا جائے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''میں اپنی ایک ایک پائی لگا دوں گا۔'' اس نے دل میں کہا۔ ''میں اپنی ساری جیبیں خالی کر دوں گا مگر نوروز وجدانی پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ پولیس کتنی رشوت لے گی۔ لاکھ دو لاکھ، تین لاکھ تومان۔ جتنی رقم میں بھی سودا ہو جائے گا میں کروں گا۔ مجھے نوروز وجدانی کو ہر حال میں اس عذاب سے بچانا ہے۔ یہ انگوٹھی تو مدد کرے گی ہی اس کے علاوہ بھی میں سعی میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے کاش! میں یہاں نہ آیا ہوتا۔''

جیپ جب تھانے کی حدود میں داخل ہوئی تو وہ اپنے آپ کو بدترین صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر چکا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل ان دونوں کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور وہ ان سے

پہلے نیچے اترا۔ پھر وہ دونوں نیچے اترے اور وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے عمارت کے اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

وہ ان دونوں کو برآمدے میں کھڑے رہنے کی ہدایت دے کر وہ شحنہ کے کمرے میں داخل ہو گیا اور تقریباً فوراً ہی دوبارہ واپس آ گیا۔

''آیئے جی!'' اس نے دور سے ان لوگوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ دونوں کوتوال کے کمرے کی طرف بڑھے۔

کوتوال اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ انہیں ساتھ لانے والا ہیڈ کانسٹیبل دروازے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ کوتوال کی میز کے سامنے کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

سلمان کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کوتوال کا یہ انداز وہ نہیں تھا کہ جو مجرموں یا مشتبہ افراد کی جانب ہوتا ہے۔ بہرحال ان دونوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آپ دونوں میں سے آغائی نوروز وجدانی کون ہیں؟'' اس نے ان کے چہروں کو باری باری غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی میں ہوں۔'' نوروز وجدانی نے فوراً کہا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''اور آپ؟'' کوتوال نے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آغائی نوروز وجدانی میرے چچا ہیں۔'' سلمان نے فوراً جواب دیا۔ ''میرا نام سلمان ہے۔ میں تہران میں رہتا ہوں اور ان دنوں یہاں آیا ہوا ہوں۔''

''اوہ بہت خوب۔'' کوتوال نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''آپ تہران سے آئے ہیں۔ ارے یہ تو بتائیے کہ وہاں سے ۱۰۰ ایک کارٹن پانچ سو پچپن کی سگریٹ کے بھی مل سکتے ہیں۔ آج کل یہاں سخت قلت ہے اور تہران میں تو ماشاء اللہ دنیا بھر کا ساز و سامان مل جاتا ہے۔''

''جی ہاں! بے شک آتے وقت میں کچھ کارٹن لے آیا تھا۔'' سلمان نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں آپ کو کل ہی پانچ سو پچپن کے چند کارٹن پہنچا دوں گا۔''

سلمان نے روانی میں جھوٹ بول تو دیا تھا مگر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ کہیں یہ جھوٹ گلے میں نہ آ جائے اس لیے کہ اتنی بڑی مقدار میں سگریٹ خریدے گا کہاں سے پھر اس

نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ یہ اتنا بھی مشکل ہے نہیں' اس کے پاس انگوٹھی ہے۔ گویا بلینک چیک ہے جو روپے کا انتظام کرے گی اور وہ بازار سے خرید کر اس کے منہ پر مار دے گا۔

''اوہ شکریہ..... شکریہ۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس کو تکلیف دوں مگر اب تو آپ نے بندوبست کر ہی دیا۔''

''میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں جناب۔'' سلمان نے اعتماد اور وقار کے ساتھ کہا۔ ''کل ہی کارٹن لا دوں گا۔''

نوروز وجدانی' سلمان کے برابر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر زبردست الجھن کے آثار تھے۔ شاید وہ بھی الجھن میں ہو کہ یہ سگریٹ کہاں سے پیدا کرے گا کیوں کہ اس کے پاس تو کوئی کارٹن تھا ہی نہیں۔ پھر کوتوال نے ابھی تک اس سے تو کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ تو اپنی سگریٹوں کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ سگریٹ جس کے خلاف علما نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ یہاں کے حالات میں غیر ملکی سگریٹ خریدنا بیچنا حرام ہے اور شاہ کے وفادار اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے غیر ملکی سگریٹ ہی پیتے تھے۔

سلمان خود بھی اس صورت حال سے الجھن میں مبتلا تھا۔ کوتوال کا رویہ نرم اور دوستانہ تھا اور اس میں پولیس والوں کی وہ روایتی درشتی اور کرختگی شامل نہیں تھی جو وہ ملزموں اور مشتبہ افراد کی جانب روا رکھتے ہیں۔

''ہاں تو پھر چلیں؟ اوہ مگر میں نے تو آپ کو بتایا ہی نہیں۔ اتنی دیر ہو گئی اور میں باتوں میں بھول گیا' آپ کو ذرا میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ آیئے!'' اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چل رہا ہوں سر۔'' نوروز وجدانی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن جانا کہاں ہے؟ کوئی خاص بات ہے؟''

''شاید کوئی خاص بات ہی ہے؟'' اس نے لاپرواہی کے انداز میں کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے تو نہیں معلوم۔ رئیس ضبطیہ (ایس پی) کا فون آیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ آپ کو لے کر شفاخانہ (اسپتال) پہنچ جاؤں۔ سو میں نے آپ کو بلوا لیا۔''

سلمان کی جسم میں تشویش کی ایک سرد لہر دوڑ گئی کہ کوتوال نے نہیں، رئیس ضبطیہ نے بلوایا تھا۔ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین معلوم ہوتا تھا۔ بات کوتوال پر ختم نہیں ہوئی تھی۔

''کوئی بات نہیں؟'' سلمان نے دل میں کہا۔ ''ایس پی اور کوتوال میں کیا فرق ہے؟

صرف ریٹ ہی کا تو فرق ہے۔ میں ایس پی کی قیمت ادا کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہوں لیکن نوروز وجدانی کو ہر حال میں بچانا ہے۔''

''کیا آپ بھی چل رہے ہیں آغائی سلمان؟'' کوتوال نے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا

سلمان نے نوروز وجدانی پر نظر ڈالی۔ اس کے مسکین چہرے پر التجا تھی کہ مجھے اکیلے نہ چھوڑنا' سلمان نے مسکرا کر کہا ''جی ہاں' میں چچا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں! ضرور'' کوتوال نے فوراً کہا ''آپ لوگ اس گاڑی میں بیٹھ جائیں۔'' اس نے وین کی طرف اشارہ کیا جس میں بیٹھ کر وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ وہی کانسٹیبل ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا اور کوتوال آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وین وہاں سے روانہ ہو گئی۔

''ابھی تک نوروز وجدانی کی گرفتاری کا حکم جاری نہیں ہوا ہے۔'' سلمان نے دل میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ معاملہ ابھی تک شبہ تک محدود ہے اور تھوڑا سا زور لگانے سے بات بن سکتی ہے۔ بس رئیس ضبطیہ کو خوش کر دینے کی ضرورت ہے۔ باقی معاملہ تو پھر ٹھیک ہو ہی جائے گا۔''

گاڑی تیزی کے ساتھ کسی نامعلوم سمت کو روانہ تھی اور سلمان کا دماغ مختلف منصوبوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اور نوروز وجدانی دونوں بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھا ہیڈ کانسٹیبل سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے بھی راستے بھر کوئی بات نہیں کی اور خاموش رہا۔

گاڑی پوش علاقے کی طرف جا رہی تھی اور پھر کچھ دیر کے بعد وہ ایک بہت بڑے اسپتال کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

کوتوال نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سلمان نے دل میں سوچا۔ ہم لوگ واقعی اسپتال میں آ گئے ہیں مگر یہاں نوروز وجدانی کو کس نے بلایا ہے۔ کیا کوئی شناخت وغیرہ کا مسئلہ ہے؟

وہ لوگ کوتوال کے ساتھ گاڑی سے اترے اور وہ انہیں ساتھ لیے ہوئے عمارت کے اس حصے کی طرف چل پڑا جہاں پرائیوٹ کمرے واقع تھے۔ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے ایک کانسٹیبل ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ سلمان وغیرہ کو آتا دیکھ کر وہ جلدی سے کمرے کے اندر چلا گیا اور چند لمحوں کے بعد واپس آ گیا اس کے ساتھ ہی رئیس ضبطیہ (ایس پی) کی وردی میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کا افسر تھا۔

وہ افسر بڑی تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور اس نے خاصے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام جمال تبریزی ہے' میں رئیس ضبطیہ ہوں

اور آغائی زاہد قبطی کا بہت پرانا دوست بھی ہوں۔ آپ دونوں میں سے مسٹر نوروز وجدانی پیہانی کون ہیں؟''

''میں ہوں جناب۔'' نوروز وجدانی نے جلدی سے کہا ''میرا نام نوروز وجدانی پیہانی ہے۔''

یہاں بھی صورت حال اسی طرح پیچیدہ اور نا قابل فہم معلوم ہوئی تھی۔ جمال کے رویے میں بھی کوئی بات ایسی نہیں تھی جس میں مخاصمت کی جھلک موجود ہو اس کے برخلاف ان دونوں کے ساتھ وہ بڑے تپاک سے پیش آ رہا تھا۔ جیسے انہیں مہمانداری کے لیے بلوایا گیا ہو۔

''میں نے آپ کو تکلیف دی ہے آغائی نوروز وجدانی۔'' جمال نے آہستہ سے کہا۔ ''اور اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن یہ ایک خالص انسانی نوعیت کا معاملہ ہے میرے بچپن کا دوست، میرا یار غار زاہد علی زنبانی اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے اور وہ آپ کی موجودگی میں کچھ اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے بڑے دردمندانہ طور پر درخواست کی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے آپ کو بلوا بھیجوں اس لیے میں نے آپ کو بلوا لیا ہے۔''

''زاہد علی زنبانی کچھ اعترافات کرنا چاہتا ہے مگر کیوں؟ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ یا یہ بھی اس کی اور پولیس والوں کی مشترکہ چال ہے۔'' نوروز وجدانی بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ پر سلمان نے چونک کر اسے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ وہ معاملے کی تہہ تک جانا چاہتا تھا۔

نوروز وجدانی خالی خالی نظروں سے ایس پی جمال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے۔

''بات یہ ہے آغائی نوروز وجدانی کہ شاید آپ نے اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ نامعلوم ڈاکوؤں نے زاہد علی زنبانی کے گھر ڈاکا ڈالا اور انہیں شدید طور پر زخمی کر دیا تھا۔'' جمال قدرے توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''ایک ڈاکو نے آغا زاہد پر سوتے میں ان کے منہ پر پٹی باندھا اور اس مقصد کے پیش نظر کہ وہ جاگنے پر کوئی مزاحمت نہ کر سکیں، ان کے دائیں ہاتھ پر کہنی کے پاس کسی بھاری تیز دھار ہتھیار سے حملہ کر دیا۔ زاہد علی بچارے کا ہاتھ سخت مجروح ہو گیا۔ اس دوران خون بہت بہتا رہا اور ان کے گھر والوں کو صبح ہی اس المناک سانحے کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے زاہد علی کو فوراً اسپتال پہنچا دیا اور یہاں ڈاکٹرز سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے آغا زاہد کے ہاتھ کو کاٹ دینے کے بجائے کٹے ہوئے ہاتھ کو جوڑنے کی کوشش کی۔ شاید ڈاکٹروں کو اندازہ نہیں

بھی درست نہ ہوگا کیونکہ اس نے تو اپنے طور پر بہتری کی ہی کوشش کی تھی لیکن اس کا نتیجہ زاہد علی کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔''

جمال بولتے بولتے رک گیا اس کا چہرہ سخت اور ویران ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں مایوسی اور اضمحلال کا اظہار کر رہی تھیں۔ شاید وہ زاہد علی کو عزیز رکھتا تھا۔ اس سے پیار کرتا تھا۔

''آغائی زاہد علی شوگر کے مریض ہیں۔'' اس نے دوبارہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ان کے گھر والوں کو اپنی پریشانی اور مصیبت کے عالم میں ڈاکٹروں کو ان کے بارے میں یہ بتانے کا خیال نہیں رہا اور جب انہیں خیال آیا تو کافی دیر ہو چکی تھی اور یہاں ان کا مجروح ہاتھ کاٹ دیا گیا۔'' جمال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''لیکن اس وقت تک کافی نقصان ہو چکا تھا۔ ہاتھ سڑنا شروع ہو گیا ہے اور اس کا زہر جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل رہا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کی ٹیم ان کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہی ہے لیکن ابتداء میں جو نقصان ہو چکا اس کی تلافی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔''

وہ لوگ بڑے غور اور توجہ کے ساتھ جمال کی باتیں سن رہے تھے۔

''بہرحال زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' جمال نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لے کر کہا ''لیکن بے چارا زاہد علی اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہے، ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق اس کے بچنے کے امکانات کم ہیں اور زاہد علی اپنی اس حالت سے خود بھی واقف ہے اس کا خیال ہے کہ آخری وقت آ گیا ہے اور اس نے آپ سے ملنے کی شدید خواہش ظاہر کی ہے۔ میں اس واردات کی تحقیقات بھی اپنی نگرانی میں کرا رہا ہوں اور آج جب میں آغائی زاہد علی کے پاس آیا تو اس نے خصوصی طور پر التجا کی کہ آپ کو بلوایا جائے۔ وہ آپ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو بلوا لیا۔ آیئے اندر چلیں۔''

معاملہ بڑی حد تک صاف ہو گیا تھا۔ سلمان کو چند لمحوں کے اندر اندر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ نوروز وجدانی کے ساتھ اندر جائے یا نہ جائے یا نوروز وجدانی کو اکیلے جانا چاہیے۔ لمحوں میں اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا اور کمرے کے باہر دروازے کے پاس ہی رک گیا۔

نوروز وجدانی نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ''آپ نہیں آ رہے ہیں؟''

''نہیں!'' سلمان نے آہستہ سے کہا۔ ''میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔ وہاں میری کوئی

ضرورت نہیں ہے۔"

جمال، کوتوال اور نوروز وجدانی کمرے کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا سلمان اور کانسٹیبل باہر ہی رہ گئے کانسٹیبل شاید متجسس فطرت کا تھا یا پھر رضا شاہ پہلوی کے خاص دستے میں شامل تھا جن کا کام ہے ہر شخص کی بات محکمہ خاص پہنچائے۔ شہنشاہ نے ایک خاص محکمہ بنا رکھا تھا جس کے کارندے ہر سطح ہر محکمہ میں گھسے ہوئے تھے اور وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ ہر بات سے اپنے محکمے کو باخبر رکھیں۔ اس محکمے سے وابستہ افراد خود کو سب سے مخفی رکھتے ہیں۔

اگلے ہی چند لمحوں میں کانسٹیبل نے کمرے کی وہ کھڑکی تلاش کر لی جو عقبی طرف واقع تھی اور کھلی ہوئی اس کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اندر ہونے والی گفتگو کو صاف طور پر سنا جا سکتا تھا، لیکن وہاں کے منظر کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ کانسٹیبل کو خود بھی پوری صورت حال کا اندازہ نہیں تھا اور وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کمرے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے چنانچہ وہ سلمان کو اپنے ساتھ لے کر کمرے کے عقبی جانب کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

سلمان ابھی کھڑکی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک دم سے ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا اور پردہ زور سے اڑاتا ہوا پیچھے کی طرف چلا گیا۔ پردے کے ہٹ جانے کے باعث وہ کمرے کے اندرونی منظر کو صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔

ان چند لمحوں کے دوران جب کہ پردہ اوپر کو اٹھا تھا۔ اس نے زاہد علی کو دیکھ لیا۔ وہ کھڑکی کے بالکل قریب ایک صاف ستھرے اور سفید بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا صرف سر اور گردن کا حصہ کھلا ہوا تھا اور باقی پورے جسم پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔

اس کے سرہانے کے قریب ایک کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی شاید وہ زاہد علی کی بیوی تھی اور اس وقت درد و غم کا پیکر بنی ہوئی اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

جمال، کوتوال اور نوروز وجدانی کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس وقت تک ہوا کے جھونکے کا زور ٹوٹ چکا تھا اور پردہ اپنی جگہ پر واپس آ گیا تھا۔ اب وہ کسی کی شکل تو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اندر ہونے والی گفتگو ضرور سن سکتے تھے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" سلمان نے نوروز وجدانی کی آواز کو پہچان لیا۔ اس کی آواز جذبات سے عاری اور محض سرسری تھی جیسے کوئی سرراہ چلتے چلتے کسی کو دور سے دیکھ کر سلام

کرے اور رسماً مزاج پوچھ لے۔

"بیٹھ جاؤ علی رضا۔" سلمان نے زاہد علی کی کمزور اور نحیف آواز سنی۔ بقاہت سے ہی اس نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ اسی کی آواز ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

ہیڈ کانسٹیبل سلمان کے برابر میں کھڑا ہوا تھا اور بڑی خاموشی سے گفتگو کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف آنے سے پہلے ہی سلمان سے کہا تھا۔ "ان لوگوں نے ہمیں کھڑکی کے پیچھے دیکھ بھی لیا تو وہ بھی اس بات کا برا نہیں مانیں گے کیونکہ مریض کوئی ملزم نہیں ہے۔"

"جمال!" زاہد علی کی آواز چند منٹ کے بعد دوبارہ بلند ہوئی، تم یہاں موجود ہو اور پولیس کے ایک بڑے اور ذمہ دار افسر ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں کہوں اسے تم بھی غور سے سنو اور میری بات کو اوپر تک پہنچا دو۔"

"میں تمہاری بات کو بڑے غور سے سن رہا ہوں زاہد علی۔" جمال کی آواز بلند ہوئی۔

"بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو نوروز وجدانی یہاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔"

"نوروز وجدانی!" زاہد علی کی درد بھری اور نحیف و نزار آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ "شاید میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میرا زخم خراب ہو گیا ہے۔ سیپٹک ہو گیا ہے اور زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ ڈاکٹر میری جان بچانے کی بہت کوشش کر رہے ہیں لیکن ذیابیطس کا پرانا مریض ہونے کے باعث میری تکلیف بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔ میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ یوں تو میرے پاس لے جانے کے لیے کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے مجھے اپنے گناہوں کی تلافی کا موقع بھی نہ مل سکا اور بہت جلد بلاوا آ گیا۔ توقع سے پہلے ہی سب کچھ ختم ہونے کے آثار ہیں مگر میں اپنا بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ جمال میری بات سن لو نوروز وجدانی بے گناہ تھا اس نے کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔"

"ارے!" جمال کی حیرت بھری آواز گونجی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو زاہد علی۔"

"یہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں جمال۔" زاہد علی نے جواب دیا۔ "نوروز وجدانی تو اس قدر نیک اس قدر ایماندار فرض شناس اور فرشتہ صفت انسان ہے کہ میرے پاس اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں اس نے کسی سے رشوت نہیں لی تھی۔"

"اوہو وہ کیس، وہ سزا، وہ سب کچھ؟" جمال الدین نے اٹک اٹک کر کہا۔

"وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔" زاہد علی کی آواز ابھری۔ "وہ سب فراڈ تھا، جمال بالکل

فراڈ' وہ تو میں نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے نوروز وجدانی کو پھنسانے کے لیے ایک جال بچھایا تھا۔ ہم نے نوروز وجدانی جیسے نیک طینت اور پاک باطن انسان کو ذلیل وخوار کیا' اسے جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر سزا کرادی اور جیل بھجوا دیا اور دیکھو جمال ہمارا کیا حشر ہوا؟ نوروز وجدانی جیسا نیک اور سیدھا سادا آدمی تو ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ وہ بیچارا ہم سے کیا انتقام لے سکتا تھا لیکن قدرت نے ہم سے انتقام لے لیا۔ ڈاکوؤں نے ہم تینوں کو برباد کر دیا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جمال اس سے پہلے تو کبھی اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ جس چیز کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔''

''اوہ۔ زاہد علی۔'' جمال کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ یہ تم نے کیا کر ڈالا میرے یار؟ نوروز وجدانی تو سزا بھی کاٹ چکا اور اب وہ رہا ہو کر آ بھی چکا ہے۔ تم نے..... کاش تم نے پہلے سوچا ہوتا۔''

''اگر پہلے سوچ لیا ہوتا تو آج اس طرح اپنے گناہ عظیم کا اعتراف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' زاہد علی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

زاہد علی کی باتیں سن کر سلمان کے دل و دماغ میں ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ یہ ایک ایسی خوشی اور مسرت کا طوفان تھا جس کا اندازہ لگانا کسی اور کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اور نوروز وجدانی تو کیا سمجھ کر یہاں آئے تھے اور اصل بات کیا نکلی اب تک نوروز وجدانی کے دل پر جو بیت رہی تھی سو بیت رہی تھی سلمان خود بے انتہا پریشان اور تشویش میں مبتلا تھا مگر اب سارا معاملہ صاف ہو گیا تھا۔ حالانکہ سلمان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ زاہد علی اور رضا میں کیا رشتہ ہے۔

''نوروز وجدانی!'' زاہد علی بھرائی ہوئی آواز میں ایک بار پھر نوروز وجدانی سے مخاطب ہوا۔ ''ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ جو ظلم کرتا ہے، جو گناہ کرتا ہے، اس کو خدا بھی اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ انسان اس کو معاف نہ کر دے۔ میں نے تمہارے اوپر بہت ظلم کیا ہے۔ اصل آدمی تو میں ہی تھا جس نے تمہارے خلاف یہ سارا منصوبہ بنایا تھا اور اس میں دوسروں کو بھی شریک کیا تھا۔ وہ سارا گناہ میری گردن پر ہے۔ نوروز وجدانی خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ ایک مرتے ہوئے آدمی کی تم سے آخری التجا ہے۔ اس کو ردمت کرنا اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔''

آغا زاہد علی! گو کہ جو کچھ آپ نے میرے ساتھ کیا اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا پھر بھی

آپ کو معاف کرتا ہوں۔'' سلمان نے نوروز وجدانی کی جذبات سے بوجھل تھرتھراتی ہوئی آواز سنی۔ ''آپ لوگوں نے مجھ سے میری زندگی کا ایک حصہ چھین لیا۔ جسے اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے واپس نہیں دلا سکتی۔ آپ لوگوں نے میری اور میرے خاندان کی زندگی میں ایک ایسا زہر گھول دیا جسے پی کر ہم سب لوگ ادھ مرے ہو گئے۔ اس زہر کا کوئی تریاق نہیں تھا۔ زاہد علی لیکن میں نے پھر بھی آپ کو صدق دل سے معاف کیا، خدا بھی آپ کو معاف کرے۔''

''شکریہ آغائی نوروز وجدانی بہت بہت شکریہ۔'' زاہد علی کی آواز اس بار بالکل مختلف تھی اس میں کمزوری اور نقاہت کے باوجود سرخروئی کا عنصر شامل تھا۔ ''اب میں چین سے مر سکوں گا۔''

''میں آپ کے زندگی کے لیے خدا سے دعا کروں گا۔'' نوروز وجدانی نے آہستہ سے کہا۔

''یہ تمہاری بڑائی کی دلیل ہوگی۔ نوروز وجدانی ورنہ تمہیں تو میری موت پر خوش ہونا چاہیے تھا۔'' زاہد علی نے کہا۔ ''اور کوتوال صاحب اس اعتراف کے گواہ ہیں تم سب لوگوں کے سامنے میں یہ اعلان کر رہا ہوں کہ نوروز وجدانی کے خلاف کیس جھوٹا تھا۔ ساری گواہیاں جھوٹی تھیں۔ ساری دستاویزات جھوٹی تھیں۔ اگر اب تم اس سلسلے میں کوئی قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو تو ضرور کرنا یہ میری تم سے درخواست ہے۔''

''تم جلدی ہی اچھے ہو جاؤ گے زاہد علی۔'' جمال نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تم خود بھی قانونی کارروائی کر سکتے ہو تمہیں اس کا حق حاصل ہے۔''

''مجھے زندگی اتنی مہلت نہیں دے گی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے میری وصیت سمجھنا اور بس..... اوہاں آغائی نوروز وجدانی میں نے تم کو زحمت دی خدا تمہیں ہمیشہ خوش اور شاد و آباد رکھے۔''

''تو پھر اجازت ہے؟'' نوروز وجدانی نے کہا اور اس کی آواز سے ایسا لگا جیسے وہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے سلمان کو اشارہ کیا اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس ہٹ آئے ہیڈ کانسٹیبل کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک نظر آ رہی تھی۔

''خدا کے کیسے کیسے بندے پڑے ہیں۔'' اس نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''آدمی خود اپنی زبان سے اقبال کر رہا ہے کہ اس نے دوسرے کو بے گناہ پھنسوایا تھا۔ واہ رب تیری شان۔''

سلمان اور ہیڈ کانسٹیبل کمرے کے سامنے آئے تو اس وقت نوروز وجدانی اور کوتوال

کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ نوروز وجدانی کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کے روئیں روئیں سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ''سلمان' آپ کو معلوم ہے؟ زاہد علی نے مجھے کس لیے طلب کیا تھا؟'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''واہ...... انہوں نے...... میرا مطلب ہے۔''

''انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔'' سلمان نے جلدی سے اس کا جملہ مکمل کردیا اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''اور آپ نے اس کے جرم کو معاف بھی کردیا ہے۔''

''مگر...... مگر آپ کو کیسے معلوم؟'' اس نے چونک کر کہا۔ ''آپ تو ہم لوگوں کے ساتھ کمرے کے اندر نہیں گئے تھے؟''

''میں نے باہر سے ہی ساری گفتگو سن لی تھی۔'' سلمان نے کہا۔ ''بہرحال جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا۔''

''اچھا جی!'' کوتوال نے سلمان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ذرا رکوں گا آپ دونوں کو گاڑی آپ کے گھر تک چھوڑ آئے گی۔''

''نہیں۔'' سلمان نے جلدی سے کہا۔ ''اس تکلیف کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ چلے جائیں گے۔''

''جی ہم آپ کو اپنے ساتھ یہاں لائے تو یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ آپ کو واپس پہنچائیں'' اس مجسمہ اخلاق نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن ان دونوں نے بھی بڑی نرمی کے ساتھ معذرت کرلی۔

''مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔'' سلمان نے ہنستے ہوئے سرگوشی میں کوتوال سے کہا۔ ''اطمینان رکھیے آپ کی چیز آپ تک پہنچ جائے گی۔''

سلمان اور نوروز وجدانی اس اسپتال سے نکلے اور باہر سڑک پر آ گئے۔

''میری تو جان نکلی ہوئی تھی۔'' نوروز وجدانی نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ بس اب سب کچھ ختم ہے۔ اس بار پھنسوں گا تو برسوں کے لیے اندر چلا جاؤں گا۔''

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے۔'' سلمان نے سرگوشی میں کہا۔ ''خیر ویسے بات بھی پریشانی کی تھی۔ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔''

سلمان سمجھ گیا کہ وہ یہ سمجھ کر تھانے آیا تھا کہ اس کے اوپر ایک نئی بھاری مصیبت آنے والی ہے لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہ تو معاملہ ہی بالکل دوسرا ہے۔

نوروز وجدانی نے راستے میں سلمان کو بتایا کہ اس کو سب سے بڑا اطمینان تو اس بات کا ہے کہ اس پر کسی طرح کا بھی شک نہیں کیا گیا۔ تمام معاملے زاہد نے خود ہی ختم کردیے۔

''اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ یہ کیا چکر تھا؟ وہ کس بات کی معافی مانگ رہا تھا۔'' سلمان نے پوچھا۔

''زاہد علی ہمارا رشتے دار ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اس نے میری زمین کے ایک ٹکڑے پر قبضہ کرلیا تھا۔ تب سے ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے کبھی پہل نہیں کی مگر وہ وقتاً فوقتاً اوچھی حرکت کرجاتا تھا۔ دراصل میں نے شادی نہیں کی ہے اس لیے میں اپنی ضعیف ماں کے ساتھ اکیلا رہتا ہوں یا پھر میرے ساتھ نوکر رہتے ہیں۔ وہ بچہ جو کھانا لے کر آیا تھا وہ ہمارا نوکر ہے۔ آخری ہتھکنڈہ اس نے اسی پر آزمایا تھا۔ پہلے تو اس نے لڑکے کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے گاؤں بھر میں مجھے بدنام کردیا کہ میں ان نوکروں کی وجہ سے شادی نہیں کرتا ہوں۔ ایک سال پہلے اس نے ایک بدکردار عورت کو میرے خلاف لا کھڑا کیا۔ اس نے علاقے بھر میں مجھے بدنام کیا کہ میں نے اس سے تعلق بنا رکھا ہے۔ بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو بھی برا نہیں تھا مگر اس کے آدمیوں نے اس عورت کو قتل کردیا اور الزام مجھ پر تھوپ دیا پھر میری کچھ زمین پر جعلی کاغذات بنوا کر قبضہ کرلیا اور کلانتری میں رپورٹ لکھا دی کہ میں نے اس پر جان لیوا حملہ کیا تھا۔''

''واقعی وہ بدذات آدمی ہے۔ اس کے لگائے گئے الزام نے تو آپ کو توڑ کر رکھ دیا ہوگا۔''

''ہاں! دو مہینے جیل میں رہا ہوں۔ جب چھوٹ کر آیا تو اس نے ایک اور مصیبت کھڑی کردی جو ابھی تک میرے سر پر گرز لادے ہوئے ہے۔ میں ضمانت پر ہوں۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے آنے والی ایک ٹیکسی نے ہمارا راستہ روک لیا۔

اس ٹیکسی پر تین بندے سوار تھے۔ سلمان کی تیز نظروں نے پہچان لیا کہ وہ سب شُہدے ہیں' غنڈے ہیں۔ ایسے لوگ جب کسی کو روکتے ہیں تو ان کی نیت اچھی نہیں ہوتی۔ نوروز وجدانی انہیں کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا'' آغائی ئی رضا، کیا آپ ہمارے ساتھ جانا پسند کریں گے؟

''کیوں؟'' نوروز وجدانی نے سوال کیا۔

''اس کا جواب تو احمد نعمتی دیں گے، انہیں ہی آپ سے کلام ہے۔''

''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟''

''تو ہم زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے۔''

''اور اگر میں مداخلت کروں تو؟'' سلمان نے بھی انہی کے لہجہ میں کہا۔ وہ سب اس طرح بول رہے تھے جیسے آپس میں گفت وشنید کر رہے ہوں۔ سلمان بھی اسی طرح دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

''تو جناب کے پیر توڑ کر ہاتھ میں دے دیے جائیں گے۔'' بولنے والے کا لہجہ اب بھی دھیما تھا۔ شاید وہ اس بھری پری شاہراہ پر، پولیس اسٹیشن کے بالکل سامنے کسی قسم کا دنگا فساد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''محترمی ہم نے اپنے پیروں کا بیمہ کرا رکھا ہے۔ اس لیے پیروں کی تو فکر نہیں ہے مگر آپ کے سر کی فکر ہے کہ اس پر بہت جلد کئی گومڑا بھرنے والے ہیں۔'' سلمان کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔

''تو میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کے پیروں کی جگہ سر کا انتخاب کر لیتا ہوں اور صرف ایک گولی وہاں داغ دیتا ہوں۔'' کہہ کر اس نے کوٹ اٹھا کر پستول کی جھلک دکھائی۔ اس کا بایاں ہاتھ پستول کے دستے پر رکھا ہوا تھا۔ داہنا ہاتھ بڑھا کر سلمان کے ہاتھ کو مصافحہ کے انداز میں پکڑ کر بولا۔

''تو جناب کیا خیال ہے، اب تو آپ دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بالکل نئے ماڈل کی گاڑی ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی جیسے وہ انہیں رات کے کھانے پر بلانے آیا ہے۔

سلمان نے مڑ کر نوروز وجدانی کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ سلمان اس ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اس کے برابر میں نوروز وجدانی اور ایک دوسرا آدمی بیٹھ گیا۔ دوسری طرف کے دروازے سے ایک اور شخص اندر آ گیا تھا۔ گویا سلمان اور نوروز وجدانی ٹیکسی میں سینڈوچ بن گئے تھے۔

ٹیکسی چلتی رہی چلتی رہی کافی دیر بعد رکی تو سامنے ایک بڑا سا گیٹ تھا۔ لوہے کا گیٹ۔ ڈرائیور نے ہارن دیا۔ گیٹ کھل گیا۔ ٹیکسی اندر داخل ہوگئی۔ اندر پورچ میں کئی شخص

کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں آتشی اسلحہ تھا ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی فلمی سیٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکو کے اڈے کے سیٹ پر۔ ان سب کے چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ دیکھنے سے ہی وہ سب قاتل نظر آ رہے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھیں' عادی نشہ باز واں جیسی۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور انہیں نیچے اترنے کا اشارہ دیا۔

وہ نیچے اترے تو انہیں لانے والے نے کہا۔ ''اندر چلو۔''

اب اس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ وہ شیرینی' وہ حلاوت کافور ہوگئی تھی۔

وہ دونوں پورچ سے برآمدے پر پہنچے۔ پھر وہاں سے دروازے کے اندر۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ ہال میں صرف ایک شخص دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ ان کے داخل ہوتے ہی اس نے اپنا رخ بدلا۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ بچے دیکھیں تو ڈر جائیں۔ شدید بخور سے بھی زیادہ کالی رنگت' چہرے پر کئی لمبے لمبے زخموں کے گہرے نشان۔ اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے نوروز وجدانی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم نے کیا سوچا تھا مجھے دھوکا دے دو گے' میری نظروں سے بچ کر نکل جاؤ گے۔''

''مگر میں نے..... میں نے تو.....''

''کیا میں نے میں نے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اسپتال میں کیا ہوا ہے یہ بھی معلوم ہے۔ مگر رقم تمہیں ہی ادا کرنے کا مشورہ ہے۔'' پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور بولا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔ ایک مہینے کے اندر تمہیں رقم ادا کرنا ہے۔'' پھر یکا یک وہ سلمان کی طرف مڑا اور اس کو مخاطب کر کے بولا۔ ''لڑکے تم ہمارے علاقے میں پہلی بار نظر آئے ہو اور تم نے میرا مرکزی آستان بھی دیکھ لیا اس لیے یاد رکھو میں جسے ایک بار دیکھ لوں تو اسے زندگی بھر یاد رکھتا ہوں۔ تمہیں بھی یاد رکھوں گا۔ اگر آغائی علی رضا نے رقم ادا نہیں کیا تو پاتال سے ہی سہی تمہیں بھی نکال لاؤں گا اور وہ رقم تم سے وصول کروں گا۔''

سلمان چکرا گیا کہ یہ کیا ہو گیا؟ بندر کی بلا طویلے کے سر کیوں آ رہی ہے؟ مگر وہ کچھ نہیں بولا۔

''اے تم لوگ کھڑے کیوں ہو فوراً باہر جاؤ۔ چلو بھاگو۔''

اس شخص کا حکم پاتے ہی وہ تیزی سے باہر آئے۔ سڑک پر پہنچتے ہی انہیں ٹیکسی مل گئی ٹیکسی میں سوار ہوتے ہی سلمان نے پوچھا۔ ''آغائی علی رضا! کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ یہ

کون لوگ تھے اور آپ کی ان سے کیا دشمنی ہے۔''

''بھئی سلمان تم سے کیا پردہ اس بے وقوف زاہد علی آفندی نے میرے نام پر ان لوگوں سے رقم لی تھی پھر جب زاہد علی آفندی کے اور میرے درمیان رسا کشی چلی تو مقدمات کے اخراجات پورے کرنے کے لیے میں نے مزید رقم لے لی۔ کل ملا کر 80,85 لاکھ تومان ہو گئے۔ پھر اس رقم پر ان کا منافع، یعنی کروڑ سے اوپر رقم پہنچ گئی ہے۔''

باتوں میں راستہ طے ہوتا رہا اور بالآخر حویلی تک پہنچ گئے۔ شیریں منتظر تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ سلمان کو دیکھتے ہی اس نے شکر کی سانس لی۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کل ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔'' سلمان نے کہا۔

''اے، یہ کیا بات ہوئی۔ ابھی کچھ دن تو ہماری میزبانی کا لطف لو۔'' نوروز وجدانی نے دخل دیا۔

''نہیں جناب یہاں تو ہر قدم پر ایک نیا ہنگامہ ہے۔ غنڈے آپ کے دشمن، پولیس آپ کی دشمن، خود آپ سزا یافتہ۔ نہیں ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔'' شیریں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

''جانے والے کو زبردستی تو روکا نہیں جا سکتا صرف التماس کیا جا سکتا ہے۔ سو ہم کر رہے ہیں، التجا تو نہ ٹھکراؤ۔'' نوروز وجدانی نے سلمان پر نظر ڈال کر کہا۔

''میں کیا کہوں آپ اور شیریں بحث کر لیں۔'' سلمان جلدی سے بولا تو نوروز وجدانی نے پھر سے اپنا رخ شیریں کی طرف کیا۔

''کیوں شیریں تمہارا کیا خیال ہے، اپنے اس چچا کے پاس تم نہیں رکو گی؟''

''میں رک تو جاتی مگر ہمیں تہران پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' شیریں نے روکھے لہجے میں کہا۔

''بھئی عید میں دو ہی دن باقی ہیں۔ عید کر کے چلی جانا۔''

''عید ہی کی وجہ سے ہم تہران جانا چاہتے ہیں۔'' سلمان لاتعلق سا بیٹھا تھا گویا شیریں کے ہر لفظ سے وہ ہم خیال تھا۔ تبھی نوروز وجدانی نے کہا:

''ٹھیک ہے تو ایسا کرو کہ میرے ایک جاننے والے آ رہے ہیں ان سے مل لو۔''

''میں مل لوں؟ میں کیوں ملوں؟'' شیریں کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یہ تو وہی بتائیں گے۔'' تبھی باہر سے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

''لو وہ آ گئے۔'' کہتے ہوئے نوروز وجدانی کھڑا ہو گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی شیریں کی طرف دیکھ کر سلمان بولا۔

''عجیب پراسرار شخص ہے۔ اس کی باتیں ہر پل الجھا رہی ہیں۔ کبھی یہ مظلوم بن کر سامنے آتا ہے تو کبھی جیل بھگت کر آنے والا اور کبھی شاطر! ابھی تک میں اسے سمجھ ہی نہیں پایا ہوں۔''

تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی اور نوروز وجدانی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ عجیب سا حلیہ، جھنڈولے بال، سرتاپا سبز لباس آنکھیں سرخ انگارہ، جیسے وہ کوئی تیز نشے کا عادی ہو۔ اس نے اندر آ کر ایک نظر شیریں پر ڈالی پھر سلمان سے بولا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''تو کریں۔''

''نہیں یہاں نہیں، باہر چلو۔''

''آپ کو جو کچھ کہنا ہے یہیں کہیں۔''

''تو کیا سب کے سامنے؟'' اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''ہاں کہہ دیں، شیریں سے کیا پردہ!''

''تو سنو! میں تمہیں عرصہ سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ جب تم لوگ بردہ فروش کی قید میں تھے تبھی مجھے تمہارے بارے میں علم ہو گیا تھا کہ تم نے ہمارے علاقے میں قدم رکھ دیا ہے۔''

''تو کیا آپ غیب داں ہیں؟ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟'' سلمان کو حیرت ہوئی کہ بردہ فروش کے بارے میں اسے کیسے معلوم ہو گیا پھر بھی وہ طنز کرنے سے نہ چوکا۔

''ہاں میں علم کشف جانتا ہوں۔ غیب کی اکثر باتوں کو جان لیتا ہوں۔ میری فکر کا عالم پورے صوبہ بیہان میں نہیں ہے۔ میرے علم نے ہی بتایا ہے کہ تم میرے لیے بہت کام کے ثابت ہو گے۔ اگر بردہ فروشوں کا گروہ شکست نہ کھاتا تو میں تمہیں خریدنے والا تھا۔''

''کیوں کیا میرے سر پر ہما کا سایہ ہے۔'' سلمان نے پھر اسی لہجے میں جواب دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس سبز پوش کو خاطر میں ہی نہیں لانا چاہتا۔

''ہما کا سایہ ہی سمجھو، تم پر ایک روح عاشق ہے اور مجھے وہ روح چاہیے۔''

''تو کیا تم فاکیہ کو حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' سلمان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میں اسے قید کرنا چاہتا ہوں مگر وہ بہت طاقتور ہے، وہ مجھے بہ آسانی شکست دے دے گی۔ اس لیے اسے قید کرنے میں تم میری مدد کرو گے۔''

''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟''

''انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں انکار کرتا ہوں۔'' سلمان نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے تم اسی حالت میں بیٹھے رہو۔'' اس نے کہہ کر ہاتھ ہلایا۔ ایسا لگا تھا جیسے اس کے ہاتھوں سے شعائیں سی نکلی ہوں۔ سلمان پتھر کی مورت سا بن کر رہ گیا تھا پھر وہ سبز پوش شیریں کی طرف مڑا۔

''چلو تم میرے ساتھ چلو گی۔''

''کمینے..... تم..... تم مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ میں جان سے مار دوں گی۔ اسے صحیح کرو۔'' کہتے ہوئے شیریں اس پر جھپٹی۔

''تم ایسے نہیں مانو گی۔'' کہتے ہوئے اس نے شیریں پر بھی کچھ پڑھ کر پھونک ماری پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا گیا۔

وہی شیریں جو شیرنی کی طرح گرج رہی تھی۔ جھپٹ رہی تھی ایسے خاموش ہو گئی تھی جیسے اسے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ مکمل طور پر گویا ہپناٹائز ہو گئی تھی۔

❁

ہوش میں آنے کے بعد سلمان نے خود کو کچرے کے ڈھیر پر پایا تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں اسے یہاں لا کر پھینکا گیا تھا۔ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھا اور اب کیا کرے؟ اس پر غور کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تبھی اس کا ہر مسام جاں خوشی سے جھوم اٹھا۔ جانی پہچانی خوشبو اس کے اردگرد پھیل گئی تھی۔

''تم آ گئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے آنا پڑا۔ تمہیں تکلیف میں دیکھ نہیں سکتی ناں۔'' فاکیہ کی آواز آئی۔

''اسی لیے رمضان ختم ہونے سے پہلے ہی آنا پڑا۔''

''تم نے دیکھا، یہ دنیا دھوکے بازوں سے بھری پڑی ہے۔ اس نورروز وجدانی نے جسے

تم نے کئی مصیبتوں سے بچایا اس نے کتنا بڑا دھوکا کیا۔'' فاکیہ نے اس کے ذہن کا رخ بدلنا چاہا۔

''یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے جا کر لڑکی کے بارے میں پتا کرو۔ شیریں میری زندگی ہے۔''

''پہلے ٹھہرنے کی جگہ تو تلاش کرو۔''

''سرائے یہاں ضرور ہو گی۔ وہاں جا کر کمرا کرائے پر لے لیتے ہیں مگر مجھے ہتھیار کی ضرورت ہے۔ میں اس سبز پوش کو جان سے مارنا چاہتا ہوں۔ اس بدذات نورروز وجدانی کو ختم کروں گا۔''

''وہ بھی ہو جائے گا۔ ابھی تم سیدھے نورروز وجدانی کی حویلی پہنچو۔''

''کیوں؟''

''پہلے اس سے نمٹ لو پھر سبز پوش سے نمٹنا۔ اس لیے کہ ہمیشہ پہلے چھوٹے مسئلے کو نمٹانا بہتر ہوتا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' کہہ کر وہ چل پڑا۔ وہ سیدھا نورروز کی حویلی میں جا پہنچا۔

اس وقت سلمان کا قہر و غضب قابل دید تھا۔ وہ نورروز وجدانی کی طرف بڑھا اور اس لحیم شحیم آدمی کو ہاتھ بڑھا کر بڑے اعتماد سے روک لیا پھر بولا۔

''پہلے میرا ارادہ تمہارے قدموں سے یہ زمین پاک کرنے کا تھا لیکن میں نے سوچا کہ تمہیں اپنے اعمال کی سزا بھگت لینی چاہیے۔ تم نے مجھے بے وقوف بنا کر میری دنیا اندھیر کر دی۔ مجھ سے میری زندگی چھین لی۔ شیریں کو اغوا کرا دیا۔ بدلے میں تمہیں اپنی بھتیجی کو دینا ہو گا۔ ایک کے بدلے دونوں کو لے جاؤں گا فرح اور صبا کو۔ تم سمجھتے تھے میں نے اندرون خانہ کی خبر نہیں لی ہے۔ میں نے تمہارے اس نوکر سے پتا کر لیا تھا جو کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے اندر موجود ایک ایک فرد کا حدود اربعہ بتا دیا ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ تمہاری بھتیجی شیریں جیسی خوبصورت ہے۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ دونوں اس وقت تک میرے قبضے میں رہیں گی جب تک شیریں واپس نہیں مل جاتی۔ مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ بقول تمہارے، اس گھر میں آ کر کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔''

''تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' نورروز وجدانی نے دانت پیس کر کہا اور بڑھ کر اپنی بندوق اٹھا لی۔ اس نے تیزی سے نشانہ باندھنا چاہا لیکن ظاہر ہے فاکیہ کی موجودگی میں سلمان پر

کاری وار وہ کس طرح کر سکتا تھا۔

سلمان نے آگے بڑھ کر نوروز وجدانی کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

نوروز وجدانی حیرت زدہ نظروں سے سلمان کا اطمینان اور اعتماد دیکھ رہا تھا۔

سلمان نے ایک بھرپور ضرب بندوق کے کُندے سے نوروز وجدانی کے سر پر لگائی اور یہ کہتا ہوا اندر والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر برآمدے میں پہنچ کر اوپر جانے والی سیڑھی پر رک کر بولا۔ ''نوروز وجدانی میں تمہاری بھتیجیوں کے پاس جا رہا ہوں۔''

نوروز وجدانی کے سر سے خون جاری ہو گیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا مگر وہ سخت جان اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا تھا۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر وہ اس کی خوابگاہ سے باہر آ گیا باہر نکلتے ہی فاکیہ نے سوال کیا۔

''کیا ارادہ ہے؟''

''میں نوروز وجدانی کی دونوں بھتیجیوں میں سے ایک کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں۔'' سلمان نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کی پابند ہوں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' سلمان نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔ ہم آخر یہاں کس لیے آئے تھے۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میری درخواست ہے سلمان! تم لڑکیوں کے سلسلے میں اپنا ارادہ بدل دو۔'' فاکیہ نے دبی آواز میں کہا۔

''میں سمجھتی ہوں اس میں تمہارے لیے کچھ خطرے موجود ہیں، یوں بھی وہ بے چاریاں بے قصور ہیں۔''

''تعجب ہے یہ بات تم کہہ رہی ہو؟ حالانکہ تمہی نے مجھے دشمن سے نمٹنے کے لیے اکسایا تھا۔ کیا تم بھول گئیں کہ میری شیریں کو کس نے اغوا کرایا تھا، کیا شیریں بے گناہ نہیں تھی؟''

''میں تمہارے احساسات سے واقف ہوں۔ مگر مجھے اس کام میں کچھ اچھے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اگر ہم انہیں معاف کرتے ہیں تو بھی نوروز وجدانی سے انتقام لینے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مگر میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی ہیں، کیا نوروز وجدانی کے لیے اس سے

بڑی سزا کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بھتیجیاں میری کنیز بن جائیں۔''

''تم انہیں دیکھ سکتے ہو، وہ اوپر کی منزل پر رہتی ہیں لیکن نوروز وجدانی کو اس سے زیادہ بھیانک سزا مل سکتی ہے ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔'' فاکیہ بولی۔

''ٹھیک ہے..... آؤ اوپری منزل پر چلتے ہیں۔ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ تم ان میں ایک لڑکی کو سنبھال لینا اس طرح ہم اسے آسانی سے یہاں سے لے جائیں گے۔''

''مگر..... مگر'' فاکیہ نے جھجک کا اظہار کیا۔

''مگر کیا فاکیہ..... مجھے وہاں لے چلو، ان حسیناؤں کو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سلمان اوپر منزل کی طرف جانے لگا۔ فاکیہ کے انکار پر سلمان کا جنون اور بڑھ گیا تھا۔ جو بار بار اکسا رہا تھا کہ وہ اس کی تکمیل کرے۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ فاکیہ بولی۔

''ٹھہر جاؤ آگے راستہ بند ہے۔''

''راستہ کہاں بند ہے سامنے نظر آ رہا ہے۔ کیا یہ تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' سلمان نے برہمی سے کہا اور ایک دو سیڑھیاں اور پار کر لیں۔

''رک جاؤ۔'' ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز سنائی دی۔ سلمان نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

''کون ہے؟ یہ آواز کس کی ہے۔'' سلمان نے جز بز ہو کر پوچھا۔

''چلو سلمان واپس چلتے ہیں۔'' فاکیہ نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں تم مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں ہو؟''

''ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ آگے ایک رُکاوٹ ہے۔''

''وہ رُکاوٹ دور بھی ہو سکتی ہے۔''

''ہاں، یہ راستہ کھل سکتا ہے مگر تمہارے لیے بہتر نہ ہوگا۔'' فاکیہ نے کہا۔

''تم کیسی بھول بھلیوں والی باتیں کر رہی ہو۔'' سلمان نے ناراضی سے کہا۔

تبھی اوپر کی سیڑھیوں پر اسے ایک سایہ نظر آیا، ایک مرد کا سایہ..... جو ایک لمحے میں ایک شکیل و وجیہہ مرد کی صورت میں واضح ہو گیا۔ اس کے انداز میں شاہانہ جلال تھا اور وہ کوئی قدیم لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ اتنا پُروقار اور خوبصورت تھا کہ اس پر کسی شہزادے کا گمان ہوتا تھا جیسے کتابوں میں کسی شہزادے کا حلیہ ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر سلمان ٹھٹکا لیکن.....

دوسرے ہی لمحے اس کے اندر کا ضدی آدمی جاگ اٹھا۔ اس نے اوپر کی ایک اور سیڑھی پھلانگ لی۔

''رک جائیے۔'' اس نے نہایت مہذب لہجے میں کہا۔

''میں اوپر جانا چاہتا ہوں۔'' سلمان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آپ اوپر نہیں جاسکتے۔ ادھر زنان خانہ ہے۔'' اس کی شیریں زبانی نے سلمان کو متاثر کیا۔

''میں زنان خانے میں جانا چاہتا ہوں۔ میرے راستے سے ہٹ جائیے۔'' سلمان نے سختی سے کہا۔

''ہم یہاں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ آپ میری موجودگی میں اندر نہیں جاسکتے۔'' اس نے کہا۔

''آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ میں ایک ذلیل شخص کو اس کے کرتوت کا مزہ چکھانے آیا ہوں۔ میرے راستے سے ہٹ جائیے۔''

''نوروز وجدانی سے آپ جو چاہیں انتقام لے سکتے ہیں مگر اس کی بھتیجیاں بے قصور ہیں اور پھر ہم ان کے نگہبان ہیں، ہم ایک عرصے سے یہاں رہتے ہیں۔''

''آپ کون ہیں؟'' سلمان نے اس سے متاثر ہو کر پوچھا۔

''ہم بچیوں کے امین ہیں، ہمارا سایہ ان پر موجود ہے ہم آپ کے کسی معاملے میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے لیکن یہاں ہم آپ کے راستے میں حرج ہوں گے۔ بہتر ہے آپ چلے جائیں۔''

''ورنہ پھر آپ کیا کریں گے۔'' سلمان نے درشتی سے پوچھا۔

''ہمیں معلوم ہے کہ آپ بھی تنہا نہیں ہیں مگر ہم مزاحمت کریں گے ممکن ہے آپ کو اس سے نقصان پہنچے۔ ممکن ہے ہمیں اپنے رفیقوں کو بلانا پڑے۔'' اس نے بے جھجک ہو کر کہا۔

''یہ کون ہے؟'' سلمان نے فاکیہ سے پوچھا۔

وہ ایک ثانیے کے لیے خاموش ہوگئی پھر کہنے لگی۔ ''سلمان یہاں سے چلے جاؤ نوروز وجدانی کی حویلی ایک قدیم حویلی ہے۔ زنان خانے کے اس حصے پر جہاں اس کی بھتیجیاں رہتی ہیں وہاں اس جن کا تسلط ہے۔ تم اس کی موجودگی میں وہاں نہیں جاسکتے۔''

''جن؟'' سلمان نے حیرت سے کہا۔ ''کیا یہ واقعی نوجوان شخص کوئی جن ہے، مگر تم

کس مرض کی دوا ہو؟ کیا تم اسے زیر نہیں کرسکتیں۔''

''تمہیں چاہئے کہ مجھے ایسے حالات میں نہ ڈالو جہاں خود مجھے کسی آزمائش میں پڑنے کا احتمال ہو۔ ماورائی قوتیں آپس میں اس طرح کی چپقلش سے گریز کرتی ہیں۔ پھر ہوسکتا ہے کہ اس جن کا ایک پرایہاں موجود ہو، ہمیں کچھ اور کرنا پڑے گا۔ کوئی اور ترکیب سوچنی ہوگی۔ یہ جن پورے طور پر اپنے قدموں پر جما ہوا ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔'' فاکیہ نے اضطراب سے کہا۔

''آپ جانتے ہیں نوروز وجدانی نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟'' سلمان نے اس نوجوان کو مخاطب کیا جو مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ بچیاں بالکل سادہ و معصوم ہیں۔''

''شیریں بھی سادہ و معصوم تھی، نوروز وجدانی نے سے اغوا کرایا تھا۔'' سلمان نے زچ ہو کر کہا۔

''لیکن ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہمارا مسکن یہاں ہے۔''

''کیا آپ یہ نکتہ سمجھ رہے ہیں کہ میں عام لوگوں سے مختلف شخص ہوں۔''

''ہمیں معلوم ہے، اسی لیے آپ سے درخواست کر رہے ہیں۔''

''مگر میں آپ سے ایک بات کہہ دوں۔ اس وقت تو میں چلا جاتا ہوں لیکن میں اپنے عہد کی تکمیل کے لیے بے قرار رہوں گا۔''

''جب تک ہم حویلی کے اس حصے میں موجود ہیں۔ ہم مزاحم ہوتے رہیں گے۔''

''بہتر ہے کہ آپ راستے سے ہٹ جائیں، جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں میرے پاس اس سے زیادہ ہے۔''

''نہیں یہ ممکن نہیں۔''

''شاید آپ غلطی کر رہے ہیں۔ آپ اس شخص سے مخاطب ہیں جو برسوں سے انہی ہنگاموں کا عادی ہے یقین کیجیے کہ آپ کے مخاطب نے ان ہنگاموں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' سلمان نے زور دے کر کہا۔

''لیکن آپ کی آنکھوں پر ایک غلاف چڑھا ہوا ہے۔''

''لیکن یہ ایک چیلنج، یہ ایک دھمکی ہے، مجھے دھمکیاں پسند نہیں ہیں، میں دوبارہ آؤں گا۔'' سلمان نے تلملا کر کہا۔

''ہم آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے غائب ہوگیا۔ سلمان نے پھر اوپر چڑھنا چاہا لیکن فاکیہ نے بڑی سختی سے روک دیا بہت بے بسی کی حالت میں سلمان کو نیچے آنا پڑا۔ یہاں شور ہورہا تھا۔ سلمان خواب گاہ سے بچتا بچاتا فاکیہ پر پیچ وتاب کھاتا حویلی سے باہر آنے میں کامیاب ہوگیا۔ راستے میں فاکیہ خاموش رہی۔ سلمان نے بھی اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ وہ سرائے جاکر بستر پر دراز ہوگیا اور جب اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تو فاکیہ نے سرگوشی کی۔

''سلمان تم نے اچھا کیا جو وہاں سے چلے آئے۔''

سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کہنے لگی۔ ''تمہاری بے قرار دل کو سکون پہنچانے کے لیے ابھی نوروز وجدانی باقی ہے۔ ہمارے لیے کسی طور یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم ایسے وقت میں جنات سے کوئی جھگڑا مول لیتے۔ ان جنات میں بعض بہت پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں رہتے ہیں وہاں کے مکینوں کے محافظ بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے آفت جاں بھی۔ یہ جن نوروز وجدانی کی بھتیجیوں سے شدید وابستگی رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی طاقت بروئے کار لاتا۔ ہم ایک معمولی کام کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔''

''مگر میں ہر حالت میں اپنے عہد کی تکمیل چاہتا ہوں۔'' سلمان نے غصے سے کہا۔

''میں نے اس پر خوب سوچا ہے، نوروز وجدانی کا زوال قریب ہے، تم اسے یہاں کی سڑکوں پر رسوا ہوتے ہوئے دیکھ لینا۔'' فاکیہ نے کہا۔

''کیا ہم نوروز وجدانی کی حویلی نہیں خرید سکتے۔'' اچانک سلمان کے ذہن میں یہ خیال آیا۔

''حویلی ہم نوروز وجدانی کی خرید سکتے ہیں مگر یہ کام چٹکی بجاتے نہیں ہوسکتا اس کے لیے ہمیں ایک طویل راستے سے چلنا ہوگا۔''

فاکیہ نے سلمان کو تفصیل سے نوروز وجدانی کی عادتوں کے متعلق بتانا شروع کیا۔ سلمان کا اس جن کی موجودگی سے سارا منصوبہ بگڑ گیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ جب نوروز وجدانی کو ہوش آیا ہوگا تو اس نے اپنی چوٹ کے متعلق یقیناً اس کا نام لیا ہوگا۔ سلمان کو احساس ہوا جیسے

آنے والی صبح پولیس سرائے کے دروازے پر موجود ہوسکتی ہے۔ اس نے فاکیہ سے اپنے اس خدشے کا ذکر کیا تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ نوروز وجدانی سلمان کا حویلی میں اس طرح دیدہ دلیری سے دندناتے ہوئے گھس جانے کے باعث اب محتاط ہوگیا ہوگا۔ وہ خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینے سے گریز کرے گا۔ نوروز وجدانی اس بات سے واقف ہے کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ وہ تمہیں عمر قید نہیں کرا سکتا۔ جیل میں بھیجے گا تو بہت سی باتیں کھل کر سامنے آئیں گی اور پھر رہا ہونے کے بعد تم پہلے سے زیادہ مشتعل ہوگے۔''

سلمان فاکیہ کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن ایک عجیب الجھن سی ذہن و دل پر طاری تھی۔ اس سے جن کی تادیب کی خواہش بھی دل میں ابھر رہی تھی۔ وہ دونوں آدھی رات تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور جب کسی ایک نتیجے پر پہنچ گئے اسے نیند آگئی۔

اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا نوروز وجدانی پریشان، گریباں چاک، حواس باختہ باہر نکل رہا ہے۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے دو نوکر بھی تھے، جو غالباً اس کی مجنونانہ حالت سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے آگئے تھے۔ سڑک پر نوروز وجدانی نے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کردیا۔ وہ اپنے جرائم کا اعتراف اپنے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کے سامنے کر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

''لوگوں میں خود کو ختم کر رہا ہوں۔ میں نے متعدد بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ میں ایک مجرم ہوں۔ میرا نامہ اعمال سیاہ ہے۔ لاوارث بچوں کی کراہوں، معصوم لڑکیوں کی آہوں اور بے سہارا عورتوں کی فریادوں نے آج مجھے دیوانہ کردیا ہے۔ میں تمہارے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے سزا تجویز کرلی ہے میں مر رہا ہو دیکھو..... یارو میں مر رہا ہوں۔ تم گواہ رہنا دوستو! میں اپنے ضمیر کا فیصلہ تسلیم کرتا ہوں۔''

راہ گیروں کی اچھی خاصی تعداد ہکا بکا کھڑی سراسیمہ نظروں سے نوروز وجدانی کو گھور رہی تھی۔ دونوں نوکر بھی دم بخود کھڑے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی حالات کا اندازہ کرسکتا۔ نوروز وجدانی نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھی اور لبلبی دبا دی۔ فضا میں ایک دھماکے کی آواز گونجی اور نوروز وجدانی خون میں لت پت ہوکر سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔

تھوڑی دیر تک اس کی لاش تڑپتی رہی۔ نوروز وجدانی کیفر کردار کو پہنچ گیا تھا۔ اسے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوا بلکہ ایک سکون سا محسوس ہوا۔

ابھی وہ اس منظر کے سحر میں گرفتار ہی تھا کہ فاکیہ نے اسے بیدار کر دیا۔ گویا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

''مجھے خوشی ہے سلمان کہ تم نے اس بار دور اندیشی سے کام لیا۔'' فاکیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم حویلی کے اندر کوئی جذباتی قدم اٹھاتے تو حالات مختلف ہوتے۔ اب نوروز وجدانی کے سلسلے میں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

سلمان نے ایک پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر فاکیہ کو دیکھا۔

جب سے سو کر اٹھا تھا اسے مسلسل نوروز وجدانی کی یاد آ رہی تھی۔

رات کا خواب اور باتیں یاد آئیں تو اس نے سوچا کہ آج جا کر وہ اس سے ہر حال میں انتقام لے گا۔ اتنی سزا اس کے لیے کافی ہے اب اسے مزید جینے کی مہلت دینا بے کار ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس جھوٹے، مکار شخص کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی وہ اس کی بھتیجیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ تو پھر دیر کس بات کی۔ اسے فوراً موت کی گود میں پہنچا دینا چاہئے۔ مگر اسے موت دینے سے پہلے وہ شیریں کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فاکیہ سے کہا۔ ''فاکیہ نوروز وجدانی کی موت سے کچھ لطف نہیں آیا۔''

''کیا مطلب!'' فاکیہ نے دیدے پھاڑ کر کہا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

تب اسے یاد آیا کہ وہ تو خواب تھا۔ نوروز وجدانی مرا کب ہے۔ تب اس نے بات بنائی۔

''موت ہی تو انتقام نہیں ہے یہ تو بہت آسان اور ہلکا سا نسخہ ہے۔ لمحوں میں اذیت ختم ہو جاتی ہے۔ موت تو آدمی کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ خود اپنی نظروں سے گر جائے۔ جب اس معاشرے میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ رہے، وہ اپنی زندگی میں رسوائیوں کا مزہ چکھے۔ میرا خیال ہے نوروز وجدانی کو ہم سستا نہیں چھوڑیں گے۔'' سلمان نے بیزاری سے کہا۔

''تم بہت دلچسپ باتیں کر رہے ہو چلو تمہیں بولنا تو آیا۔'' فاکیہ نے چہک کر کہا۔

سلمان نے نوروز وجدانی سے اس وقت مڈبھیڑ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دن دہاڑے نوروز وجدانی کے گھر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ یہ کام رات ہی میں ہو سکتا تھا۔

رات تک کا وقفہ گزارنا مشکل ہو گیا، سر پر خون سوار تھا۔ جیسے تیسے رات آئی اور سلمان نوروز وجدانی کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ نوروز وجدانی نے شیریں کو اغوا کرایا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اسی فکر میں وہ ہلکان تھا۔ سلمان، کو شیریں جتنا یاد آ رہی

تھی وہ نوروز وجدانی سے اتنا ہی متنفر ہوتا جا رہا تھا۔

نوروز وجدانی کی حویلی قریب آتی گئی اور اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ نفرت کا جذبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اسے فاکیہ نے بتا دیا تھا کہ نوروز وجدانی اندر مست مئے ناب ہے اور عیش و نشاط میں مصروف ہے۔ سلمان نے عقبی راستہ اختیار کیا۔ اسے ایوان خاص تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس کے ذہن میں گزرے ہوئے لمحات ابھر رہے تھے۔ اندر اندر سلگنے والی چنگاریاں جذبات مشتعل کر رہی تھیں۔ خواب گاہ کا دروازہ بند تھا لیکن وہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ راستے میں ایک ملازم نے اسے دیکھ کر شور مچانا شروع کیا لیکن فاکیہ نے بروقت اسے دوسری جانب روانہ کر دیا۔

سلمان جب اس روشن کمرے میں داخل ہوا تو نوروز وجدانی کی آغوش میں ایک بجلی تڑپ رہی تھی اور ناز و ادا کے نشتر آزما رہی تھی۔ نوروز وجدانی کا بھاری بھرکم تن و توش اس گل بدن کے غمزوں سے ادھر ادھر تھرک رہا تھا۔ سامنے صراحی رکھی تھی۔ وہ مدہوش سا تھا۔ نیم عریاں لڑکی کا آدھا بدن نوروز وجدانی کی گود میں سما سا جاتا اور نکل نکل جاتا۔ ان دونوں میں دلچسپ نوک جھونک جاری تھی۔ بس وہی نوک جھونک جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہے۔ سامنے ٹیبل پر گراموفون رکھا ہوا تھا۔ اس گراموفون سے حبہ خانم کا گایا نغمہ بکھر رہا تھا۔ اس نغمے میں ایسا سحر تھا کہ رگوں میں نشہ سا طاری ہونے لگتا تھا اور سننے والا مدہوش سا ہونے لگتا۔ پورے ایران میں ایسی کوئی اور گلوکارہ نہیں تھی۔ نوروز وجدانی پر بھی اس نغمے کا اثر تھا۔ وہ مدہوش سا ہو رہا تھا۔

اسے اس طرح مدہوش دیکھ کر سلمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے للکارا

''نوروز وجدانی!''

وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ نوروز وجدانی کی نظر سلمان پر پڑی تو وہ کسی زہریلے ناگ کی طرح بل کھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''تم..... تم ابھی تک یہاں موجود ہو؟''

''ہاں نوروز! سلمان۔ آپ کا خادم ابھی تک یہیں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔'' اس نے نیازمندی سے کہا۔ ''طبع شاہانہ پر میری آمد گراں تو نہیں گزری؟''

''بدبخت..... اب یہاں کیا لینے آیا ہے؟'' نوروز وجدانی نے تمکنت سے کہا۔

''ناراض نہ ہوں' میں مبارک باد دینے کی غرض سے آیا ہوں، آپ کا اقبال بلند رہے۔'' سلمان نے عجز سے کہا۔

''سلمان..... تم جس راستے سے آئے ہو اسی سے واپس چلے جاؤ۔'' نوروز وجدانی کے لہجے میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ ''تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔''

''ورنہ پھر آغائی کیا سزا تجویز کریں گے؟'' سلمان نے مسکرا کر پوچھا۔

''پھر..... پھر..... ہم تو تم جیسے حرام زادوں کو کتے کے آگے ڈال دیتے ہیں۔'' نوروز وجدانی نے اس لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا جو سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

''آزمالو!''

''اچھا!'' اس نے دبنگ لہجے میں جملہ ادا کیا۔

''تم مجھے جانتے ہو۔ پھر ایسے لہجے میں کیوں باتیں کر رہے ہو؟'' سلمان نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔

''غصہ نہ کریں، بلڈ پریشر بڑھ سکتا ہے۔'' لڑکی نے نوروز سے کہا۔

''سلمان ہم تیرا خون پی جائیں گے اپنی زبان کو لگام دے۔ ہم تجھے اسی وقت جہنم رسید کریں گے۔'' نوروز وجدانی غصے سے دیوانہ ہو گیا۔

''اس نے آپ کو صحیح مشورہ دیا ہے۔'' سلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تمہاری موت تمہیں کھینچ کر لائی ہے۔'' کہہ کر اس نے بیڈ سے چلانگ لگائی۔ سلمان نے سمجھا تھا کہ وہ اس پر آپڑے گا اسی لیے وہ کچھ پیچھے ہٹا تھا مگر نوروز وجدانی اندر کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

سلمان اس کے پیچھے بھاگا۔ ابھی اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی نادیدہ دیوار سے وہ ٹکرا گیا ہو۔ وہ دیوار یکا یک ہی درمیان میں آ گئی تھی۔ سلمان نے حیرت سے سامنے دیکھا مگر سامنے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھر آگے بڑھا مگر پھر اسے دھکا لگا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سیڑھیوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی اسے وہ بیولا نظر آ گیا۔ یہ وہی کل والا جن زادہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں قہر تھا۔ غصے کی لالی تھی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کل ہی تمہیں سمجھا دیا تھا کہ تم حویلی کے اس حصے میں نہیں آؤ گے مگر آج پھر گھسے چلے آئے۔ واپس چلے جاؤ ورنہ کل کی طرح عزت سے نہیں' تماشہ بنا کر باہر پھینکوں گا۔''

''وہ ادھر آیا اس لیے مجھے آنا پڑا۔'' فاکیہ کو نا پا کر وہ کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔

''یہ گھر اس کے والدین کا ہے۔ اس نابکار کو ہم آنے سے روک نہیں سکتے۔ اس مجبوری کا وہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر تمہیں باہر پھینکنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی اس لیے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

سلمان نے اپنے آس پاس امداد طلب نظروں سے دیکھا مگر فاکیہ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بحالت مجبوری وہ مڑ گیا۔ اسے شک ہو گیا کہ نوروز وجدانی جان بوجھ کر اس طرف بھاگا ہے۔ شاید وہ بھی واقف ہے کہ ادھر اس کا کوئی مددگار ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ اسی نے تو اس سبز پوش کو بلوایا تھا۔ یقیناً اسے بھی پراسرار علوم پر دسترس ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے تو بھی یہ دوسرے عاملوں سے مدد لیتا ہو گا۔

وہ باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے سرائے کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اس چھوٹے سے شہر میں وہ خود کو جال میں پھنستا محسوس کرنے لگا تھا۔

❁

وہ سرائے کے اس کمرے میں لیٹا شیریں کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ وہ بدقسمت نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اس کی قسمت میں سکھ کا لمحہ ہی نہیں ہے۔ زندگی بھر ماں باپ کے گھر میں کسم پرسی بھری زندگی گزاری اب وہ نئی زندگی کی امید پر باہر نکلی تو حادثات نے اسے گھیرنا شروع کر دیا پہلے برزہ فروشوں نے پکڑا اب یہ سبز پوش لے گیا۔ واقعی کچھ لوگ بڑے بدقسمت ہوتے ہیں۔ انہیں خوشیاں راس ہی نہیں آتیں۔ قسمت انہیں لولی پاپ دیکھا دیکھا کر لوٹ لیتی ہے۔ سسکتی زندگی ہی ان کا مقدر ہے۔ ''مگر اس بار وہ میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے ہی اسے آزاد کرانا ہے۔ لگتا ہے فاکیہ بھی اس جن زادے سے ڈر گئی ہے اسی لیے مجھے چھوڑ کر بھاگ لی۔''

فاکیہ کا نام لیتے ہی فاکیہ حاضر ہو گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی۔ وہ بولی ''آج میں تمہاری وجہ سے ایک بڑی مصیبت میں پھنس جاتی وہ تو عین وقت پر مجھے احساس ہو گیا کہ خطرہ سر پر آ گیا ہے اور میں اپنی جان بچا کر بھاگ اٹھی۔''

''گویا مجھے مصیبت میں دھکیل گئی تھیں۔''

''نہیں مجھے معلوم تھا کہ تم بھی خطرے کا احساس کرتے ہی چپ چاپ نکل آؤ گے اور

وہی ہوا۔''

''آخر ہوا کیا تھا؟''

''اس جن زادے کے احباب چاروں طرف سے اس حویلی کو گھیر رہے تھے۔ان کا نشانہ میں تھی۔وہ جانتے ہیں کہ میرے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے اسی لیے.....''

''ٹھیک ہے' تم خوش رہو۔اب جو کچھ بھی کرنا ہے میں اکیلے کروں گا۔'' سلمان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ارے ارے تم تو غصے میں آ گئے.....دیکھو' عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ خطرے سے دور رہا جائے۔ویسے خوش ہو جاؤ کہ کل نوروز وجدانی ہوٹل صنم میں رات گزارے گا۔وہاں اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔'' فاکیہ نے چہکارنے کے انداز میں بتایا۔

❁

جس وقت وہ ہوٹل پہنچا تو ہال روم میں خوب رش تھا مگر لفٹ سے اوپر آیا تو گلیارا سنسان پڑا تھا۔اس وقت کوئی بھی سامنے نظر نہیں آیا اور وہ سیدھے نوروز وجدانی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔روم نمبر فاکیہ نے بتا دیا تھا مگر خود کہیں چلی گئی تھی۔وہ نمبر دیکھتا ہوا اس کمرے تک پہنچا اور روم میں داخل ہو گیا۔تبھی باہر کچھ شور سا سنائی دیا۔ایسا لگا جیسے کوئی آوازیں لگا رہا ہے مگر اس نے توجہ نہیں دی۔آگے بڑھتا چلا گیا۔دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ بیڈ پر کوئی لیٹا ہے وہ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔بیڈ پر وہی لڑکی نظر آ رہی تھی۔جو رات میں نوروز وجدانی کے ساتھ تھی مگر اس کی حالت دیکھ کر سلمان پر سکتہ چھا گیا۔

لڑکی نیم عریاں حالت میں بیڈ پر بے دم پڑی تھی،اس کے سینے کے دونوں طرف کا گوشت غائب ہو چکا تھا۔پیٹ درمیان سے چاک تھا۔چہرہ لہولہان تھا۔آنکھوں کے دونوں حلقوں سے خون ابل رہا تھا۔گال پر جگہ جگہ خراشیں موجود تھیں۔

اسے نزاکت کا احساس ہو گیا تو اس نے فاکیہ کو ذہنی طور پر آواز دی۔

''تمہیں دیر نہیں لگنی چاہئے۔فوراً آنا ہوگا۔''

پھر اس نے جھری سے جھانک کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔یہ دیکھ کر اسے پسینہ آ گیا کہ باہر ایک ہجوم جمع ہو رہا تھا۔پتا نہیں کہاں سے لوگ امنڈ پڑے تھے۔وہ سب دروازے پر جمع تھے۔گویا پولیس بھی پہنچنے والی ہوگی۔باہر نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔اسے غصہ آنے لگا اس

وقت تک فاکیہ کیوں نہیں آئی۔

اس کے لیے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔موقع غنیمت سمجھ کر نوروز وجدانی اپنا کام کر گیا تھا یا پھر فاکیہ نے ہی اسے پھنسا دیا تھا۔اس سے بعید بھی نہیں تھا۔

وہ عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔اس کے اردگرد خطرے کے دائرے تنگ ہوتے جا رہے تھے اس نے سوچا فرار کے لیے کیوں نہ کھڑکی کا راستہ آزمایا جائے۔وہ تیزی سے پلٹ کر پچھلی کھڑکی پر پہنچا تو وہاں بھی نیچے سے لوگوں کی چیخ وپکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔اس وقت نیچے ہزاروں کا مجمع موجود تھا۔'اگر میں فاکیہ کے ذریعے نکل بھی جاتا تو بھی انصاف اور قانون کی ساری مشینری حرکت میں آ جاتی۔'اس نے سوچا۔

حالات نے بہت تیزی سے سنگین صورت حال اختیار کر لی تھی۔فاکیہ پہنچی نہیں،وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہوتی تو میں کیا کرتا۔اس اتنے بڑے ہجوم میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا آسان ہوتا؟ مجمع میں سے کس طرح میرا جسم نکلتا ؟اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ابھی وہ کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیرونی سیڑھیوں پر متعدد قدموں کی آہٹیں ابھریں اور پھر کسی نے زور وشور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔سلمان کے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔

''دروازہ کھول دو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔پولیس چاروں طرف سے تمہیں گھیر چکی ہے۔افسر اعلیٰ ناظم زادہ بول رہا ہوں۔'' باہر سے کسی نے کرخت آواز میں کہا۔

سلمان پلٹ کر دروازے پر پہنچا۔جھری سے جھانک کر دیکھا کہ اس طرف بھی مسلح پولیس کا ہجوم اس کی گھات میں تھا۔نیچے پتلی گلی میں بھی لاتعداد افراد اکٹھا تھے۔'کیا میں دروازہ کھول دوں؟' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔مگر اس طرح پولیس اور بیانات اور سزا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جائے گا۔تو پھر میں کیا کروں؟ کیا میں خاموش رہوں۔ہاں مجھے خاموش رہنا چاہئے۔فاکیہ کا انتظار کرنا چاہئے۔

وہ پھر بیرونی کمرے میں آ گیا۔سامنے والے دروازے پر پھر ایک کرخت آواز ابھری۔

''آغائی! میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔دروازہ کھول دو،اور خود کو ہمارے حوالے کر دو،اگر تم نے مقابلے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دیے جاؤ گے۔میں تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔''

سلمان نے فاکیہ کو یاد کیا۔ پولیس کی ایک اور وارننگ سلمان کو مل گئی تھی اور پھر یکے بعد دیگرے اعلانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فاکیہ ابھی تک غائب تھی۔ سلمان بہت پریشان تھا۔ اس نے فاکیہ کو آواز دی کہ وہ جہاں بھی ہو فوراً آجائے۔

ابھی سلمان کا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ بیرونی دروازہ چرچرانے لگا۔ اس کی وحشت حد سے سوا ہوگئی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا اور زور سے فاکیہ کو آواز دی۔ وہ لوگ بیرونی دروازہ توڑ کر اندر آگئے تھے۔ سلمان دوسرے کمرے میں بند ہوگیا تھا۔

باہر ایک شور برپا تھا۔ گلیارا تماش بینوں سے بھر چکا تھا۔ دونوں دروازے بند تھے اور سلمان کسی غیبی مدد کا منتظر تھا اور اس انتظار میں کہ شاید فاکیہ آجائے۔

اسے کچھ وقت لینا تھا، کچھ مہلت چاہیے تھی۔ اس نے جھلا کر فاکیہ کو پھر آوازیں دیں۔ بیرونی کمرے میں ابھرنے والی وزنی قدموں کی آوازیں دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ پولیس کے سنگین بردار سپاہی اور افسران دروازہ توڑ کر اندر آچکے تھے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ جاں گسل تھا فاکیہ اس خطرناک موقع پر نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ فاکیہ جواب اس کے تصرف میں تھی، اس نازک موقع پر وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔ سلمان نے دل کی تمام گہرائیوں سے اسے پکارا۔ فاکیہ مجھے اس وقت تمہاری ضرورت ہے تمام کام چھوڑ کر آجاؤ، میری مدد کرو۔ مگر سلمان کی آواز حلق کے اندر گھٹ کر رہ گئی۔ اسی لمحے باہر سے ایک کرخت آواز ابھری۔

''اب تمہارے لیے بچ نکلنا محال ہے۔ قانون کی نظروں سے بھاگ کر تم کہیں نہ جاسکو گے خیریت چاہتے ہو تو دروازہ کھول دو ورنہ ہم اسے بھی توڑ دیں گے۔'' وہی آواز پھر سنائی دی۔

اس کے دل میں آیا کہ اسے کوئی منہ توڑ جواب دے کیونکہ وہ ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔ وہ فاکیہ کے بھروسے پر تھا پر وہ بھی سلمان سے دور تھی۔

سلمان نے دروازے کی جھری سے باہر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پولیس کے آدمی ان لوگوں کو سامنے سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو اندر آگئے تھے۔

وہ چاروں طرف سے پھنس گیا تھا۔ تلملانے اور اپنے اوپر لعنت بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے جھرجھری آگئی۔ اس نے جھری سے نگاہیں ہٹالیں اور پھر کمرے کے اندر اپنے

چھپنے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔

یہ ایک مربع کمرا تھا۔ قدیم طرز کے فرنیچر سے آراستہ، ایک شان دار مسہری۔ وہ اس کے نیچے چھپ سکتا تھا۔ الماریاں ملبوسات سے بھری پڑی تھیں۔ بار بار احمقانہ ترکیبیں اس کی ذہن میں آتیں وہ جھنجلا کر انہیں مسترد کر دیتا۔ پولیس والے اب دروازہ پیٹنے لگے تھے۔ یکا یک ایک شور بلند ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مجمع میں کوئی شخص چیختا چنگھاڑتا آگے بڑھ رہا ہو۔ یہ آواز سلمان کو مانوس سی معلوم ہوئی۔ اس نے ایک کرسی قریب کر کے دروازے کے اوپری حصے سے جھانکنے کی کوشش کی اور اس پر حیرتیں ٹوٹ پڑیں، وہ صرف ایک دائرے میں دیکھ سکا تھا پھر بھی وہ اسے نظر آگیا تھا۔ وہ مردود اور ملعون شخص وہی تھا جو اس دن سبز کپڑے میں ملبوس تھا۔ وہ کمرے میں موجود ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

''مجھے راستہ دو۔ مجھے راستہ دو۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

لوگ حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنے لگے۔

''تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئے؟'' افسر اعلیٰ ناظم زادہ نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

''شاید تم غلط جگہ آگئے ہو۔''

''ہٹو۔ مجھے راستہ دو۔ میں ٹھیک وقت اور ٹھیک جگہ آیا ہوں۔ وہ تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں ایک عرصے بعد مجھے اس کا موقع ملا ہے۔ میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارا واسطہ کتنے بڑے شیطان سے پڑا ہے۔'' اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟'' ناظم زادہ نے نخوت سے پوچھا۔

''میں کسے نہیں جانتا۔'' اس نے لہرا کر کہا۔ ''وقت کم ہے، دیر نہ کرو۔ باقی باتیں بعد میں پوچھنا۔ وہ بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے، اس وقت اس کی مددگار بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ موقع غنیمت ہے، وہ اندر موجود ہے۔ دروازہ توڑ دو۔ اندر داخل ہو جاؤ۔'' اس سبز پوش نے جیسے حکم دیا۔

''وہ اندر موجود ہے مگر تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟'' افسر اعلیٰ نے تشویش سے پوچھا۔

''میری اس کی پرانی دوستی ہے۔ آج میں دوستی کا حق نبھانے آیا ہوں۔'' سبز پوش نے طنز سے جواب دیا۔ ''ٹھہرو! دروازہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آؤ میں اسے کھولتا ہوں۔ میں

اسے ابھی کھولے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور بدبدانے لگا۔

پولیس کے لوگ سراسیمہ اور متوحش نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے، وہ بڑے متذبذب نظر آرہے تھے۔ کہ آیا سبز پوش کی باتوں کا یقین کرلیں یا اسے عام لوگوں کی طرح دھتکار کر نیچے بھیج دیں۔ مجمع پر سکوت طاری ہو چکا تھا۔ سبز پوش پورے انہماک سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ سلمان کو یقین تھا کہ دروازہ لمحوں میں کھل جائے گا۔

وہ خود کو محفوظ کرنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر فاکیہ پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ وہ بڑے انہماک سے اسے پکار رہا تھا مگر وہ آ کر نہ دی۔ خطرہ لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جارہا تھا۔ کسی بھی وقت دورازہ کھل سکتا تھا۔ سبز پوش یقیناً بہت پہنچا ہوا عامل تھا جبھی اس نے پولیس والوں کو روک دیا تھا۔ سلمان سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ نچلی منزل ہوتی تو کھڑکی سے کود جاتا مگر یہاں سے کودنا خودکشی کے مترادف تھا تبھی دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔ آگے آگے سبز پوش تھا اور اس کے پیچھے پولیس والے۔ ابھی وہ پہلے کمرے میں تھے۔ کسی بھی وقت وہ اس کمرے میں آسکتے تھے۔ سلمان روشن دان میں لگے شیشے میں ان سب کا عکس دیکھ رہا تھا کہ اس کا کانپتا ہوا دل خوشی سے سرشار ہوگا۔ وہی جانی پہچانی خوشبو اسے محسوس ہورہی تھی گویا فاکیہ بروقت پہنچ گئی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''ہلنا مت۔ اسی طرح کھڑے رہو، میں انہیں روکنے کی کوشش کرتی ہوں مگر یہاں میرے لیے بھی خطرہ ہے۔''

سلمان اپنی جگہ سکڑ کر کھڑا تھا کہ سبز پوش اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پولیس والے بھی تھے۔ اس نے سلمان کی طرف اشارہ کرکے پولیس والوں سے کہا۔ ''وہ رہا، پکڑلو۔''

''کہاں ہے؟'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔

''یہ اتنا بڑا لمبا تڑنگا آدمی تمہیں نظر نہیں آرہا ہے؟ وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہے۔'' سبز پوش نے کہا۔ اب سلمان سمجھ چکا تھا کہ سبز پوش کے علاوہ وہ کسی کو نظر نہیں آرہا ہے۔ فاکیہ نے شاید کوئی عمل کیا ہے۔ کیونکہ پولیس والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سلمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ انہیں نظر نہیں آرہا تھا تبھی سبز پوش نے کہا۔ ''تم لوگ گولیاں چلاؤ ورنہ یہ نکل جائے گا۔ میری انگلی کی سیدھ میں چلاؤ۔''

اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ فاکیہ چیل کی طرح جھپٹی اور سلمان کو اٹھا کر کھڑکی سے پرواز کرگئی۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ بس اسے عجیب سے گدگدی محسوس ہورہی تھی۔

فاکیہ زمین پر اتر آئی پھر بولی۔ ''یہ کام بہت دشوار تھا اسی لیے بھٹکتی روحیں کسی ٹھوس چیز کو لے کر آسمان پر نہیں اڑتیں۔''

''اس جنگل میں نہ اترتیں کسی شہری علاقے میں اترتیں۔'' سلمان بولا۔

''یہاں تک آنے میں ہی میرا حال برا ہوگیا ہے اور تم کہہ رہے ہو، مزید آگے چلی جاتیں۔ یہاں محفوظ رہو گے۔ میں جارہی ہوں۔ مجھے ابھی کئی اور کام بھی انجام دینے ہیں۔ تمہارے لیے کیا کیا نہیں کرنا پڑ رہا ہے۔'' کہہ کر وہ چلی گئی۔

ابھی سلمان کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ وہ ادھر دوڑ پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی پیڑ پر چڑھی ہوئی ہے اور نیچے ایک شیر ببر کھڑا ہے۔ سلمان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ اسے روکتا، تبھی شیر نے سلمان کو دیکھا اور لڑکی کو بھول کر دہاڑتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ بے خیالی میں سلمان نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ پتا نہیں، اس انگوٹھی میں ایسی کیا بات تھی کہ شیر نے اچھال تو بھری مگر اس تک پہنچ نہیں پایا اور راستے ہی میں گر گیا پھر وہ اٹھا اور مار کھائے کتے کی طرح دم دبائے بھاگ گیا تھا۔ یہ اس انگوٹھی کا دوسرا چمتکار تھا۔ فاکیہ کی دی ہوئی اس انگوٹھی میں پتا نہیں کتنے عجائبات چھپے ہوئے تھے کہ ہر مقام پر کام آرہی تھی۔ یہ اس انگوٹھی ہی کی وجہ سے تو شیر بھیگی بلی جیسا بن کر بھاگ لیا تھا۔

سلمان نے لڑکی سے کہا۔ ''نیچے آجاؤ۔'' لڑکی آہستہ آہستہ نیچے اتر آئی۔

''اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو۔''

''میرا نام صغریٰ ہے۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیہان جارہی تھیں کہ ڈاکوؤں نے قافلے کو گھیر لیا۔ میرے گھر والوں کو قتل کر دیا۔ میں جان بچانے کے لیے بھاگتی چلی گئی اور یہاں تک آگئی۔''

سلمان اس کے ساتھ بڑھتا جارہا تھا۔ اسے دور آبادی کے آثار نظر آئے گو کہ آبادی ابھی بہت دور تھی۔ مگر آثار بتا رہے تھے کہ وہ خاصا بڑا قصبہ ہے۔ کچھ بڑھنے پر اسے قبرستان نظر آیا۔ وہ قبرستان کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ لڑکی بولی۔ ''ایسا کرتے ہیں، قبرستان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ دیر ستالیں گے۔''

''اور اگر کسی مردے نے خیریت دریافت کرلی تو؟'' سلمان ہنس کر بولا۔

''میرے ابا کہتے تھے، جب ڈر لگے تو قبرستان میں چلے جانا چاہیے کیونکہ وہاں کی

اچھی روحیں حفاظت کرنے لگتی ہیں۔"

لڑکی کی ضد پر سلمان قبرستان میں چلا آیا کیونکہ وہاں بیٹھنے کے لیے بڑے بڑے پتھر موجود تھے۔ اندر پہنچ کر سلمان ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر اسے ایسا لگا جیسے آنکھوں میں نیند اترتی جارہی ہے۔ تھکن تو پہلے ہی طاری تھی، ٹھنڈی ہواؤں نے لوری کا کام کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ ایک عجیب سا سرور، عجیب سی بے خودی اس پر چھا گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی نئے زمانے میں آ گیا ہو۔ ہر چہار جانب چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ خوشبودار پھولوں کی بھینی بھینی مہک بکھری ہوئی تھی کہ اسے ایسا لگا جیسے اس کے شانے پر کسی حسینہ کا معطر سر رکھا ہوا ہے اور قریب ہی سے کسی جھرنے کے پانی کی مترنم آواز آ رہی ہے۔

"سہراب!" سلمان کے کانوں میں کوئی حسینہ سرگوشی کر رہی تھی۔ "عمو کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے تم سے ملنا بند نہیں کیا تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔"

سلمان نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ وہ نہیں تھا، کسی قدیم زمانے کا کوئی نوجوان سورما تھا جس کی کمر پر تلوار لٹکی ہوئی تھی، خنجر بندھا ہوا تھا، پشت پر ڈھال اور ترکش تھے۔ بائیں کندھے پر کمان لگی ہوئی تھی۔ پھول دار کرتے پر کامدانی ٹوپی اور پاجامے کے ساتھ بغیر تسموں کے زرتار شاہی جوتوں نے اس کے اندر ایک انوکھی قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔

اس کے کندھے پر سر ٹکائے ہوئے جو لڑکی کھڑی تھی، وہ اسے جانتا تھا، جنم جنم سے اس سے اس کی واقفیت تھی۔ اس کے جسم کے ایک ایک عضو کے بارے اس نے نظمیں تحریر کی تھیں، چھوٹے چھوٹے گیت لکھے تھے، گھنٹوں ان بل کھاتی ہوئی زلفوں سے کھیلا تھا، ان مدبھری بڑی بڑی آنکھوں کے سمندر میں غوطے لگائے تھے، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹوں کی شراب پی تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ اس کی تھی، اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا محور۔ اس کی شاعری کا مرکز، اس کے خوابوں کی ملکہ!

"تم میرے والد کو نہیں جانتے وہ بڑے سنگدل ہیں، ہمارے تمہارے ملن کو وہ کبھی پسند نہیں کر سکتے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ شبستان شاہی کی کسی کنیز کے ذریعے ملکہ عالیہ کی خدمت اقدس میں یہ کہلوا دو کہ تم ان کی پناہ میں آنا چاہتی ہو تا کہ تمہارے والد تمہیں کسی قسم کا نقصان نہ

پہنچا سکیں۔"

"ملکہ عالیہ پچھلے دو دن سے صاحب فراش ہیں، حاذق الملک نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آرام و استراحت میں خلل نہ آنے پائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ برباد ہو جاؤں گا تمہارے بغیر۔ وعدہ کرو کہ تم کبھی زہر کھانے کا تصور بھی نہیں کرو گی وعدہ کرو۔"

وہ اچانک اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ "سہراب! میرا بھائی آ رہا ہے۔ وہ تمہیں قتل کرنے آ رہا ہے۔ سہراب اس کے ہاتھ میں میان سے نکلی ہوئی تلوار ہے۔ تم یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میری خاطر..... میری خاطر یہاں سے چلے جاؤ۔"

سلمان نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آتا ہے تو اسے آنے دو آج فیصلہ ہو جائے میرے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں ہیں۔"

ایک بڑی بڑی بل دار مونچھوں والا نوجوان اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہوئے نیچے کودا۔

"بدمعاش!" اس نے چلا کر کہا۔ "مرد ہے تو سامنے آ۔"

فاکیہ ان دونوں کے درمیان آ گئی۔ "قصوروار میں ہوں۔ سزا مجھے ملنی چاہیے۔"

آنے والے نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑے اور بے تحاشا اسے کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ قسائی بھی اس بے دردی سے ذبح ہونے والے جانور کو زمین پر نہیں گراتا جس بے دردی اور وحشانہ پن کے ساتھ اس نے فاکیہ کو گلاب کی کانٹوں بھری کیاری میں گھسیٹا تھا..... حسینہ کے منہ سے چیخ نکلی۔ رنج اور غصہ کے باعث اس کے منہ سے جھاگ جاری ہو گئے۔ وہ وحشیوں کی طرح ٹکراتا ہوا وہ آگے بڑھا اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج اس نابکار کے ٹکڑے کر دے گا۔

حسینہ کی چیخیں فضا میں بلند ہو گئیں۔ آنے والا سنبھل سنبھل کر پینترے بدلتا ہوا سلمان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھیڑیے جیسی چالاکی اور عیاری سے بڑی احتیاط کے ساتھ وہ سلمان پر حملہ کرنا چاہتا تھا جب کہ غم و غصے نے سلمان کو شیر بنا دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ پوری قوت سے بھرپور حملہ کر کے اس کی بوٹیاں بکھیر دے..... اچانک راستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر سے اس کے

پاؤں ٹکرائے اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

ساری دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک ہوگئی۔ حسینہ کی چیخیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں وہ منتظر تھا کہ کسی بھی لمحے آنے والے کی تلوار بلند ہوگی اور اس کی پشت میں گھس جائے گی..... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہتا ہوا اٹھا۔ تلوار شاید پتھر سے ٹکرانے کے ساتھ ہی ساتھ نیچے گر گئی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے دو چمکتی ہوئی اشرفیاں تھیں۔

اس نے نظر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا کسی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ حسینہ ابھی تک چیخ رہی تھی۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ آوازوں کی سمت دوڑا۔

وہ جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے سہارا دے کر اس نے باہر نکالا۔ کانٹوں سے اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''فاکیہ میں آج ہی عالم پناہ کے حضور میں عرضی پیش کروں گا' اور تم دیکھ لینا، تمہارا یہی بھائی اور تمہارے یہی والد خوشی سے میرے ہاتھوں میں تمہارا ہاتھ دے دیں گے۔''

سلمان نے اس کے زخمی ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا فاکیہ! میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔ عالم پناہ نے خود محبت کی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ محبت کا درد کیا ہوتا ہے؟ وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکیں گے کہ ہمارے ملن کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں خصوصاً ایسی صورت میں۔''

اس جملے کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر کھو گیا۔ کیسا قبرستان اور کہاں کا قبرستان وہ تو کسی بڑی حویلی کے باغیچے میں ایک جھرنے کے قریب نیم دراز تھا۔ فاکیہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ ''تم نے اپنی نظم لکھ لی؟ سنا ہے کہ ہندوستان ایران اور افغانستان کے شعراء آئے ہیں آج کا مقابلہ بہت سخت ہوگا۔''

سلمان نے کہا۔ ''نظم وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلے اور تم تو جانتی ہو کہ ایسی نظم میں تمہارا تصور لازمی ہے۔ ہاں اگر ٹھونسم ٹھانس کی بات کرتی ہو تو دو ڈھائی سو اشعار کی نظم جب کہو کہہ کر دکھا دوں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ تم نے ملکہ معظمہ عالیہ حضرت کے غسل صحت پر ہدیہ تہنیت پیش کیا ہے یا نہیں؟''

''ہدیہ تہنیت و تبریک کی نظموں میں تک بندی ہوتی ہے۔'' سلمان نے کہا۔ ''اور اگرچہ ابھی تک میں نے یہ تک بندی نہیں کی مگر تم دیکھ لو گی یہاں سے محل سرا تک پہنچتے پہنچتے کتنی شاندار قسم کی نظم تیار ہو جائے گی۔''

فاکیہ نے اپنے ہاتھوں سے انگرکھا پہنایا۔ بالوں کی ایک لٹ باہر نکال کر پگڑی باندھی۔ زرتاج شاہی جوتے پہنائے پھر اس کے بائیں گال پر کاجل کا ایک تل لگایا تاکہ کسی کی نظر نہ لگے۔

گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے سلمان نے پوچھا۔ ''تمہارے بھائی یا والد کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم یہاں ہو تو وہ تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے اور اگر تمہیں قتل کر دیا گیا تو صاحب عالم کا عدل انہیں سولی پر چڑھا دے گا اور میں تمہارے غم میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔''

فاکیہ مسکرائی۔ ''اللہ تمہیں عمر خضر عطا فرمائے۔ ایک میری وجہ سے کتنے بہت سے لوگ مرنے سے بچے ہوئے ہیں۔''

''علاوہ میرے۔'' سلمان نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے تم نے پہلے ہی قتل کر دیا ہے۔''

''اچھا جناب! اب زیادہ پیار اور محبت نہ بگھاریے۔ سیدھے سیدھے محل سرا کا رخ کیجیے، اور ہاں! جیسے ہی اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ گھوڑے کی لگام پکڑ کر بولی۔ ''نظم ضرور کر لینا۔ دربار میں دوست دشمن بھی ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے چغلی کھائی کہ تمہیں عالیہ حضرت کی صحت یابی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تو روئے زمین پر کہیں بھی سر چھپانے تک کو جگہ نہیں ملے گی۔''

سلمان نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ معمولی سی تو تک بندی ہے۔ چٹکی بجاتے ہی اشعار ہو جائیں گے۔

لیکن نظم چھوڑ کر ایک شعر تک نہ کہا جا سکا۔ سلمان نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اکیس اشعار ہی موزوں ہو جائیں لیکن وہ ایک رباعی تک نہ کہہ سکا۔

دعوت بہت شاندار تھی۔ شہزادہ بنفس نفیس اپنی خاص نگرانی میں کھانا کھلا رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت صاحب عالم گیتی پناہ کی ہدایت تھی کہ ان کے دسترخوان سے ہر شخص سیر ہو کر اٹھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وسیع و عریض دسترخوان کے کسی نہ کسی کونے سے تحسین و آفرین کا غوغا بلند ہوتا اور کوئی نہ کوئی شخص اچانک کھانا کھاتے کھاتے اٹھ کر کھڑا ہوتا اور سات عدد فرشی سلام شہزادہ عالی مقام کی جانب چہرہ کر کے پیش کرتا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ نئی بات

کیا ہو رہی ہے۔ محلسرا کی متعدد دعوتوں میں شرکت کی لیکن کبھی اس طرح سے شور وغل اور سلام ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔

اچانک کوفتہ توڑتے ہوئے سلمان کو اس میں کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ دیکھا تو دو ڈھائی تولے سونے کی ایک ڈلی تھی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ خوشی سے چلا اٹھے اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ منہ میں نوالہ تھا۔ ہاتھ سالن سے بھرے ہوئے تھے اور وہ جھکا ہوا عالی مرتبت شہزادہ کی خدمت اقدس میں فرشی سلام پیش کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد محفل مشاعرہ ہوئی۔ اس کا ذہن بالکل بنجر تھا۔ افغانستان کے ایک شاعر نے اپنی نظم پڑھتے ہوئے صاحب عالم کے عدل وانصاف کا بھی ذکر کیا اور یہ بتایا کہ ان کے دور میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔

عدل وانصاف کا ذکر کر کے وہ تو اگلا مضمون پڑھنے لگا مگر سلمان کے دماغ میں وہ واقعہ گھومنے لگا جب عالم پناہ نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان سے زیادہ عزیز ملکہ کو ایک اتفاقیہ قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دی تھی اور جب مقتول کے ورثاء کی درخواست پر خون بہا دے کر ملکہ معظمہ کی جان بخشی کی تھی۔ اس وقت ان کے منہ سے ایک بیش قیمت جملہ ادا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی ملکہ معظمہ سے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر ارشاد فرمایا تھا۔

''تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من۔''

''یعنی اے جان عزیز! اگر تجھے پھانسی کے تختے پر میرے عدل وانصاف کے باعث چڑھا دیا جاتا تو میں کیا کرتا؟ میں تو جیتے جی مر جاتا۔''

خوب ہوتا ہے شاعر کا دماغ بھی۔ یا تو ایک شعر بھی موزوں نہیں ہو رہا تھا یا ڈیڑھ سو سے زیادہ اشعار کی ایک مخمس تیار ہو گئی۔ ٹیپ کا مصرعہ یہی تھا۔

''تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من۔''

پوری محفل میں ہنگامہ ہو گیا۔ ہر طرف سے داد وتحسین کی صدائیں آنے لگیں۔ اتنی پر اثر اور خوبصورت نظم کسی نے بھی نہیں کہی تھی۔

ادھر نظم ختم ہوئی اور ادھر نقیب نے آواز لگائی ''باادب! باملاحظہ! ہوشیار! خسرو عالم، گیتی پناہ! اعلیٰ حضرت شہنشاہ خسرو پرویز تشریف لاتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ حضرت والا جھروکے میں تشریف فرما تھے۔ نظم سن کر بے قابو ہو گئے۔

اب خود تشریف لا رہے ہیں کہ سلمان کو انعام واکرام سے سرفراز فرمائیں۔

پوری محفل نقیب کی آواز سنتے ہی دست بستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سب کی نگاہیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ صاحب عالم کے پر جلال چہرے کی جانب نظریں اٹھائے۔

صاحب عالم تشریف لے آئے زریں تخت پر جلوہ فرما ہوئے...... لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس سناٹے میں انہوں نے آہستہ سے ارشاد فرمایا۔

''سہراب! آج تو نے مابدولت کا دل شاد کر دیا۔''

وہ جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر فرشی سلام بجا لایا۔ سلام کر چکا تو انہوں نے پھر اسی جملے کو دُہرایا۔ وہ دوبارہ سلام کر رہا تھا کہ عالم پناہ اپنی مخصوص پر وقار، پر تمکنت اور پاٹ دار آواز میں گویا ہوئے۔ ''مانگ لے سہراب! کیا مانگنا چاہتا ہے؟ جو مانگے گا عطا کیا جائے گا۔''

ان کے ارشاد گرامی پر وہ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا۔ سوچنے لگا' کیا مانگوں اور کیا نہ مانگوں؟ شہنشاہ کے پچھلے ہی الطاف واکرام کچھ کم نہیں ہیں۔ پھر ایسا نہ ہو کہ جو کچھ مانگوں وہ میری حیثیت پر پورا نہ اترتا ہو یا صاحب عالم کے لیے بے حد حقیر ہو۔ دونوں صورتوں میں انعام کے بجائے عتاب کا اندیشہ تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ فاکیہ کے والد اور بھائی ہاتھ باندھے سر جھکائے ادب کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے...... اس نے تھوڑی سی جرأت اور کی اور کنیزوں کے جھروں کی جانب نظر ڈالی۔ فاکیہ کی سہیلی فاکیہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑی تھی اور اسے اشارہ کر رہی تھی کہ اس سے اچھا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ فاکیہ کو مانگ لو۔

حضرت والا نے دوبارہ ارشاد فرمایا۔ ''مابدولت جانتے ہیں کہ اس وقت تو ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا ہے ہم تجھے سوچنے سمجھنے کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔ خوب اچھی طرح غور وفکر کر کے بتا کہ تیری خواہش کیا ہے۔ تیرا سوال رد نہیں کیا جائے گا سہراب مانگ لے۔ جو کچھ مانگنا چاہے۔''

سلمان نے ایک بار پھر جھروکے کی طرف نظر ڈالی۔ دلآرام ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ فاکیہ کو مانگ لو۔ صاحب عالم کے جودوسخا کا سمندر طغیانی پر ہے۔ اگر تم نے فاکیہ کو نہیں مانگا تو تمام زندگی پچھتاؤ گے۔

اور تب اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ انتہائی عجیب وغریب۔ ایسا فیصلہ جس کی کسی کو بھی

توقع نہ تھی۔

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر جہاں پناہ کے روبرو جھک گیا۔ وہ ظل الٰہی سے فاکیہ کو مانگنا چاہتا تھا مگر عین اس وقت نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا حال دگرگوں ہوگیا۔ زبان خشک ہوگئی اور ذہن پر دھندسی چھانے لگی۔ اس نے بولنا چاہا مگر بول نہ سکا۔ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن یہ آواز اس کی نہ تھی۔ وہ نہ جانے کون تھا جو اس کی زبان سے بول رہا تھا۔ اس کی سماعت میں اس بولنے والے کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتی چلی جارہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''جب تک شعاع خورشید میں چمک باقی ہے۔ جہاں پناہ کا اقبال روز افزوں رہے۔ کون سی نعمت ہے جو عالی جاہ کے جانثاروں کو حاصل نہیں۔ تاہم غلام کی مجال کہ عدول حکمی کی جرأت کرنے کا ناپاک تصور بھی اپنے دل میں لائے۔ ظل سبحانی کے حسب الارشاد جان کی امان چاہتے ہوئے بندہ درخواست کرتا ہے۔ درخواست اس ہیچمدان کی یہ ہے کہ جہاں پناہ اپنی شمشیر آبدار اپنے دست مبارک سے اس جانثار کو مرحمت فرمائیں۔''

اس کی یہ درخواست سن کر تمام اہل دربار پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ان کی نگاہوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اسے بدبخت ازلی سمجھ رہے ہیں کہ اس نے نہ جاگیر مانگی اور نہ دولت جب کہ وہ کچھ بھی مانگ سکتا تھا۔ اس وقت کنیزوں کے جھروکے میں ہلکا سا شور ہوا۔ فاکیہ کی سہیلی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جلدی کرو! لخلخہ لے کر آؤ، بے چاری بے ہوش ہوگئی ہے۔''

دربار میں ہر شخص نے یہ آواز سنی ہوگی لیکن شہنشاہ کے حضور کسی کیفیت کا اظہار خلاف ادب تھا۔ ہر شخص نے یہی ظاہر کیا کہ جیسے کسی نے یہ آواز نہ سنی ہو۔ خود جہاں پناہ نے یا تو یہ آواز سنی نہیں تھی یا یہ سمجھ کر اس پر کوئی دھیان نہیں دیا کہ کنیزوں کی بات ہے، خود ہی مناسب انتظام اور دیکھ بھال کرلیں گی۔ جہاں پناہ نے اس کی درخواست سنی۔ ان کی نگاہوں سے تعجب ٹپک رہا تھا۔

''مابدولت اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شاعر عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی اپنی خوش بختی کا دشمن بھی بن جاتا ہے۔ تم نے اپنی اس درخواست سے اس امر کا ثبوت فراہم کردیا۔'' یہ ارشاد فرما کر شہنشاہ نے اپنی شمشیر آبدار اسے مرحمت فرمائی۔ سلمان نے اسے بوسہ دیا۔ پھر شہنشاہ نے فرمایا۔

''ہم اس شاعرانہ قناعت کی داد دیتے ہیں تاہم اپنی جانب سے تمہیں خلعت مفت پارچہ اور نور پور کی جاگیر مرحمت فرما کر تم کو اپنے مصاحبین میں شامل فرماتے ہیں اور ملکہ بیگم کی جانب سے پانچ ہزار نقد، ایک راس اسپ عراقی مع ساز و براق طلائی و نقرئی، اور ایک حبشی سائیس عطا کیا جاتا ہے۔''

سلمان کا عالم یہ تھا کہ جیسے وہ اپنے وجود سے باہر کھڑا ہوا اپنا تماشا کررہا ہو۔ جیسے وہ کوئی اور تھا جس نے شہنشاہ سے شمشیر آبدار مرحمت کرنے کی درخواست کی تھی اور وہ بھی کوئی اور تھا جو شہنشاہ کی زبان سے دوسری مرحمتوں کا اعلان سن رہا تھا۔ وہ تو فاکیہ کو مانگنا چاہتا تھا اور نہ جانے کیوں نہ مانگ سکا تھا۔ نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا۔

اس کے بعد جہاں پناہ تشریف لے گئے۔ ان کے تشریف لے جاتے ہی پوری محفل نے اسے گھیر لیا۔ مبارک بادیں دی جارہی تھیں اور ساتھ ہی اس بات پر حیرت کا اظہار بھی کیا جارہا تھا کہ اس نے اپنے طور پر جاگیر اور دولت کا سوال کیوں نہ کیا اور جہاں پناہ کی شمشیر کیوں مانگی؟ وہ ان لوگوں کو اس کا کیا جواب دیتا جب کہ وہ خود بھی اپنے آپ سے یہی سوال کررہا تھا۔ اتنے میں میاں حسین علی بربط نواز اس سے معانقہ کرنے آئے اور تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر کہنے لگے۔

''بیوقوف شاعر! تمہیں چاہیے تھا کہ ظل الٰہی کے الطاف خسروانہ سے فیضیاب ہونے کے لیے کم سے کم ان کی ایک کنیز کو اپنے عقد میں لانے کی خواہش ظاہر کرتے۔ شہنشاہ کی کنیز کو عقد میں لانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ظل سبحانی تمہارے باپ کی حیثیت سے اور ملکہ معظمہ کنیز کی ماں کی حیثیت سے شادی کا انتظام فرماتے۔ تمہاری شادی کا سارا بار انہی پر ہوتا اور جہیز بھی اتنا ملتا کہ تمہاری سات پشتوں تک کو کافی ہوتا۔''

ان باتوں نے اس کا حال اور بھی ابتر کردیا اور اس نے سوچا کہ میں نے خود کو بھی تباہ کر دیا اور فاکیہ کو بھی۔ چاہے وہ مجھے معاف کردے مگر میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکتا۔

اسے رات گزارنا دوبھر ہوگیا۔ پورا بستر اسے کانٹوں کا بنا ہوا معلوم ہورہا تھا۔ اس نے اپنی نادانی سے سونے کو پیتل کا ٹکڑا سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ کیا ہوگیا تھا مجھے؟ وہ اسی بات پر سوچے جارہا تھا۔ فاکیہ ملنے والی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ شہنشاہ کے فیصلے کے خلاف اپنی زبان بھی ہلاتا لیکن دلآرام کے مسلسل اشاروں کے باوجود میں نے اس کی بات نہیں مانی۔

صبح سویرے نور کے تڑکے دلآرام اس سے ملنے آئی۔ کہنے لگی۔ ''تم نے بہت برا کیا۔ فاکیہ کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ اسے بڑی امیدیں وابستہ تھیں تم سے۔ تم نے پلک جھپکنے میں اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے سارے محل مسمار کر دیئے۔''

سلمان نے کہا۔ ''میرے منہ پر تھوکو! میں اسی قابل ہوں کہ روئے زمین کی غلاظت میں دفن کر دیا جاؤں۔''

''تم نے میرے اشارے نہیں دیکھے تھے؟ میں برابر تم سے کہہ رہی تھی کہ فاکیہ کو مانگ لو۔ ایسا اچھا موقعہ دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''سب کچھ دیکھا تھا میں نے۔'' سلمان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میں چاہتا تھا کہ فاکیہ کو مانگوں لیکن پتا نہیں میرے دماغ کو کیا ہو گیا تھا۔ دماغ اور زبان دونوں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ خود حیرت زدہ ہوں کہ خدایا! یہ سب کچھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ کیا میں فاکیہ کے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟ دلآرام! اس کے بغیر میں اپنی زندگی گزار سکتا ہوں؟ وہ تو مجھے بہت برا کہہ رہی ہوگی۔ میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہ ہوگی۔''

دلآرام مسکرائی۔ ''تم دونوں ایک ہی آگ میں جھلس رہے ہو۔ فاکیہ جانتی ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری تم پر نہیں خود اس پر عائد ہوتی ہے۔''

''درحقیقت فاکیہ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تم ایسا اچھا قصیدہ کہنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ جہاں پناہ تمہاری منہ مانگی مراد پوری کرنے کا وعدہ کر لیں گے۔ اگر اسے پہلے سے یہ علم ہوتا تو وہ یقیناً کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کر لیتی کہ تمہارے دل اور دماغ کا تعاون برقرار رہے۔''

''اچھا.....'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں! فاکیہ بھی یہی سمجھتی ہے۔ اس کے عمو نے اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہمزاد کی معرفت تمہارے دماغ اور تمہاری زبان کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ تم اس سنہرے موقعے سے ضرور فائدہ اٹھاؤ گے اور فاکیہ کے سوا کچھ اور مانگ ہی نہ سکو گے۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے بالکل ایک فضول سی چیز طلب کی۔''

''تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا؟''

''میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے تمہیں کیا تعلق؟ یہ پوچھو کہ فاکیہ کو اس بات کا

یقین ہے یا نہیں؟''

''یونہی سمجھ لو۔''

وہ بولی۔ ''ہاں اسے پوری طرح یقین ہے۔ وہ اپنے عمو کی طاقت سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔''

سلمان نے کہا۔ ''کوئی ایسی صورت نکال سکتی ہو کہ میں فاکیہ سے مل سکوں۔''

''اسی لیے تو میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ فاکیہ نے کہلوایا ہے کہ باغ میں نہ آنا اس کے بڑے بھیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم وہاں فاکیہ سے ملتے ہو۔ وہاں کے بجائے اس مرتبہ تم اس سے قبرستان میں ملاقات کرنا۔ کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ قبرستان میں بھی ملاقات کی جا سکتی ہے۔''

دلآرام چلی گئی۔ اس کی باتوں سے سلمان کے تڑپتے ہوئے دل کو کچھ سکون ملا۔ خدا کرے، جیسا دلآرام نے کہا، ویسا ہی ہوا ہو۔ اس نے جان بوجھ کر فاکیہ کو نظر انداز نہ کیا ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ جب اس نے شہنشاہ کے حضور اپنی درخواست پیش کی تھی تو اس کا یہ حال تھا جیسے اس کی زبان کسی دوسرے شخص کے تابع ہو۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اس سانحے کی تاب نہ لا کر حلق سے باہر نکل پڑے گا۔ اس نے جو کچھ کہا، اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔

❁

شہر خموشاں میں وہ ایک پختہ قبر کے تکیے پر اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر بے اختیارانہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سلمان نے اپنا سر اس کی آغوش میں رکھ دیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' اس نے پیار کے ساتھ اپنے نرم و نازک ہاتھ سے سلمان کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''مرد ہو کر روتے ہو؟ مجھے دیکھو۔ جوان بھائی کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا مگر میں کتنے صبر سے کام لے رہی ہوں۔''

سلمان نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں سمجھتی فاکیہ! میں کتنا بدقسمت ہوں۔''

''پھر وہی فاکیہ!'' اس نے سلمان کا سر اٹھا کر آنسو پونچھے۔ ''کون ہے یہ؟ معلوم ہوتا ہے تمہیں اس سے بڑا پیار ہے۔''

سلمان نے آنسو بھری نظروں سے دیکھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی دنیا میں واپس آ گیا ہے۔ فاکیہ کے بجائے صغریٰ اس کے آنسو پونچھ رہی ہے۔ وہ اسی قبرستان میں بیٹھا ہوا ہے جس میں وہ صغریٰ کے ساتھ آیا تھا۔ قبرستان کے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ سارا وقت خواب دیکھتے ہوئے گزر گیا تھا لیکن وہ کیسا خواب تھا جس میں ایک ہی واقعہ بڑے تسلسل کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔

صغریٰ نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے سلمان کے سر کے بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھا۔ ''فاکیہ سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

سلمان نے کہا۔ ''فاکیہ ایک روح ہے! اس نے مجھے بتایا تھا کہ سکون کی تلاش میں وہ فضاء کی پنہائیوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ پھر کچھ دنوں سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بلکہ یوں کہو کہ میں اس سے محبت کرتا رہا ہوں۔''

وہ اس طرح ہنسی کہ اس کے موتیوں جیسے سفید دانت چمک اٹھے۔ ''تمہارے خیالوں اور خوابوں میں وہی بسی ہوئی ہے لیکن روح کے پیچھے بھاگنے سے کیا فائدہ؟ تم اسے حاصل تو نہیں کر سکتے۔ سایہ تو سایہ ہی ہے۔ جتنا اس کے پیچھے دوڑو گے اتنا ہی اس سے دور ہوتے چلے جاؤ گے..... بھلا کبھی کوئی سائے کو پکڑنے میں کامیاب ہوا ہے؟''

سلمان کو اس کی باتیں بڑی بھلی معلوم ہوئیں۔ دل چاہا کہ وہ اسی طرح بولتی رہے۔ اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے گالوں میں پڑنے والے چھوٹے چھوٹے گڑھوں نے اسے بے حد پیارا بنا دیا تھا۔ ایک عجیب سے والہانہ جذبہ کے ساتھ اس نے اپنا سر صغریٰ کی گود میں رکھ دیا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو صغریٰ۔'' اس نے کہا ''نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد فاکیہ کی شکل میری آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں پہلے کے کسی زمانے میں چلا گیا ہوں۔ یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہر چیز حقیقی معلوم ہوتی ہے۔''

''اب کیا دن یہیں قبرستان میں گزارنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں چاہیے کہ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے بستی میں نکل چلیں۔''

سلمان نے اس کی گود سے اپنا سر اٹھایا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ اگر ہے تو دھڑکن کیوں نہیں؟ کم از کم مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے

دل کی دھڑکن ہی نہیں ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اپنا دل تمہیں پیش کر دیا ہے تو یقین کر لو گے میری بات کا؟''

''نہیں! یہ شاعروں والی باتیں ہیں۔''

''تم بھی تو ایک شاعر ہو۔ دربار عالی سے تمہیں تمہارے قصیدے پر انعام ملا ہے، اتنی جلدی بھول گئے۔''

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''تم کون ہو؟ تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے انعام مرحمت فرمایا گیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم ہوگا تو اور کسے معلوم ہوگا؟ میں قدم بقدم تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارا ماضی ہو یا حال، میری نظر سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ تم سہراب بنو یا سلمان بن جاؤ، لیکن مجھ سے چھپ نہیں سکتے۔ میں تمہیں ہر جگہ ڈھونڈ نکالوں گی۔ میری طرف دیکھو سلمان! کب سے تمہاری تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں اور پتا نہیں کب تک اسی طرح ٹھوکریں کھاتی رہوں گی؟''

''یعنی..... یعنی تم فاکیہ ہو؟''

''جی ہاں.....!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تو..... تو میرا ایک کام کر دو۔''

''کون سا کام؟''

''روحوں کے لیے فاصلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تم چاہو تو پل جھپکتے میں مجھے میری شیریں کے پاس پہنچا سکتی ہو۔''

میں چاہوں تو کسی انسان کو اپنے ساتھ لیے بغیر خود دور دراز کا سفر تن تنہا منٹوں میں طے کر سکتی ہوں لیکن اس کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ مجھے اپنا جسم یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ جب تک یہ جسم میرے ساتھ رہے گا میں بھی عام انسانوں کی طرح اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ ''اگر کسی جسم کو لے کر سفر کرنا پڑے تو روحوں کو بہت زیادہ تکلیف جھیلنی پڑتی ہے کیونکہ یہ اصول کے خلاف ہے۔ چلو، پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر ہم تم دونوں تہران چلیں گے۔ برز کا اسٹیشن یہاں سے بمشکل تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔''

قبرستان سے باہر نکل کر جنگل میں بمشکل تین فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پیپل کے ایک پرانے درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''لو بھئی! ہمارا ہوٹل تو آ گیا۔ بولو! کیا کھاؤ گے؟''

سلمان نے کہا۔ ''کیوں بیوقوف بناتی ہو؟ میں اتنا نادان تو نہیں کہ ہوٹل اور پیپل کے درمیان فرق محسوس نہ کر سکوں۔''

''بھئی! ہم روحوں کے ہوٹل تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے اسے دوسرے پتھر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''بیٹھو! ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہمارا ہوٹل کتنا شاندار ہے۔''

سلمان بے یقینی سے مسکراتا ہوا اس کے برابر پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بہترین قسم کے اسپرنگ والے گدے پر بیٹھ گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اسے پتھر کہوں یا گدا۔ اچانک فاکیہ کی نگاہیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ ''سلمان! یہاں سے بھاگ جاؤ۔ خدا کے واسطے فوراً بھاگ جاؤ۔ وہ آ رہا ہے۔ مرنے کے بعد بھی وہ ہمیں چین نہیں لینے دے گا۔ تمہیں میری قسم سلمان! جتنی تیزی سے بھاگ سکتے ہو، بھاگو۔ ورنہ وہ.....

گھبراہٹ کے باعث وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کون آ رہا ہے؟''

اس نے مغرب کی طرف اٹھتے ہوئے غبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا بھائی۔ میں کہتی ہوں باتیں بنانے کا وقت نہیں۔ اپنی جان بچاؤ۔''

سلمان نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا ہوگا؟''

''میری فکر مت کرو۔ میں بہت جلدی تم سے آ کر ملوں گی۔''

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص زور زور سے بھیانک قہقہے لگا رہا ہو۔ صغریٰ نے پوری قوت سے اسے دھکیل دیا۔ ''بھاگو! کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو؟''

بھیانک قہقہوں کی آوازیں قریب آتی چلی گئیں۔ اس کی چھٹی حس نے اسے آگاہ کیا کہ وہ خطرات میں گھر چکا ہے۔ پوری قوت سے وہ ہوا کی مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ ہوا کے جھونکے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ بھیانک قہقہوں کی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی چلی

جا رہی تھیں۔ شروع شروع میں تو صرف ایک ہی شخص کے قہقہے سنائی دے رہے تھے لیکن پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے بیشمار لوگ قہقہے لگاتے ہوئے اس کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں مردوں کی آوازیں بھی تھیں اور عورتوں کی آوازیں بھی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی آوازیں بھی۔ سب کے سب اس طرح قہقہے لگا رہے تھے جیسے اس منظر سے خوب لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ جیسے ان سب کو یقین ہو کہ وہ ان کے چنگل سے بچ نہیں سکتا۔ اس کی حیثیت ایک چوہے جیسی تھی جسے تین جانب سے بلیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے کسی پتھر سے اس کے پاؤں ٹکرائے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے لیے اٹھنا اور اپنے جسم کو سنبھالنا ناممکن ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آنے والے حادثے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن قہقہے ڈوب چکے تھے۔ آسمان پر پھیلا ہوا تاریک زرد غبار غائب ہو چکا تھا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا سر اٹھایا۔ وہ ایک بار پھر اسی قبرستان میں آ گیا تھا جہاں اس نے صغریٰ کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس وقت اسے صغریٰ کی بات یاد آئی۔ ''اگر کبھی کسی جگہ پھنس جاؤ اور راستہ سمجھ میں نہ آئے تو قبرستان میں پناہ لے لینی چاہیے۔ وہاں پر کسی بلا اور وبا کا گزر نہیں ہو سکتا۔''

سلمان نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حد نظر تک کچی پکی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ قبروں کو دیکھ کر خوف محسوس ہونے کے بجائے اسے طمانیت قلب حاصل ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظریں ایک قبر کے کنارے لگے ہوئے سیب کے ایک بڑے درخت پر پڑیں جس کے پیلے پیلے سیب نیچے تک لٹک آئے تھے اور تب اسے احساس ہوا کہ کھانا کھائے ہوئے اسے اٹھارہ گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اب بھوک کی شدت سے اس کی آنتیں اینٹھ رہی ہیں۔ اس نے لپک کر ایک سیب توڑ لیا۔ اتنا شیریں اور ذائقے دار سیب اس نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ سیب کیا تھا۔ مصری کی ڈلی معلوم ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی سیب اس کے پیٹ میں پہنچ گئے۔

سیب کھا کر فارغ ہوا تو کیا دیکھا کہ مزار کے سرہانے بوڑھے بزرگ کھڑے ہوئے فاتحہ خوانی کر رہے ہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے اسے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ فاتحہ خوانی کے بعد اس سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''کیوں میاں! تمہارا نام کیا ہے؟''

سلمان نے انہیں اپنا نام بتایا تو بولے۔ ''یہاں کیوں گھوم رہے ہو؟ کیا کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے تھے؟''

سلمان نے کہا۔ ''جی نہیں! بس یونہی ادھر آ گیا تھا۔''

وہ مسکرائے۔ ''قبرستان میں کوئی یونہی نہیں گھومتا۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''بام سے آیا ہوں۔''

''لگ بھگ سو میل دور سے یہاں آئے ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''پھر بھی یہ کہتے ہو کہ یونہی آ گئے تھے۔ بھلا اتنا طویل فاصلہ طے کر کے اس جنگل بیابان میں محض تفریح طبع کے لیے کون آ سکتا ہے۔ میں نہیں مانتا تمہاری بات۔ تم ضرور کچھ نہ کچھ مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

سلمان نے کہا۔ ''درست بات بتاؤں گا تو آپ اسے بھی نہیں مانیں گے۔''

وہ بولے ''کیوں نہیں مانوں گا؟ دیکھو میاں! میں نے اپنے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ یہ ناممکن ہے کوئی شخص مجھ سے سچ بولے اور میں اس کی بات پر یقین نہ کروں۔ اسی طرح یہ بھی سمجھ لو کہ جھوٹ بول کر مجھے فریب نہیں دیا جا سکتا۔''

سلمان نے انہیں شروع سے آخر تک اپنی داستان سنائی۔ انہوں نے پوری توجہ سے اس کی کہانی سنی۔ جب خاموش ہوا تو وہ دیر تک بیٹھے ہوئے کچھ سوچتے رہے۔ بالآخر بولے۔ ''برے پھنس گئے ہو۔ شاہی خاندان کی لڑکی ہے۔ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گی، جب تک.....'' پھر جملہ مکمل کیے بغیر وہ خاموش ہو گئے۔

سلمان نے پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ مجھے فاکیہ سے کوئی خطرہ ہے؟''

''وہ تم سے محبت کرتی ہے، بے پناہ محبت۔ تمہیں دیکھ کر اسے اپنا محبوب یاد آ جاتا ہے وہ محبوب جس کی خاطر اس نے جان دی، اس کی بے چین روح محبت کی بھوکی ہے، وہ تمہیں اس حد تک اپنے عشق میں مبتلا کر دینا چاہتی ہے کہ اس کے علاوہ تم سب کچھ بھول جاؤ۔ تم یہ محسوس کرنے لگو کہ حقیقت میں تم سہراب ہو حالانکہ سہراب کو مرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔''

''اچھا، یہ بتائیں اسے سکون کیسے مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں مل سکتا۔'' انہوں نے کہا۔ ''افسوس تو یہی ہے کہ آج تک کسی نے اسے سکون پہنچانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کی خودکشی کے بعد بے چارے سہراب نے لاکھ سر پٹکا کہ وہ اس کی ہو چکی ہے لیکن کون تھا جو اس کی بات پر دھیان دیتا۔ پارسی رواج کے مطابق اسے

پرندوں کے لیے لٹکا دیا گیا۔ اس کی موت پر نہ قرآن خوانی ہوئی اور نہ کسی نے فاتحہ پڑھی۔ سہراب کا فرض تھا کہ وہ اس سلسلے میں عملی قدم اٹھاتا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی اسے بھول گیا، بنفشہ نامی ایک گانے والی لڑکی سے شادی کر کے اسے یاد بھی نہ رہا کہ فاکیہ نام کی بھی کوئی لڑکی تھی جس نے اس کی خاطر ہنستے ہوئے موت کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔''

سلمان نے کہا۔ ''معاف کیجیے گا۔ آپ کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے گزرا ہو آخر آپ ہیں کون؟''

انہوں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ''سمجھے میاں!'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر تم چاہتے ہو کہ بدنصیب فاکیہ کی روح کو کچھ سکون نصیب ہو جائے اور تمہیں بھی اس سے خلاصی ملے تو اس کے لیے خیرات اور صدقات دو۔ اس کے لیے قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کراؤ۔''

سلمان نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا؟''

وہ بولے۔ ''اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ ضروری نہیں کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دیا جائے۔ قبرستان سے باہر نکل کر تمہیں ایک پگڈنڈی ملے گی۔ اس پر ہوتے ہوئے چلے جانا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے تمہیں تہران جانے والی سواری مل جائے گی۔''

سلمان نے کہا۔ ''اگر پھر بھی آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کہاں مل سکتا ہوں؟''

''جمعرات کو یہیں آ جانا۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہر جمعرات کو ہمیں دنیا میں آنے کی اجازت ملتی ہے۔''

''دنیا میں آنے کی اجازت، کیا آپ اس دنیا کے باشندے نہیں ہیں؟''

انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''بس اب جاؤ یہاں سے، جو کچھ میں نے کہا ہے، اگر اس پر عمل کرو گے تو تمہارا فاکیہ پر بڑا احسان ہو گا۔''

مناسب یہی تھا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ وہ بزرگ اب اس بات کے روادار نہیں تھے کہ وہ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرے چنانچہ انہیں سلام کر کے وہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا۔ مشکل سے دو تین فرلانگ کا رستہ طے کیا ہو گا کہ اسے ایک سمت سے کسی کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو وہی لڑکی جس نے اپنے آپ کو فاکیہ بھی کہا تھا، زمین پر گری ہوئی

نظر آئی۔ وہ بڑی نقاہت کے ساتھ سلمان کو آوازیں دے رہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا۔ ''شکر ہے کہ تم زندہ ہو، مجھے ڈر تھا کہ بھائی نے تمہیں قتل کر دیا تو ایک بار پھر کھو جاؤ گے، میں تمہیں کہاں ڈھونڈھتی پھروں گی؟''

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔ ''اس طرح زمین پر کیوں پڑی ہو؟''

''اپنی دانست میں اس نے مجھے قتل کر دیا ہے، یہ دیکھو اور یہ بھی اور یہ بھی۔'' پہلے اس نے اپنا گلا دکھایا جس پر خنجر کا نشان تھا، پھر پیٹ دکھایا، پھر پیٹھ دکھائی۔ ہر جگہ گہرے زخموں کے نشانات تھے لیکن خون کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''بڑی مشکلوں سے ایک ایسا جسم حاصل ہوا تھا جسے تم پسند کر سکتے تھے لیکن ظالم نے اسے بھی ختم کر دیا۔ میں نے صرف تمہارے انتظار میں اس جسم کو نہیں چھوڑا لیکن اب اس کی تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے جسم چھوڑنا ہی پڑے گا، خدا حافظ! سہراب! میں تم سے جلد ہی ملاقات کروں گی۔''

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سلمان کچھ بھی نہ کہہ سکا، اسے واقعی فاکیہ کا یہ روپ' یہ لڑکی اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کی اس عجیب و غریب موت پر حیرت تعجب کے ساتھ اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی بہت ہی قیمتی چیز چھن گئی ہو۔ اچانک اس کی لاش سے بدبو کے بھبکے اٹھنا شروع ہو گئے۔ سلمان نے دیکھا کہ اس کا جسم آہستہ آہستہ گل رہا تھا، خوبصورت رخسار غائب ہو چکے تھے اور ان کی بجائے ہڈیاں نظر آ رہی تھی۔ اس کی لاش کے تعفن سے گھبرا کے اس کا وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔

اس نے اس کے گلتے سڑتے ہوئے جسم پر الوداعی نظر ڈالی اور اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا، لیکن اب وہ کہاں جائے یہی سوچتا ہوا سلمان آگے بڑھا جا رہا تھا تبھی اسے یاد آیا کہ ان بزرگ نے اسٹیشن پہنچنے کا کہا تھا، وہ ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ اسٹیشن پہنچتے ہی اسے تہران کی ریل گاڑی نظر آ گئی جو چلنے ہی والی تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا۔ اس کمپارٹمنٹ میں صرف چار آدمی بیٹھے تھے۔ وہ بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا۔

''کہاں جانا ہے؟''

''تہران!''

''ٹکٹ خریدا؟''

''نہیں!''

''تب تو چیکر جرمانہ وصول کرے گا۔ جیب میں رقم ہے ناں؟''

''تو مان تو نہیں ہیں مگر قیمتی پتھر جڑی انگوٹھی ضرور ہے۔''

''انگوٹھی ہے؟ یار، تب تو تم بادشاہ ہو۔ ہم میں سے کسی کے پاس انگوٹھی نہیں بلکہ ہم نے صرف نام ہی نام سنا ہے، اپنی آنکھوں سے کبھی کسی قیمتی انگوٹھی کی زیارت بھی نہیں کی۔ ذرا دکھانا تو'' ان میں ایک شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔

سلمان کا ارادہ تھا کہ انگوٹھی کی ایک جھلک انہیں دکھا کر فوراً چھپا لے گا تاکہ ان کی چیخ و پکار سے محفل کا رنگ بھی بدل جائے اور کوئی حادثہ بھی نہ ہونے پائے چنانچہ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکالی۔ آگے کو ہاتھ بڑھا کر ان لوگوں کے سامنے مٹھی کھولی اور جلدی سے بند کر لی۔ غالباً مٹھی کھولنے اور بند کرنے میں اس نے کچھ زیادہ عجلت سے کام لیا تھا۔ وہ تینوں کے تینوں ویسے ہی بیٹھے رہے، کسی پر بھی کچھ اثر نہ ہوا۔

''ٹھیک سے دکھاؤ۔'' ایک شخص نے کہا۔ ''ہم تمہاری انگوٹھی کو کھا تو نہیں جائیں گے۔''

دوسرا بولا۔ ''بھئی ہوا لگ جائے گی ان کی انگوٹھی کو، موسم پہلے ہی خراب ہو رہا ہے، نزلہ زکام ہو گیا تو کون ذمے دار ہو گا؟''

تیسرے نے کہا۔ ''نہیں یار، یہ بات نہیں، بغیر وضو کیے ہوئے ان کی انگوٹھی دیکھنا بھی گناہ ہے۔''

وہ سب سلمان کو جھوٹا شیخی خورہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کی فقرے بازی سے اسے غصہ آ گیا۔ ''اگر کسی کو کچھ ہوا تو میں ذمے دار نہیں۔'' اس نے جل کر کہا اور پوری مٹھی ان کے سامنے کھول دی۔ پہلے چند لمحوں تک وہ لوگ اس انگوٹھی کو حیرت سے دیکھتے رہے پھر یکا یک سب کے سب زور سے قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ کہاں تو سلمان کو ان لوگوں کی چیخوں کا انتظار تھا اور کہاں انہیں ہنستا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اب جو غور سے اس نے اس انگوٹھی پر نظر ڈالی تو اس کی ہتھیلی پر دو بڑے چھلے رکھے ہوئے تھے، انگوٹھی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ان لوگوں نے کس طرح اس پر بھپتیاں کسیں اور کیا کیا کہہ کر اس کا مذاق اڑایا، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ ساری دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی تھی۔ خطرناک ہونے کے باوجود وہ انگوٹھی اس کا بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے اسے بڑے بڑے مصائب میں گرفتار ہونے سے بچایا تھا۔ آخر اس کی حالت پر ان لوگوں کو رحم آ گیا۔ ایک نے پوچھا۔ ''تم کچھ دھندا بھی کرتے ہو؟''

''میں کوئی کام دھندا نہیں کرتا۔''

''کہو تو ہم تمہیں ملازمت دلا دیں؟ پندرہ تومان مہینہ تنخواہ ملا کرے گی اور کام بھی کچھ زیادہ نہیں، بس بازار کا سودا سلف لایا کرنا، گھر کا کوئی دوسرا چھوٹا موٹا کام کر دینا۔''

''اگر میں تہران نہ جا رہا ہوتا تو ضرور آپ کے ہاں نوکری کر لیتا۔''

''بھائی! تہران ہی میں کام کرنا ہے.....''

سلمان نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

تہران کے اسٹیشن پر ان لوگوں نے اپنا سامان ہنس ہنس کر سلمان کے سر پر لادا اور باہر کی جانب چل دیے۔ راستے میں ایک ٹکٹ چیکر کو روک کر انہیں اس کے متعلق بتایا کہ غلطی سے اس کا ٹکٹ نہ لیا جا سکا تھا۔ اب جو کچھ بنتا ہے، وصول کر لیں۔ اس نے حساب لگا کر رقم لی اور رسید دے دی۔ سلمان کے سر پر کافی سامان لدا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اسے بوجھ کا احساس نہیں تھا، بس کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی اور شخص نے سہارا دے رکھا ہو۔ ٹیکسی میں سامان رکھواتے ہوئے ان لوگوں نے شاباشی کے طور پر پیٹھ ٹھونکی۔ ''اپنا پٹھا بیل سے کم نہیں ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''دیکھنے میں دبلا پتلا ہے، مگر طاقت کا جواب نہیں، میں نے اتنی طاقت والے کم ہی لوگ دیکھے ہیں۔''

تیسرے نے کہا۔ ''کمال ہے بھئی ڈبے میں یہی سامان رکھواتے وقت تین قلیوں کی ضرورت پڑی تھی اور یہ اس طرح سارا سامان اکیلے ہی لے آیا جیسے پھولوں کا گلدستہ اٹھائے ہوئے ہو۔''

اور اسی وقت سلمان کے کانوں میں فاکیہ نے سرگوشی میں کچھ کہا۔ ایک لمحے کے لیے وہ جھجکا۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ مسکرا کر ان لوگوں سے کہنے لگا۔ ''اجی، یہ سامان تو کچھ بھی نہیں ہے، آپ کہیں تو یہ موٹر اپنی کمر پر لاد لوں۔''

''بس بس۔ زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں، جس طرح تم نے انگوٹھی دکھائی تھی، اسی طرح موٹر کو بھی کمر پر لاد لینا۔'' ان میں سے ایک نے اس کا مذاق اڑایا۔

فاکیہ نے ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کی اور پھر اس پر تو جیسے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ فوراً ہی لیٹ کر ٹیکسی کے نیچے گھس گیا اور پھر زمین پر لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں کے سہارے اس نے اسے اوپر اٹھایا تو وہ اس طرح اٹھ گئی جیسے معمولی قسم کے

کاغذ اور تیلیوں کی بنی ہوئی کوئی چیز ہو۔ ٹیکسی کو اس طرح اپنے دونوں ہاتھوں پر سنبھالے ہوئے اس نے ان لوگوں کو تھوڑا سا چل کر بھی دکھایا۔ اس کی بعد آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں سے ٹیکسی کو نیچے رکھا اور رینگ کر باہر نکل آیا۔

باہر لوگوں کا جم غفیر اکٹھا تھا۔ بے شمار لوگ ٹیکسی کو ہوا میں بلند ہوتے ہوئے دیکھ کر ٹھہر گئے تھے۔ ٹریفک جام ہو چکا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل بھی اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر حیرت کے ساتھ اس کارنامے کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ہوا ایک انگریز آدمی آگے بڑھا اور محبت کے ساتھ اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''جوان! نوکری کرنا ہے۔ سو تومان دیں گے۔ پورے ایران کا سیر کرائیں گے۔ کرایہ بھاڑا، کھانا، کپڑا الگ سے ملیں گا۔''

سلمان نے کہا۔ ''کام کیا کراؤ گے؟''

''دیکھو! ہمارا سرکس کمپنی ہے۔ اس میں تم پبلک کو بھاری بھاری چیز اٹھا کر دکھاؤ گے۔ ایک دن میں دو بار بولو منظور؟''

سلمان نے سر گھما کر دیکھا۔ اس ہجوم میں وہ تینوں مسافر نہ جانے کہاں گھو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اخلاقی طور پر ان سے اجازت تو لے ہی لوں مگر ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ وہ کسی طرف بھی نظر نہ آئے۔ مجبوراً اس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''منظور! لیکن جب تک مجھے میری زندگی میری شیریں نہیں مل جائے گی، میں تہران سے باہر نہیں جاؤں گا۔''

اور اس طرح تہران پہنچتے ہی سلمان الفریڈ سرکس کمپنی کا آئرن مین بن گیا۔ کمپنی نے اس کی پبلسٹی خوب دل کھول کر کی۔ اس دوران میں اس سے ریہرسل بھی کرائی گئی۔ ریہرسل کے دوران اس کی دوسری کئی خوبیاں بھی اجاگر ہوئیں اور ریہرسل کے دوران اس کی تنخواہ سو تومان سے بڑھا کر دو سو تومان روز کر دی گئی۔ ریہرسل ہی کے زمانے میں اس کی ملاقات سرکس کمپنی کے مالک کی نوخیز لڑکی مس آئی سے ہوئی۔ سنگ مرمر سے ڈھلا ہوا اس کا جسم سلمان کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ صغریٰ تو اس کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھی۔

دن بھر کی ریہرسل کا تھکا ماندہ جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتا تو ایک جانی پہچانی آواز اس کے قریب سرگوشیاں کرتی۔ ''مجھ سے کب تک دور رہو گے؟ کب تک مجھے تڑپاؤ گے؟ میرا پیارا مرہے سہراب! دیکھو، مجھے بھول نہ جانا۔''

بے شک یہ فاکیہ کی آواز تھی۔ دکھ بھری آواز کبھی کبھی بے اختیارانہ اس کا دل اس آواز

کی طرف کھنچنے لگتا۔ آنکھوں کی نیند اڑ جاتی اور کبھی کبھی تھکن کے باعث اس پر فاکیہ کی پر درد آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے سلمان کے خیالوں میں آئی اور آنکھوں میں اس کا مرمریں جسم رقصاں ہوتا۔ اس موقعے پر اسے فاکیہ کی آواز ناگوار گزرتی۔ اگر اس آواز پر اس کا کچھ بھی بس چلتا ہوتا تو وہ یقیناً اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کانوں تک آنے سے روک دیتا۔

مسلسل ریہرسل کے باعث اسے کچھ سوچنے سمجھنے کی فرصت بہت کم ملتی تھی، تاہم اکثر ایسا ہوتا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹتا تو خود بخود ذہن فاکیہ کی دی ہوئی انگوٹھی کے معمے کو حل کرنے میں لگ جاتا۔ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آئی تھی کہ جو دیکھتا، وہ دیکھتے ہی عقل و خرد سے بیگانہ ہو جاتا؟ پھر اچانک وہ انگوٹھی کہاں غائب ہو گئی؟ اس کی جگہ دو بڑے بڑے چھلے کس طرح آ گئے؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں کلبلاتے رہتے۔ جتنا وہ اس گتھی کو سلجھانا چاہتا، اتنا ہی زیادہ یہ گتھی الجھتی جاتی۔ بالآخر تھک ہار کر وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور اس کے کانوں میں فاکیہ کی آوازیں آنے لگتیں۔

''سہراب! میں تمہاری تھی، تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔''

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے شیریں کو فراموش کر دیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا، وہ سرکس کے اشتہار تقسیم کرنے والی گاڑی پر سوار ہو کر شہر کا گشت لگاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی روز کسی گلی سے شیریں نکل کر آئے گی اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لے گی۔

خدا خدا کر کے اس کے پہلے شو کا دن آیا۔ ہفتے بھر کے ٹکٹ پہلے ہی بک ہو چکے تھے۔ پورے تہران میں آئرن مین کی قوت کا شہرہ تھا۔ ایک خلقت تھی کہ اس کے کمالات دیکھنے کے لیے کھنچی چلی آئی تھی۔ اس نے اس شو میں تین کمالات پیش کیے۔ پہلا کمال تو وہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے تہران کے ریلوے اسٹیشن پر پوری کار اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر کیا تھا۔ دوسرا کمال اس نے یہ دیکھایا کہ سرکس میں کام کرنے والی تیرہ لڑکیوں کو ایک بڑے سے جال میں لپیٹ کر اس نے اپنے کندھے سے لٹکایا اور رسی کی سیڑھی سے چڑھ کر چھت میں لگے ہوئے جھولے پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ اس کمال کا کلائمکس یہ تھا کہ اچانک جال اس کے کندھے سے الگ ہو گیا۔ جال میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں منظر میں جان ڈالنے کے لیے زور سے چلائیں۔ ان کی چیخ کے ساتھ ہی ساتھ پبلک کی چیخیں بلند ہوئیں اور اگلے ہی لمحے تالیوں کے شور سے پورا پنڈال گونج اٹھا کیونکہ سلمان نے اپنی ایک ٹانگ آگے بڑھا کر جال کو اپنی ٹانگ پر روک لیا تھا۔ تیسرا کمال سب سے

آخر میں پیش کیا گیا۔ اس سے قبل سرکس کا آخری آئٹم شیر کے کرتب کا ہوا کرتا تھا لیکن اس کے کمال کو اس سے بھی زیادہ اہمیت دی گئی۔ وہ رنگ میں داخل ہوا۔ تماشائیوں کو جھک کر سلام کیا اور اس کے بعد فرش پر لمبا لیٹ گیا۔ اس کی سینے پر پتھر رکھ دیے گئے۔ کچھ موٹے تازے لوگ ہتھوڑے لے کر آئے اور اس کے سینے پر رکھے ہوئے پتھروں کو کوٹنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے پتھروں کو بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دیا لیکن جب اس نے اٹھ کر پبلک کو سلام کیا تو اس کے سینے پر ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔ پبلک کو سلام کر کے وہ دوبارہ فرش پر لیٹ گیا۔ رنگ میں چنگھاڑتا ہوا ہاتھی داخل ہوا۔ رنگ ماسٹر نے ہنٹر گھما کر اسے مجبور کیا کہ وہ آگے بڑھ کر سلمان کے سینے پر کھڑا ہو جائے۔ ہاتھی آگے بڑھا۔ اپنی سونڈ سے پہلے اسے سونگھا، پھر اس کے سینے پر ایک پاؤں رکھ کر چلتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ آگے جا کر وہ پھر گھوما۔ سونڈ سے سونگھا۔ اپنے دونوں پاؤں اٹھائے اور اگلے پیروں کو ملا کر رکھ دیئے۔ اب پورا ہاتھی اس کے سینے پر کھڑا ہوا تھا۔ جونہی وہ سینے سے نیچے اترا، سلمان اپنے بدن کی مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور حیرت خوشی کے ملے جلے نعرے لگاتی ہوئی پبلک کو جھک جھک کر سلام کرنے لگا۔

اس رات جب وہ اپنی کامیابی کے نشے میں چور سونے کے لیے لیٹا تو فاکیہ کی آواز نے اس سے کہا۔ ''مجھے بھول جاؤ سہراب! سمجھ لو کہ فاکیہ نام کی کوئی لڑکی تمہاری زندگی میں داخل ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ میں پہلے بھی شیریں کے باب میں بتا چکی ہوں۔''

اس کے اس عجیب و غریب پیغام پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''تم کہاں ہو فاکیہ؟''

''تمہارے ہی پاس ہوں، لیکن تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔'' اس کی آواز آئی۔ ''آج میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ بدقسمت روحیں گوشت پوست کے انسانوں سے کسی قسم کا تعلق قائم نہیں کر سکتیں۔ میری قسمت میں سکون نہیں، لیکن میری وجہ سے تم اپنا سکون کیوں غارت کرتے ہو؟''

اچانک اس کی آواز تیز ہو گئی۔ ''آئی تمہیں چاہتی ہے سہراب، اس کی محبت کی قدر کرو۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ سلمان نے دو تین مرتبہ اسے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ بے چاری بے چین اور مضطرب روح۔ اسے قبرستان والے بزرگ کی بات یاد آئی۔ ''اسے سکون پہنچانا چاہتے ہو تو اس کے لیے قرآن خوانی کراؤ۔ خیرات و صدقات دو، دعائیں کرو۔'' اس نے تہیہ کر لیا کہ ان بزرگ کے ارشاد پر فوری عمل کرے گا۔ اس کے ذریعے اگر کسی روح کو سکون مل جائے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور نیک بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی وقت کسی نے اس کی کیبن کے دروازے پر دستک دی۔ ''ہیلو آئرن مین!''

یہ ایسی میٹھی دل میں اتر جانے والی آواز تھی کہ سلمان سب کچھ بھول بھال کر دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ ''ہیلو مس آئی! کیسے تکلیف کی آپ نے؟''

اس نے ابھی تک اپنے چہرے کا میک اپ نہیں اتارا تھا۔ سرکس والا نیم عریاں لباس زیب تن تھا جس کے باعث اس کے حسن کی دلکشی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

''آپ سوئے تو نہیں تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی نہیں! جاگ رہا تھا۔''

''ہم نے سوچا، آپ کو مبارک باد دے دوں۔ آج تو آپ نے بہت کمال کیا۔''

سلمان نے کہا۔ ''آپ کی ذرہ نوازی ہے۔''

آئی بولی۔ ''ہم کو نیند نہیں آئی، تھوڑی دیر ہمارے ساتھ ٹہل لو؟''

''آپ تھوڑی دیر کی بات کرتی ہیں؟'' سلمان نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کے ساتھ تو میں ساری رات ٹہلنے کے لیے تیار ہوں۔''

سلمان کا ہاتھ تھام کر وہ سرکس کے کھلے ہوئے کمپاؤنڈ گھومنے لگی۔ ''آپ سچ مچ مرد ہے، ہم ایسا ہی مرد دیکھنا چاہتے، سچ مچ مرد۔ ہم نے ایسا مرد کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں نے بھی آپ جیسی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔''

شیر کے کٹہرے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

اسی وقت سلمان کے کانوں میں فاکیہ کی آواز آئی۔ ''اسے پیار کرو سہراب، اس کے جذبات کی قدر کرو۔'' فاکیہ کی آواز کے ساتھ ہی کسی معمول کی طرح سلمان نے اپنے ہونٹ آئی کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور پوری قوت سے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

فاکیہ کے رویہ میں جو اچانک تبدیلی ہوئی تھی، اس نے سلمان کو حیرت میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ اس سے قبل بھی وہ شیریں کے لیے ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا کرتی تھی، لیکن اب وہ آئی کی جانب راغب کرنے کے لیے اکسانے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے ایسے مواقع فراہم کرتی کہ وہ آئی سے ملے۔ ایسے اقدامات پر ابھارتی جنہیں وہ غلط سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آواز سنتے ہی وہ سب کچھ کر گزرتا تھا جو عام حالات میں نہ کرتا، تاہم اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل

نہیں تھا کہ وہ ابھی بھی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہے۔

شیریں کی تلاش جاری تھی۔ آئی کے مشورے پر اس نے دو تین مقامی اخباروں میں ایک اشتہار بھی اس مضمون کا چھپوا دیا تھا۔

''میں سلمان اپنی بیوی سے ایک ماہ قبل بچھڑ گیا تھا۔ یہ تہران میں کہیں مقیم ہے۔ اگر اس کی نظروں سے یہ اشتہار گزرے یا کوئی واقف کار اس اشتہار کو پڑھے تو الفی سرکس کمپنی کی معرفت مجھ سے رابطہ قائم کرے۔''

اسی روز شام کو جب وہ رنگ میں جانے کے لیے ضروری میک اپ کر رہا تھا کہ فاکیہ کی آواز نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے اخبار میں اشتہار دیا ہے؟''

سلمان نے کہا۔ ''ہاں! شیریں کی محبت مجھے بہت ستا رہی ہے۔ خدا جانے، وہ کس حال میں ہے۔''

وہ بولی۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔ وہ عامل اس سے کوئی کام لینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تم پر قابو پانے کے لیے اسے ساتھ لیا تھا مگر جب تم اس کے ہاتھ نہیں آئے تو اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اب وہ جہاں ہے محفوظ ہے۔''

''مگر میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اگر تم اس سے ملنا چاہتے ہو تو مجھ سے کہو، اخبار میں اشتہار دینے سے کیا فائدہ؟''

''میں نے سوچا کہ تم سے تو اس کا پتا ملتا نہیں، کیوں نہ اخبار کا سہارا لوں؟''

وہ ہنسی۔ ''میری مرضی کے بغیر تم اس سے ہرگز نہیں مل سکتے۔''

سلمان کو بھی غصہ آ گیا۔ ''کیوں نہیں مل سکتا؟ تم ہوتی کون ہو مجھے منع کرنے والی؟''

''یہ مت بھولو کہ تمہارا سارا چین و آرام میرا مرہون منت ہے۔ میں چاہوں تو بھیک مانگنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔''

سلمان نے کہا۔ ''کیا تم مجھے اتنی اجازت بھی نہیں دو گی کہ میں چند لمحوں کے لیے اس سے مل لوں؟ آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم ہم سے کس بات کا انتقام لے رہی ہو۔''

''فضول شکوک و شبہات میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کرو سہراب، میں تمہیں جلد از جلد تمہاری شیریں سے ملواؤں گی۔ میری محبت اور خلوص کو تعصب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش مت کرو۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔ اگر اس وقت تم شیریں سے مل لیے تو

خطرناک قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ میری بات کا یقین کرو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آج سے ساتویں دن تم شیریں کے پاس بیٹھے ہوئے ہو گے۔''

''چلو یونہی سہی، میں نے اتنا انتظار کیا ہے، ایک ہفتہ اور انتظار کر لوں گا، لیکن دیکھو، اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔''

''وعدہ رہا۔'' پھر وہ بولی۔ ''تمہارا چھپوایا ہوا اشتہار شیریں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ سرکس دیکھنے کے لیے آ چکی ہے اور عورتوں والے حصے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے یہ علم نہیں کہ سلمان اور آئرن مین ایک ہی شخص کے دو نام ہیں لیکن جب تم اسے رنگ میں نظر آؤ گے تو وہ تمہیں دیکھتے ہی پہچان جائے گی اور کھیل ختم ہوتے ہی تم سے ملنے کی کوشش کرے گی لیکن تم اس سے نہیں ملو گے۔ ناسازی طبیعت کا بہانہ کر دو گے اور اگلے دن ملنے کا وعدہ کر کے اسے ٹال دو گے اور اس وقت تک ٹالتے رہو گے جب تک پورے سات دن نہ گزر جائیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ شیریں سے ملنے کی خواہش رکھنے اور اشتہار دینے کے باوجود ایک ہفتے تک اس سے نہ ملوں اور اگر وہ ملنے آئے تو ٹالتا رہوں۔''

''ہاں! تمہاری بہتری اور خیر خواہی کے لیے یہی مناسب ہے۔''

سلمان رنگ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آرکسٹرا پر اس کے خیر مقدم کا ساز بجنا شروع ہو گیا تھا۔ ''شیریں سے نہ ملنے کی بجائے زیادہ اچھا یہ ہو گا کہ میں تم سے وعدہ خلافی کروں۔ اگر شیریں یہاں موجود ہے تو کھیل ختم ہوتے ہی میں خود اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں پردہ اٹھاتا ہوا رنگ میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سلمان کا منتظر تھا۔ اس نے سرکس کے آداب کے مطابق ان لوگوں کو سلام کیا۔ خاص طور پر سب سے زیادہ توجہ عورتوں والے حصے کی طرف مبذول کی اور تب اسے شیریں نظر آ گئی۔ خوشی کے باعث اس کے سارے دانت کھلے پڑ رہے تھے اور چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں کھڑا ہوا ہے اور اسے کیا کام انجام دینا ہے۔ اس کا رنگ بھی خوب نکھر آیا تھا۔ وہ اس منظر سے کچھ ایسا مسحور اور مبہوت ہوا کہ پورے سرکس میں اسے صرف شیریں کی موجودگی کا احساس رہ گیا وہ اسے دیکھ رہی تھی اور خود اس کی اپنی ہستی جس کی نظروں کے سامنے اس کی دنیا تھی لیکن وہ اس تک پہنچنے سے قاصر تھا۔

سرکس میں اس قسم کے موقعوں پر جوکروں سے کام لیا جاتا ہے۔ جونہی مسٹر الفی کو محسوس

ہوا کہ سلمان کسی وجہ سے ایک ہی جگہ پر جم کر رہ گیا ہے، انہوں نے دو جوکروں کو اشارہ کیا۔ دونوں جوکر قلابازی کھاتے اور ناچتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ایک جوکر چھلانگ مار کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے جوکر نے اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر کمر پکڑ لی۔ سلمان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو دونوں جلدی سے ہاتھ باندھے اس کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔

''آپ کی کار آپ کو یاد کر رہی ہے ماسٹر!'' ایک نے کہا۔

''کہتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے اوپر سوار کراتے کراتے تھک گئی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

پھر پہلا بولا۔ ''اب اس کی خواہش ہے کہ وہ آپ پر سواری کرے۔''

دوسرے نے روتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ خودکشی کر لے گی۔''

پہلے نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی جوان موت کا الزام آپ پر عائد کیا جائے گا ماسٹر!''

ان کے جملے سن کر لوگ دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے اور قہقہوں کے سیلاب سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پورا پنڈال اڑ جائے گا۔ سلمان کو یاد آ گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ رنگ میں کار آ چکی تھی۔ الفریڈ کی درخواست پر اونچے درجے کے چند تماشائی جو شہر کے معزز لوگ تھے، اس کا معائنہ کر رہے تھے کہ کہیں کسی کھلونے کو تو کار کا نام نہیں دے دیا گیا ہے۔ سلمان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ پبلک کو سلام کر کے زمین پر لمبا لیٹا اور کار کے نیچے گھس گیا۔ تالیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے اور منتظر تھے کہ ابھی کار ہوا میں بلند ہو جائے گی اور سلمان اسے اپنے ہاتھوں پر لیے ہوئے پورے رنگ کا ایک چکر لگائے گا اور پھر کار کو دوبارہ زمین پر رکھ کر اس کے نیچے سے نکل آئے گا۔

کار کے نیچے پہنچ کر معمول کے مطابق اس نے چاہا کہ اسے اوپر اٹھائے لیکن وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔ کار کو اپنے ہاتھوں پر اٹھانا تو بہت بڑی بات تھی، اس میں تو اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ کار کو جنبش بھی دے سکے اور اس لمحے اس کے کانوں میں فاکیہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ''مجھ سے وعدہ خلافی کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔''

سلمان نے منہ سے دکھ بھری آواز نکالی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''مشتعل ہجوم پنڈال میں آگ لگائے گا، کرسیاں توڑ دی جائیں گی، بہت سے لوگ زخمی ہو جائیں گے۔ بہت سی لڑکیاں اغواء کر لی جائیں گی۔ ہوسکتا ہے، ان اغواء ہونے والی لڑکیوں میں شیریں بھی ہو۔''

''نہیں!''

''کیوں نہیں؟ جیسی کرنی، ویسی بھرنی۔ تم نے میرے سارے احسانات کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ بھی بھول گئے کہ تمہاری ساری عزت میرے دم قدم سے وابستہ ہے۔ مزہ تو تب آئے گا جب گلی کوچوں میں خارش زدہ کتوں کی طرح تم اور شیریں.....؟''

سلمان آنے والے واقعات کا تصور کر کے پاگل سا ہو گیا۔ ''رحم کرو فاکیہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسا تم کہو گی، اس سے اختلاف نہیں کروں گا۔''

فاکیہ کی آواز نے کہا۔ ''اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو تمہیں میرے سخت ترین انتقام کا نشانہ بننا پڑے گا، اٹھالو کار۔''

''میرا وعدہ ہے، تم جو کہو گی، میں کردوں گا۔'' سلمان نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اب اٹھاؤ۔'' فاکیہ بولی۔

سلمان نے ہاتھوں کو جنبش دی۔ کار اوپر اٹھ گئی۔ اس نے تالیوں کی گونج میں پورے پنڈال کا چکر لگایا پھر کار زمین پر رکھ کر جب اس کے نیچے سے باہر نکلا تو اس کے دل نے یکا یک چاہا کہ ایک نظر پبلک پر ڈال لے۔ ادھر دیکھ لے جدھر شیریں بیٹھی تھی مگر ہمت نہ ہوئی۔ دراصل اسے ہر حال میں فاکیہ کا کہنا ماننا تھا ورنہ وہ پھر کوئی چال چل سکتی تھی۔ اس نے دل پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور باقی آئٹم پرسکون رہ کر انجام دیے اور سرکس والوں کی جانب سے دیے گئے خیمے میں لوٹ آیا۔

اس وقت اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آرہے تھے..... اس کی حالت بالکل ایسی ہو رہی تھی جیسے سمندر کے نیچے طوفان ہلکورے لے رہا ہو۔ اتنے دنوں کے بعد شیریں نظر آئی تھی مگر وہ اس سے دو باتیں بھی نہ کر سکتا تھا اس لیے وہ مرے مرے قدموں سے لوٹا تھا۔ آتے آتے اس نے چوکیدار کو کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اندر آنے نہ دینا۔ اسے یقین تھا کہ شیریں اسے ڈھونڈتی ہوئی خیمہ تک آجائے گی۔ اگر اس سے وہ بات کرتا ہے تو

فاکیہ ناراض ہو جائے گی اور اس کا ناراض ہونا سلمان کے حق میں بُرا تھا۔ وہ دل پر جبر کیے پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار نے آکر بتایا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اور کوئی نہیں شیریں ہوگی۔ شیریں سے ملنا بنے بنائے کام کو بگاڑنا تھا اس لیے اس نے چوکیدار سے کہہ دیا کہ یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ چوکیدار کے جانے کے بعد بھی اس کا دل کرتا رہا کہ وہ ایک بار اس سے مل لے۔ خود پر جبر کر کے وہ کروٹیں بدلتا رہا پھر پتا نہیں کب اسے نیند آگئی اور وہ سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ جھنجوڑنے پر کھلی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ سامنے حسن مجسم حشر ساماں تھا۔

''کیا بات ہے، آج اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' فاکیہ نے گدگدی کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ، آج صبح صبح اٹھ کھیلیاں کرنے کی کیا سوجھی؟'' سلمان نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کل تم نے میرا دل خوش کر دیا، کیونکہ یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ شیریں کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دو۔''

''اگر کل تم شیریں سے ملاقات کر لیتے تو بہت نقصان میں رہتے۔ اس کے ایک ساتھ ایک ہستی بھی تھی جس کی وجہ سے تم ایک بہت بڑی الجھن میں پھنس جاتے یوں بھی شیریں تمہاری منزل نہیں ہے۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے؟''

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یکا یک تم شیریں سے جلنے کیوں لگیں؟''

''دراصل مجھے تمہارے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو تمہاری زندگی بدل دے، پھر شیریں جن لوگوں کے یہاں ٹھہری ہوئی ہے، وہ لوگ بہت اچھے نہیں ہیں۔ تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کی بھی منزل تم نہیں ہو۔''

''شیریں کو تم نے ہی تو میرے لیے پسند کیا تھا اور اب کہہ رہی ہو اسے بھول جاؤں؟''

''میں نے یہ کب کہا کہ اسے بھول جاؤ۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ میری طرح وہ پیار کے لیے ترستی نہ رہے مگر اس وقت بات کچھ اور ہے اس لیے میری بات مان لو۔''

سلمان کو ہر بات منظور تھی مگر شیریں سے جدائی منظور نہ تھی اسی لیے وہ افسردہ تھا جس کا

عکس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ چہرے ہی سے فاکیہ نے سلمان کے دل کی کیفیت بھانپ لی۔ وہ بولی۔ ''یہ سرکس تمہاری ملکیت بنے گی، کیسے، یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی تم عیش کرو، میں جارہی ہوں۔''

فاکیہ کے جاتے ہی سلمان سوچ میں پڑ گیا کہ اب یہ میری نجی باتوں میں بھی داخل دینے لگی ہے اس لیے اس سے پیچھا چھڑانا ضروری ہوگیا ہے مگر کیسے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا تب اسے اس بزرگ بابا کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی کہ اگر کوئی روح بھٹک رہی ہو تو اس کے لیے قرآن خوانی کرا دینے سے اسے سکون مل جاتا ہے۔ سلمان نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور باہر نکل آیا۔

سلمان تیز تیز قدموں سے مدرسے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ مدرسہ سلمان نے کل ہی دیکھا تھا۔ وہ سیدھا مدرسے کے منتظم کے کمرے میں پہنچا اور ان کے ہاتھ میں سو ریال دے کر کہا، ابھی فاکیہ نامی لڑکی کے نام پر قرآن پاک ختم کرا دیں۔

مولوی صاحب نے نام نوٹ کر کے رسید بنا دی۔ طلبا کو بلا کر نام دیا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کرا دی۔ سلمان مطمئن ہو کر باہر آ گیا۔

سلمان واپس سرکس کی طرف جارہا تھا کہ ایک شخص نے آواز دی۔ ''سن بات سن!''

سلمان رک گیا۔ مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھچڑی بالوں والا شخص سڑک کنارے بیٹھا اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' سلمان نے رک کر کہا۔

''یہاں آ!'' وہ بولا۔

سلمان اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''میں تجھ سے خوش ہوا۔ بول کشف القبور سیکھے گا؟ پیش بینی کا سب سے آسان راستہ سیکھے گا؟ اس نے پُر جلال لہجے میں کہا۔

سلمان حیران رہ گیا اس لیے کہ کشف القبور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پتا نہیں کتنے لوگ اس نام کو سیکھنے میں زندگی ہار گئے مگر کشف کا علم نہ سیکھ سکے۔ سلمان نے پوچھا۔ ''کیسے سکھاؤ گے؟''

''یہ مت پوچھو..... جس پر میرا دل آجائے اسے میں اپنا علم دے دیتا ہوں۔۔''

سلمان وہیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں اس وقت اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ ہر طرح سے اس کے سامنے بچھا جارہا تھا۔

''جا شام میں آنا..... جا جا ابھی چلا جا۔'' کہتا ہوا وہ اٹھ کر چلتا چلا گیا۔

سلمان کچھ دیر تک اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر وہ سرکس کی طرف چل پڑا۔ وقت اچھا خاصہ گزر چکا تھا۔ شو کا وقت نزدیک تھا۔ اس نے چلنے کی رفتار تیز کر دی۔ ابھی وہ شو اسپاٹ سے دور تھا کہ اس نے دیکھا۔ سرکس کے اشتہار بانٹنے والی گاڑی چلی آرہی ہے۔ اس پر لگے لاؤڈ اسپیکر کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی نظر سامنے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ تبھی اس کی نظر موڑ پر پڑی۔ گاڑی مُڑ رہی تھی۔ سلمان نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ اسے دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔

''ارے ماسٹر آپ اس وقت یہاں؟'' ڈرائیور کے لہجے میں حیرت تھی ''وہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔ آج کے شو میں سب سے پہلے آپ کو ایک راؤنڈ لگانا ہوگا تاکہ پبلک اپنی جگہ جلد سنبھال لے اور آخر تک جمی رہے۔''

''ایک ضروری کام تھا۔ اس میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔''

''گرینڈ ماسٹر بہت ناراض ہو رہے ہوں گے۔'' مائیک پر اناؤنسمنٹ کرنے والے لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا ''وہ عادت کے مطابق وقت کی قدر پر لکچر دے رہے ہوں گے۔''

''ٹکٹ بکنا بھی تو ابھی ختم نہیں ہوا ہوگا۔'' سلمان نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں ابھی تو بکنگ آفس پر ہی لوگ لائن لگائے کھڑے ہوں گے۔'' اس نے تائید کی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

جس وقت وہ وہاں پہنچا' واقعی مس آئی کا باپ مسخروں کو جمع کر کے غصے میں ٹہلتے ہوئے لکچر دے رہا تھا۔ لُب لُباب یہ تھا کہ ایرانی کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ وقت کی قدر کرنا جو نہیں جانتے۔ تبھی اس کی نظر سلمان پر پڑی اور وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹا۔ ایسا لگا جیسے وہ اسے پھاڑ کھائے گا مگر نزدیک پہنچ کر نرم لہجے میں بولا ''اے تم کہاں غائب تھے۔ تمہیں پتا نہیں ہے کہ آج شو میں فرسٹ انٹری تمہاری ہے؟''

''ماسٹر! ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا پھر بھی وقت پر تو آ گیا نا۔'' کہتا ہوا سلمان اپنے خیمہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

شو کی گھنٹی بجی تو وہ اندر گیا اور ایک راؤنڈ لگا کر واپس آ گیا پھر وہ آخری آئٹم پیش کرنے کے لیے اندر داخل ہوا۔ پنڈال میں زبردست رش تھا۔ مزید لوگ آ گئے تھے۔ سب ہر کیولس ہر کیولس کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اپنا یہ نیا خطاب سن کر سلمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بڑی شان سے کار کے نیچے داخل ہوا۔ پنڈال میں لوگ دم سادھے بیٹھے تھے۔ نیچے جانے کے بعد اس نے زور لگایا۔ ایک بار دو بار کئی بار کی کوشش کے بعد بھی وہ اسے ایک بال کے برابر بھی اوپر اٹھا نہ سکا۔ پبلک شور مچانے لگی تھی۔ گرینڈ ماسٹر بھاگتا ہوا پنڈال میں آ گیا۔ رنگ میں پہنچنے کے بعد اس نے پوچھا ''کیا بات ہے' پبلک بے قابو ہو رہی ہے۔ زور لگاؤ۔''

''میرے دل کی حرکت بڑھ گئی ہے۔ اگر زور لگایا تو دورہ پڑ سکتا ہے۔''

''ہائے قسمت.... اب کیا ہوگا.... پبلک سرکس میں آگ لگا دے گی..... پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا پھر اس نے مائیک تھام کر کہا ''سامعین! ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے سلمان کی طبیعت یکا یک بگڑ گئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں جن لوگوں نے ٹکٹ لے لیا ہے' ان کے لیے آج کا شو فری ہے۔ کل اسی ٹکٹ پر آپ پھر آ کر شو دیکھ سکیں گے۔ کل تک سلمان کی طبیعت سنبھل چکی ہوگی۔ اب آپ سے صرف اتنی التجا ہے کہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں۔ ابھی آپ کی خدمت میں مس آئی کا ایک انتہائی خطرناک آئٹم پیش کیا جائے گا جسے دیکھتے ہوئے آپ چیخ پڑیں گے۔''

گرینڈ ماسٹر نے اپنی چرب زبانی سے معاملے کو سنبھال کر بیٹی کو اشارہ کیا کہ وہ رنگ میں آ جائے۔ سلمان پسینہ پونچھتا ہوا کار کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ اپنے خیمہ میں پہنچ کر لیٹ گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس سے ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اسے فاکیہ کے لیے فاتحہ نہیں کرانا چاہیے تھا۔ اب وہ پھر سے ایک عام آدمی بن چکا تھا۔ یہاں سرکس میں بھی اب اس کی کوئی جگہ نہیں رہی۔ گرینڈ ماسٹر اسے مار مار کر بھونسا بنا دے گا۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ لے۔ وہ اس بات پر بھی پچھتا رہا تھا کہ کل اس نے شیریں کا پتا کیوں نہیں معلوم کر لیا تھا۔ کنواں نزدیک آ کر بھی دور ہو گیا۔ وہ پیاسے کا پیاسا رہا۔ اب وہ اسے کیسے ڈھونڈے؟ کہاں ڈھونڈے؟

وہ اس شہر میں ہے تو اسے ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ تمام راستے تو بند ہی ہو چکے ہیں کم سے کم اسی ایک سہارے کو تھام کر میں اپنی زندگی بیتا سکتا ہوں۔

یہ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر خیمہ سے باہر نکلا اور ادھر ادھر نظر ڈالتا ہوا وہ سرکس گراؤنڈ سے باہر آ گیا۔

سڑک پر گاڑیاں کھڑی تھیں وہ ایک کالسکہ (تانگہ) کے نزدیک پہنچا۔ کوچوان اسے دیکھتے ہی بولا ''آغائی جانا ہے؟''

''سوق!'' سلمان نے بازار کا بتایا اور بیٹھ گیا۔ تانگہ اپنے راستے پر بھاگنے لگا مگر اس سے بھی تیز سلمان کا ذہن دوڑ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس پر قنوطیت سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خود کو بہت ٹوٹا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔

''آغائی ہم سوق آ گئے۔ کہاں روکنا ہے؟'' تانگے والے نے پوچھا۔

''یہیں روک دو۔'' سلمان نے کہا اور تانگہ رکتے ہی نیچے اتر گیا۔ ایک تومان دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔

کچھ آگے جاتے ہی اسے ایک ہوٹل نظر آیا اور وہ اس ہوٹل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

سلمان نے بسکٹ منگوائے تھے کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس کے پاس کھڑا ہوا کہہ رہا ہو، آخر آ گئے نا اپنی اوقات پر۔ اس نے سر گھما کر دیکھا لیکن کوئی شخص بھی نظر نہیں آیا، اس کے بعد میز پر نظر گئی تو نہ پلیٹ میں بسکٹ تھا اور نہ فنجان میں قہوہ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ چیزیں کہاں گئیں؟ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بے خیالی میں میں نے خود ہی ان چیزوں کو ختم کر دیا ہو، اشارے سے بیرے کو بلا کر کہا۔ ''ایک قہوہ اور لے آؤ۔''

بیرے نے منٹ بھر میں یہ دونوں چیزیں لا کر رکھ دیں۔ احتیاطاً سلمان نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کوئی ایسا شخص تو وہاں موجود نہیں ہے جو اس سے مذاق کر رہا ہے بعد ازاں بسکٹ کی طرف متوجہ ہوا لیکن ایک بار پھر فنجان اور پلیٹ دونوں خالی ہو چکی تھیں۔ اب کی بار ایسا لگا جیسے کوئی شخص اس کی بے بسی اور بے چارگی پر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس رہا ہو۔

چار مرتبہ ایسا ہوا۔ بیرا بار بار قہوہ اور بسکٹ لا لا کر پریشان ہو گیا۔ پانچویں مرتبہ منہ بگاڑ کر کہنے لگا، تمہیں جتنا قہوہ اور بسکٹ کی ضرورت ہے، بس ایک بار ہی بول دو، ہم کو تنگ مت کرو۔

چھٹی مرتبہ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ بیرے سے مزید قہوہ لانے کے لیے کہے۔ بھوکا ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کاؤنٹر پر جا کر ادائیگی کی۔ ہوٹل سے باہر نکل رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا وہی فقیر اسے دیکھ کر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''کشف القبور سیکھے گا۔ وہ شخص کشف کیا سیکھ سکتا ہے جو

اپنی قہوہ تک کی حفاظت نہیں کر سکتا۔"

سلمان فوراً اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "میری مدد کرو بابا! تمام زندگی تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گا۔ میرا ایک قیمتی سہارا تھا، ایک بہت بڑا سہارا جسے میں نے خود گنوا دیا۔ اب اخراجات پورے کرنا دشوار ہیں۔" اسے اب اپنی غلطی پر پشیمانی تھی کہ اس نے فاکیہ کے لیے قرآن خوانی کیوں کرائی کہ اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو سکون مل گیا۔

"کس چکر میں پڑا ہے؟ اچھے اچھے لوگ کشف حاصل کرنے کے نام پر زندگی ہار گئے پھر بھی کچھ حاصل نہ کر سکے۔" اس نے چمٹا بجاتے ہوئے کہا۔ "یہ علم تو وہی سیکھ سکتا ہے جس پر اوپر والے کا خاص فضل ہو۔"

سلمان نے کہا۔ "بابا! اگر تم نے میری مدد نہیں کی تو میں یہیں سر پھاڑ کر مر جاؤں گا۔" وہ گویا پاگل ہو چکا تھا۔ "خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔"

فقیر نے گھور کر اسے دیکھا۔ دیر تک اس کے چہرے پر اپنی لال انگارہ جیسی آنکھیں گاڑے ہوئے بیٹھا رہا، پھر ایک عجیب سی آواز میں بولا۔ "کشف القبور سیکھنے والا کبھی خود فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے اپنی تمام زندگی فقیروں کی طرح گزارنا پڑتی ہے۔ دوسروں کے موٹے جھوٹے کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے ایسا شخص۔ کیا تم ایسی زندگی پسند کرو گے؟" اس سے قبل کہ وہ اس کی بات کا کوئی جواب دیا، وہ خود ہی کہنے لگا۔ "شام کو سوق پر ملو۔"

سلمان نے کہا۔ "سوق پر میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ تہران میرے لیے ایک بالکل نئی جگہ ہے۔ یہاں کے راستوں اور علاقوں سے مجھے کوئی واقفیت نہیں۔"

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "جسے کشف کا علم حاصل کرنے کا شوق ہوگا، وہ خود ہی سوق پر پہنچ جائے گا اور مجھے ڈھونڈ لے گا۔ جذبہ صادق ہونا چاہیے۔"

اس کی اجازت سے وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ گزشتہ رات سے اب تک سلمان نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھوک ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گلی میں خشک میوہ کی ریڑھی والا ملا۔ سلمان نے اس سے آخروٹ خرید لیے تاکہ انہیں کھا کر پیٹ کی آگ کو کچھ کم کر سکے۔ سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا، وہاں جا کر سلمان ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک آخروٹ چھیلا لیکن وہ اندر سے بالکل کھوکھلا نکلا۔ دوسرا چھیلا، تیسرا چھیلا، یہاں تک کہ سارے

آخروٹ چھیل ڈالے لیکن کسی میں بھی گودا نہیں تھا۔ آخروٹ فروخت کرنے والے پر اسے غصہ آیا۔ کمبخت دن دیہاڑے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ پارک سے باہر نکل کر ریڑھی والے کے پاس گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ریڑھی والے کا گریبان کھینچتے ہوئے کہا۔ "شرم نہیں آتی دوسروں کو لوٹتے ہوئے۔"

آخروٹ والا اس طرح زور سے چلایا جیسے سلمان نے اسے قتل کر دیا ہو۔

"دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے عجیب عجیب شکلوں والے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کوئی بلوچی بول رہا تھا کوئی فارسی ایک نے آگے بڑھ کر سلمان کے ہاتھ سے میوہ والے کے گریبان کو چھڑا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

سلمان نے کہا۔ "بات کیا ہوتی؟ تم لوگ خود دیکھ لو۔ یہ شخص ایسے آخروٹ بیچ رہا ہے جو اندر سے بالکل خالی ہیں۔ اسے تو فوراً پولیس میں دے دینا چاہیے۔"

اپنی اپنی زبان میں وہ لوگ ایک دوسرے کو سلمان کی بات کا مطلب سمجھانے لگے، پھر ایک شخص نے اس کی بات کی تصدیق کرنے کے لیے ریڑھی سے ایک آخروٹ اٹھا کر چھیلا اور اسے دوسروں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ جھوٹا شخص ہے۔ یہ گودا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کی کھوپڑی میں آپ ہی گودا نہیں لگتا۔"

سلمان کو لوگوں کی باتوں کا جواب دینا دوبھر ہو گیا۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی میں سلمان کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ تین شخص تو اس طرح آنکھیں دکھا رہے تھے جیسے اسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ بمشکل تمام ان لوگوں کی منت سماجت کر کے اس نے اپنا پیچھا چھڑایا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ان میں سے کسی نے اس کی مرمت نہیں کی البتہ دور تک ان کے طنزیہ قہقہے اس کا تعاقب کرتے رہے۔

بھوک اب ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کی نظروں سے دور ہوا تو کسی نے اس کے کان میں کہا۔ "کیا بھوک بہت زیادہ ستا رہی ہے؟"

سلمان نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی موجود نہیں تھا۔ تو یہ آواز کس کی تھی؟

"یقیناً کوئی نہ کوئی نظر نہ آنے والی مخلوق میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔" سلمان بڑبڑایا۔

"ہوٹل میں بھی اسی نے پریشان کیا تھا اور آخروٹ کے سلسلے میں بھی اسی کی ستم ظریفی تھی۔" فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سلمان نے اس نظر نہ آنے والی مخلوق کو اس طرح مخاطب کیا کہ دوسرے لوگ سلمان کی بات نہ سن سکیں۔ "تم جو کوئی بھی ہو، میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ کیا تم چاہتے

ہو کہ میں بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاؤں۔''

سلمان کے کانوں میں کوئی ہنسا۔ ''موت اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔''

''آخر تم ہو کون؟''

''وہی جسے تم نے بھلا دیا ہے۔''

سلمان چلتے چلتے رک گیا۔ ''تم...... تم فاکیہ تو نہیں ہو؟ اس کی خوشبو محسوس کہاں ہوئی؟''

ہنسی کی آواز آئی۔ ''ہاں! میرا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ تمہاری وجہ سے میں کئی قوت سے محروم ہو گئی ہوں۔''

''تم تو سکون کی نیند سو گئی تھیں؟''

''میری قسمت میں سکون کی نیند کہاں؟ تھوڑی دیر کے لیے جھپکی سی آ گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو تم نہ تھے اور میں ایک بار پھر فضا کی پنہائیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ آخر میں نے تمہیں تلاش کر ہی لیا۔ تم ہوٹل میں بیٹھے ہوئے قہوہ پی رہے تھے۔''

سلمان نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میرے ساتھ تم مذاق کرتی رہی ہو؟''

جواب دینے کی بجائے وہ ہنس پڑی۔

''بھوکوں مار دیا تم نے۔'' سلمان نے برا ماننے کی بجائے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم مجھے مل گئیں۔ میں تمہاری بے حد کمی محسوس کر رہا تھا۔ خصوصاً تہران میں تو قدم قدم پر مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''جھوٹے۔'' اس کے کان میں آواز آئی۔

''نہیں فاکیہ! جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں نے تمہیں بہت یاد کیا ہے۔ تمہارے اچانک کھو جانے کے بعد کوئی ایسا نہیں تھا جو میری مدد کر سکے۔ مجھے مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچا سکے۔'' سلمان نے سوچا کہ قرآن پاک بخشنے کے بعد بھی اس کی بے چین روح کو سکون نہیں ملا۔ اسی لیے پھر آ گئی۔ اب اسے بہلائے رکھا جائے ورنہ یہ نقصان کا باعث بنے گی۔

فاکیہ اس کے جھانسے میں آ گئی اور بولی۔ ''بس بس! زیادہ محبت بگھارنے کی ضرورت نہیں۔ میری بخشائش کے لیے تم نے جو کیا وہ ادھورا تھا اسی لیے میں لوٹ آئی۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو، راہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ جا کر کسی ہوٹل میں بیٹھو، کچھ کھا پی بھی لینا اور مجھ سے باتیں بھی کر لینا۔''

اس کے کہنے کے مطابق سلمان قریب ہی کے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' جب وہ چلو ماہی کا آرڈر دے چکا تو فاکیہ کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

سلمان نے کہا۔ ''ابھی تو یوں ہی جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوں۔ رات ہو جائے گی تو کسی سڑک کے کنارے لیٹ کر سو جاؤں گا۔''

''پرواہ مت کرو۔'' اس نے دلاسا دیا۔ ''جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں ایک پیسے کی بھی تکلیف نہیں ہو گی۔ بابا کی خوشامدیں کیوں کر رہے تھے؟''

''وہ مجھے کشف القبور سکھائے گا۔''

''وہ بدمعاش کیا جانے کشف القبور۔''

''تم نہیں جانتیں، وہ بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی پہچان گیا کہ میں کس کی خاطر بھٹک رہا ہوں۔ اب کیا رائے ہے تمہاری؟ جاؤں یا نہ جاؤں؟''

''ضرور جاؤ! تھوڑا سا تجربہ ہی ہو جائے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے دھوکے باز پڑے ہوئے ہیں۔ ہوٹل سے نکل کر وہاں تک کے لیے ٹیکسی کر لینا۔''

سلمان نے منہ بنایا۔ ''میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں؟''

''کہہ جو دیا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں پیسوں کا غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کم سے کم سو تومان ہر وقت تمہاری جیب میں رہیں گے اور اگر کبھی زیادہ کی ضرورت ہوئی تو تمہارے ایک اشارے پر وہ بھی مل جائیں گے۔''

بابا تو واقعی بڑا چار سو بیس نکلا۔ سلمان سے کہا تھا کہ کشف القبور سکھائے گا لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچا تو کہنے لگا۔ ''میں تمہیں دو گنے نوٹ کرنے کی ترکیب دکھاؤں گا۔ یہ طلسمی اینٹ ہے۔ اس کے نیچے جتنے چاہو نوٹ دبا دو اور بارہ سے لے کر ایک تک الٹی گنتی گنو۔ اینٹ اٹھا کر دیکھو گے تو تمہیں ہر نوٹ کے ساتھ ایک نیا نوٹ رکھا ہوا نظر آئے گا۔''

اس کے کہنے پر سلمان نے دس ریال کا ایک نوٹ اس اینٹ کے نیچے دبا دیا۔ الٹی گنتی گن کر اینٹ کو ہٹایا تو دو نوٹ موجود تھے۔ دوبارہ اس نے دس دس ریال کے تین نوٹ دبائے اور گنتی کے بعد چھ نوٹ کر لیے۔

''علم کشف کی اس اینٹ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔'' بابا نے کہا۔

''ایسا نہ کہو، علم کشفا عالی ہے۔'' سلمان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اچھا اگر میں تمہیں علم کشف سکھادوں تو تم کیا دو گے؟''

سلمان نے کہا۔ ''جو تم مانگو گے۔''

''ایک ہزار تومان؟''

''ہاں میں ایک ہزار تومان بخوشی تمہیں دے دوں گا۔''

''ابھی، اسی وقت دے سکتے ہو۔''

''جی ہاں!''

''نکالو ہزار تومان! میں تمہیں ابھی سکھاتا ہوں۔''

''پہلے سکھاؤ۔''

اس نے منہ میں ہاتھ رکھ کر سیٹی بجائی اور کرر کرر کرکے شکاری چاقو کھول لیا۔ سیٹی بجتے ہی نجانے کدھر سے اسی کے تن وتوش کے تین آدمی اور نکل آئے۔ سب کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔

''اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو جو کچھ تمہارے پاس ہے، یہیں نکال کر رکھ دو۔'' اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔

چاروں نے مل کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ایک شخص نے گریبان میں ہاتھ ڈالا، دوسرے نے پیر پکڑ لیے۔ تیسرے نے دونوں ہاتھ۔ چوتھا جیب سے تومان نکالنے کے لیے بڑھا۔ اسی وقت فاکیہ نے سرگوشی کی۔ ''کار کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لینے اور سینے پر ہاتھی کو کھڑا کر لینے والا مات نہیں کھا سکتا۔''

اس کی اس سرگوشی کے ساتھ ہی سلمان کو اپنے جسم میں طاقت سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے گھوم کر جھٹکا دیا تو چاروں کے چاروں بھد سے زمین پر گرے۔ منہ اور ناک میں بھری ہوئی مٹی جھاڑتے ہوئے وہ لوگ دوبارہ اٹھے اور اس کی طرف لپکے۔ ہر ایک کے لیے سلمان کا ہلکا سا ایک گھونسا ہی کافی تھا۔ اب کی مرتبہ وہ لوگ نیچے گرے تو انہوں نے جلدی اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ سلمان چلنے لگا تو شاید انہیں یہ خیال آ گیا کہ چار آدمیوں کے مقابلے میں ایک آدمی کا کامیاب ہو جانا بہت شرم کی بات ہے۔ چاقو سنبھال کر پوری قوت سے انہوں نے ایک بار پھر حملہ کر دیا لیکن سلمان نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سینے پر ان کے وار روکے۔ بھلا

جس سینے پر سڑک پر کوٹنے والے پتھر کوٹ چکے ہوں، اس پر ان لوگوں کے چاقو کیا اثر کرتے۔ دو آدمیوں کے چاقوؤں کے پھل دوہرے ہو گئے۔ ایک کا چاقو ٹوٹ گیا۔ چوتھے کے چاقو نے اس کے سینے سے اچٹ کر خود اس کے اپنے ہاتھ کو زخمی کر دیا۔ ابھی وہ لوگ حیران ہو ہی رہے تھے کہ سلمان نے ایک ایک چپت رسید کر کے ان سب کو زمین بوس کر دیا۔

''تمہاری جیبوں میں جو کچھ ہے۔'' سلمان نے کڑک کر کہا۔ ''اسے نکال کر میرے حوالے کر دو۔ اگر کسی نے بھی مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو اس کے گھر اس کی لاش جائے گی۔''

تینوں بدمعاشوں نے اپنی جیبیں فوراً خالی کر دیں۔ ریال کے علاوہ ان کی جیبوں سے بندے، انگوٹھیاں اور سونے کی کئی دیگر چیزیں برآمد ہوئیں مگر بابا بڑا کائیاں نکلا، جوں ہی سلمان اس کے پاس پہنچا، اس نے جیب سے ریوالور نکال کر پورے چھ فائر سلمان کے سینے پر داغ دیئے مگر جب اس نے دیکھا کہ گولیاں بھی سلمان کے سینے سے اچٹ کر نیچے گر گئیں اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں تو خوف وحیرت کے باعث وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔

اسے بھی اپنے سینے کی اس خوبی پر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو سرکس میں سب سے اچھا منظر یہی قرار پاتا۔ کمپنی کی طرف سے اعلان عام کر دیا جاتا کہ جو شخص آئرن مین کے سینے میں گولی اتارنے اور اسے قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے مبلغ دو ہزار تومان نقد انعام دیا جائے گا۔ پبلک کو اپنے ریوالور اور کارتوس استعمال کرنے کی اجازت ہوتی۔ تہلکہ مچ جاتا تمام دنیا میں۔ لوگ اس علی بابا کو بھول جاتے جو پوری رفتار سے چلتی ہوئی موٹر کو اپنے ہاتھوں سے روک لیا کرتا تھا۔

سب کا مال اکٹھا کر کے اس نے مسکراتے ہوئے ایک چھوٹی سی پوٹلی بنائی اور بڑے باوقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر پہنچا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' فاکیہ کی آواز اس کے کان میں آئی۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کیوں کہ اب مجھے سرکس نہیں جانا۔'' سلمان نے اسے جواب دیا۔ ''کہیں نہ کہیں سڑک کے کنارے لیٹ کر سو جاؤں گا۔''

''یہ تہران ہے، ایک سے ایک بڑا ٹھگ یہاں پڑا ہوا ہے۔ چور بازار کے ایک کنارے سے کار داخل ہوتی ہے اور دوسرے کنارے تک پہنچتے پہنچتے ایسی غائب ہوتی ہے کہ پولیس والے بھی پتہ نہیں لگا سکتے۔''

''پھر بتاؤ میں کیا کروں؟''

''تم یہ کرو کہ کسی اچھی دکان سے اپنے ناپ کے دو تین سوٹ اور ایک سوٹ کیس خریدو پھر ایک اچھا سا سوٹ پہن کر پرنس ہوٹل میں جاؤ اور وہاں قیام کرو۔''

''پرنس میں؟'' سلمان اچھل پڑا۔ ''جہاں بڑے بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ میں تو اس کے دروازے تک بھی جانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

''بے وقوف نہ بنو۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تک تمہیں روپے کی طاقت کا اندازہ نہیں، ہوٹل والے انسان نہیں دیکھتے، اس کی جیب کو دیکھتے ہیں۔''

''کیا ضروری ہے کہ جیب میں روپے ہوں تو پرنس ہی میں ٹھہرا جائے؟''

''ہاں! تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ تم ہوٹل میں پہنچ کر یہ ظاہر کرو گے کہ تجارت کے لیے آئے ہو اور کسی اچھے پارٹنر کی تلاش میں ہو۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اگر مستقبل کی باتیں معلوم ہوتیں تو میں اس طرح بھٹکتی نہ پھرتی۔''

فاکیہ کے کہنے پر سلمان نے ایک ٹیکسی رکوائی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کے لیے کہا۔

ایک اسٹور سے اس نے کچھ سوٹ خریدے اور فاکیہ کے کہنے کے مطابق کپڑے تبدیل کر کے دوسری ٹیکسی میں پرنس کے لیے روانہ ہوگیا۔

❁

چند ہی دنوں میں پورے پرنس میں وہ مشہور ہوگیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رقم میں بڑی طاقت ہوتی ہے مگر اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں ایک ایسی چیز بھی ہے جسے رقم کے بل بوتے پر نہیں خریدا جاسکتا ہے، اور وہ ہے علم۔ ایک جاہل انسان کی زندگی کس کام کی۔ لوگ اس کی باتوں پر منہ پھیر پھیر کر ہنستے تھے۔ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہیں کہ کیسا جاہل شخص ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا شخص دنیا کی اہم ترین خبروں تک کے لیے دوسروں کا دست نگر اور محتاج ہوتا ہے۔

جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے اور تہران کی اعلیٰ ترین فیشن ایبل سوسائٹی میں

سلمان کا اٹھنا بیٹھنا بڑھتا جارہا تھا۔ سلمان کو اپنی جہالت کا احساس شدید تر ہوتا جارہا تھا۔ فاکیہ کی روح اس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ سلمان کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

اس کے گرد جن لوگوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا، ان میں سے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سلمان کو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آہی جاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ایسے شخص سے دوستی کروں جو ہر لحاظ سے مکمل ترین انسان ہو، جس کی کسی عادت یا خصلت سے خباثت نہ ٹپکتی ہو۔

اسی دوران میں فرزون نامی ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ آس زادہ نامی شخص کا لڑکا تھا۔ تعلیم بھی معمولی نہیں تھی۔ اس کے رکھ رکھاؤ بول چال اور عادت واطوار کے باعث خود بخود سلمان کا دل اس کی طرف کھنچتا تھا۔ اسے بھی سلمان سے کچھ لگاؤ ہوگیا تھا۔ جب بھی ہوٹل میں آتا، سلمان کے ساتھ ایک پیگ ضرور پیتا۔ بلانوشی کا قائل نہیں تھا۔

سلمان کا دل چاہتا تھا کہ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہے۔ اس کی باتوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ سب سے بڑی اس کی خوبی یہ تھی کہ دنیا کے ہر موضوع پر اس کی نظر تھی اور فنون لطیفہ سے لے کر سپاہ گری تک وہ ہر مسئلہ پر بے تکان گفتگو کرسکتا تھا۔

''فرزون کیسا لگا؟'' اس رات فاکیہ نے یکا یک اس سے ایسا سوال کر دیا کہ وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔

''ارے بھائی کچھ تو بولو۔'' فاکیہ جھلا کر بولی۔

''اچھا ہے۔''

''خوبصورت ہے؟''

''ہاں جاذب نظر ہے، جامہ زیب ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔''

''اس کی بہن اس سے بھی خوبصورت ہے، ملو گے؟''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''یہی کہ کوئی لڑکی بے ارمان نہ رہے۔ سب کو چاہنے والا مل جائے۔ سب چاہی جائیں۔'' اس کی آواز میں حسرت تھی۔

''تم صرف لڑکی تلاش کر کے دیتی ہو پھر اسے زمانے کے گرداب میں گم کر دیتی ہو۔''

''لگتا ہے شیریں کا بھوت ابھی تک اترا نہیں ہے۔''

''ہاں اس کی یاد کسی بھی طرح دل سے محو نہیں ہوتی۔''

''وہ بھی ملے گی۔اس کے ساتھ بھی وقت گزار لینا مگر ابھی فرزون کی بہن کی فکر کرو۔''

''مگر اس تک پہنچوں گا کیسے؟'' سلمان کے اندر بیٹھا شیطان انگڑایاں لینے لگا۔

''بس انتظار کرو، دیکھو میں کیا کھیل کھیلتی ہوں۔''

اگلے روز اخباروں میں ایک خبر میں بتایا گیا کہ کیپٹن فرزون نے کنپٹی پر پستول رکھ کر خودکشی کر لی۔

فرزون کی موت کو چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک شام جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کافی پی رہا تھا کہ فاکیہ نے اسے لتاڑا۔ ''فرزون تمہارا دوست تھا۔'' اس نے اس سے کہا۔ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کی موت کے بعد تم نے اس کے گھر کا رخ تک نہیں کیا، تمہیں اس کے گھر جانا چاہیے۔ اس کے گھر والوں سے اظہار ہمدردی کرنا چاہیے۔ رخسار کے ہونٹوں پر بھائی کی موت کے بعد سے مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ تمہیں چاہیے کہ اسے صبر کی تلقین کرو، اسے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری ہمدردی کے چند الفاظ اس کے لیے آب حیات ثابت ہوں۔''

وہ فرزون کے کفن دفن میں شریک ہوا تھا وہیں اس نے سحر کو دیکھا تھا۔ دودھ جیسے سفید لبادے میں ملبوس، نرگسی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہتے ہوئے۔ اسے تو انسان سے زیادہ وہ ایک پری معلوم ہو رہی تھی، لیکن کفن دفن کے بعد، اسے اپنی چند در چند مصروفیات کے باعث دوبارہ ان لوگوں کا خیال نہیں آیا، شاید وہ ان لوگوں کو بالکل ہی بھول جاتا مگر فاکیہ نے بروقت اسے ٹوک کر اس کا فرض یاد دلایا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو فاکیہ!'' سلمان نے نظر نہ آنے والی فاکیہ کی روح سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میرا احسان نہیں مانو گے؟'' اس کی اتراتی ہوئی آواز آئی۔ ''اگر آج میں تمہاری مدد نہیں کرتی تو آج بھی تم سڑک پر بھٹک رہے ہوتے۔''

''تمہاری بات ہی اور ہے۔'' سلمان نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ ''تم تو اگر تمام دنیا کی بادشاہت بھی میرے قدموں میں لا کر ڈال دو تو کم ہے۔''

''کیوں؟'' تجاہل عارفانہ کے ساتھ اس نے پوچھا۔

''میں تمہارا ہوں نا۔''

سلمان نے ایک ہلکی سی سسکی کی آواز سنی۔ کئی لمحوں تک وہ کچھ نہیں بولی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو، بالآخر اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''ہاں! تم میرے ہو اور میں تمہاری۔ میرا تمہارا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ میرا تم پر کوئی احسان نہیں۔ حقیقت میں احسان تو تمہارا ہے کہ تم میری خدمت کو قبول کر لیتے ہو۔''

اسی رات جب وہ وقت گزاری کا سوچ رہا تھا کہ فاکیہ آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''کیا تم اپنے دوست کے گھر نہیں جاؤ گے؟''

''ابھی فون کر کے بتاتا ہوں۔''

اس نے فرزون کے گھر فون کیا اور اس کے والد کو بتایا کہ وہ ان کے آنجہانی بیٹے کی ایک امانت واپس کرنا چاہتا ہے۔ امانت کا خیال فون کرتے کرتے آ گیا تھا ورنہ مقصد صرف اتنا تھا کہ انہیں اگلی صبح کو اپنی آمد سے مطلع کر دے، امانت کا نام سن کر انہوں نے فوراً کہا کہ وہ بے چینی سے اس کے منتظر رہیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ بھی کہا کہ اگر کسی وجہ سے وہ ان کے گھر نہ پہنچ سکا تو دس بجے وہ خود اس کے پاس آ جائیں گے۔

❁

سلمان وقت مقررہ پر اس گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہی وہ گھر تھا جس کے اکلوتے وارث کو اس کی وجہ سے موت ملی تھی۔ بام، کے نزدیک ایک گاؤں کے معمولی سے مولوی کے گھر پیدا ہونے والے معمولی لڑکے نے غیر معمولی قوت حاصل کر لی تھی اور یہ سب اس نے اپنی قوت سے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے کے مصداق اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اس قوت کے بل پر اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔

اس نے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ سامنے ایک اچھی خاصی عمر کا شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں حزن و ملال ہلکورے لے رہا تھا وہ غم آلود لہجے میں بولا۔ ''جی فرمایئے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد خود ہی گویا ہوا۔ ''کہیں تم وہی تو نہیں ہو جس نے فون کیا تھا کہ میرے پاس آپ کے بیٹے کی کوئی چیز ہے جو واپس کرنا ہے؟''

''جی ہاں میں وہی ہوں۔'' سلمان نے آہستہ آواز میں کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جس کا کڑیل جوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا مر جائے وہ غم کے پہاڑ تلے آ جاتا ہے۔ اس غم کا اثر عرصے تک اس پر رہتا ہے۔

''اندر آ جاؤ بیٹا۔'' کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ گیا۔

سلمان نے اپنے ہاتھ میں اس پیکٹ کو سنبھال رکھا تھا جس میں رباب پیک تھا جو اس نے آج ہی خریدا تھا۔ فرزون نے باتوں کے درمیان ذکر کیا تھا کہ اس کی بہن کو رباب بجانے کا شوق ہے۔ اس کے پاس رباب ہے پھر بھی اس نے فرمائش کی ہے کہ ایک نیا رباب لا دوں۔ میں نے سمرقند سے ایک رباب منگوایا مگر وہ ایک دوست نے مانگ لیا اب واپس دینے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے، اس سے مانگتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ اسی لیے سلمان نے ڈھونڈ کر سمرقند کا رباب خریدا تھا۔ اس پیکٹ میں وہی رباب تھا۔

اسے مجلسی (ڈرائنگ روم) میں بٹھا کر بڑے میاں نے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ تمہارے پاس کون سی امانت ہے جسے تم دینے کے لیے بے چین تھے؟''

''یہ دراصل فرزون نے رخسار کے لیے خریدا تھا، اس لیے میرا خیال ہے کہ اسی کے ہاتھ میں دوں۔'' دراصل سلمان ان لوگوں کے قریب آنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے یہ فرمائش کی تھی۔ (اسلامی انقلاب سے پہلے ایران میں عورتوں میں حجاب کی اتنی پابندی نہیں تھی) بڑے میاں اس کی بات سن کر اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو ان کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے تعارف کرایا۔ ''یہ میری چھوٹی بیٹی سحر طبیزائی ہے اور یہ بڑی بیٹی رخسار طبیزائی۔''

لڑکیوں نے سلامتی کہا۔ سلام کا جواب دے کر سلمان نے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ رخسار نے پیکٹ لے کر کھولا، رباب دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حیرت کی پرت سی چھا گئی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے سلمان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تو اخوندزادہ کے پاس تھا؟''

''پہلے اس کے پاس تھا مگر بعد میں ایک دن کے لیے میں نے لے لیا تھا۔'' اس نے مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر رخسار کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئی ہے۔

سلمان نے اس کی نظروں کی چبھن سے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ میرا پیارا دوست اس دنیا میں نہیں رہا؟''

سلمان کی بات پر سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ رخسار نے ماحول کے بھاری پن کو دور کرنے کے لیے کہا۔ ''قہوہ لے آؤں؟''

''ارے ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔'' خلیل طبیزائی نے کہا۔

رخسار اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بڑے میاں بولے۔ ''کبھی یہ بوڑھا

خود پر بڑا فخر کرتا تھا، بڑے غرور سے کہا کرتا تھا کہ خلیل طبیزائی کا کوئی ہمسر نہیں۔ میرے بیٹے کی طرح ہے کوئی قابل، مگر آہ خدا نے میرے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ مجھے سزا دی ہے کہ کبھی بڑا بول نہ بولو۔''

''خدا کی چیز تھی اس نے لے لی اس پر صبر کرنا ہی بہتر ہے۔'' سلمان نے دلاسہ دیا۔

''ہاں بیٹا! اب تو یہی کہہ کر خود کو بہلاتا ہوں۔'' خلیل طبیزائی نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''بیٹا تم نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟''

''میرا نام سلمان ہے۔ میں بام کار ہنے والا ہوں۔ یہاں سیاحت کے لیے آیا ہوں۔ اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں جہاں فرزون وقت گزارنے جایا کرتا تھا۔''

''تہران میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہو؟'' خلیل طبیزائی نے پوچھا۔

''اس بار چار ماہ ہو گئے، ویسے آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

''ہوٹل میں تو بہت کرایہ لگ رہا ہوگا؟''

''مصارف تو ضروری ہے، کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔''

''اگر چاہو تو یہیں رہ لو، فرزون کا کمرا خالی پڑا ہے، اس کا ایک راستہ باہر سے بھی ہے۔''

ایسا لگتا تھا جیسے فاکیہ نے تمام راستے اس کے لیے کھول دیے ہیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ مگر انکار بھی ضروری تھا۔ اس کا انکار سن کر خلیل طبیزائی نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں سننا چاہتا جو کہہ دیا تم وہی کرو۔'' پھر اس نے سحر کی طرف مڑ کر کہا۔ ''بیٹی اسے لے جا کر کمرا دکھا دو۔''

سحر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آئیے میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔''

وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سحر کے ہر اٹھتے قدم اس کے دل پر پڑ رہے ہیں۔ وہ ہواؤں میں اڑتا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ کمرے میں پہنچ کر سلمان نے کہا۔ ''کمرا تو واقعی بہت اچھا ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔''

سحر شرما کر رہ گئی اس نے تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سلمان باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ فاکیہ کے آنے کا احساس ہوا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا تبھی فاکیہ کی آواز آئی۔ ''تم نے اس وقت یہاں ٹھہر کر اچھا نہیں کیا۔''

''کیا یہ لوگ آدم خور ہیں جو مجھے کھا جائیں گے!''

''دراصل سحر کا باپ عملیات کرتا ہے۔اس کے موکل بھی ہیں۔اس سے زیادہ خطرناک اس کا استاد ہے۔اس کا نام بن فاتح ہے۔اس سے ہوشیار رہنا وہ بہت بڑا کمینہ ہے۔ویسے اسے دیکھتے ہی تم پہچان لوگے۔''

''ابھی تک تو اس سے ملاقات ہوئی نہیں ہے جب ملاقات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔''

''شیطان کا نام لو وہ حاضر ہو جاتا ہے۔میں تو چلی اب تم نمٹو۔میرا ٹھہرنا خطرناک ہے۔'' فاکیہ غائب ہوگئی۔

سلمان لیٹا لیٹا بن فاتح کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کمرے کے باہر سے سحر کی آواز آئی۔''کیا سو گئے؟''

''نہیں جاگ رہا ہوں!'' سلمان نے کہا۔اسے خوشی ہوئی تھی کہ وہ پھر سے اپنی خوشبو بکھیرنے آگئی۔

''پدر بزرگوار نے یاد کیا ہے۔ان کے ایک دوست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

سلمان سمجھ گیا کہ کون ملنے آیا ہے۔وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی۔اسے دیکھتے ہی سلمان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔

اس نے سلمان کو دیکھتے ہی کہا۔''جوان میں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''جی فرمائیں!'' سلمان نے شائستہ لہجے میں کہا۔اس نے اسے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

''بیٹے بعض قوتیں انسان کے لیے نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔''

''جی!'' سلمان نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''یہ تمہاری قسمت تھی کہ فاکیہ تم سے ٹکرا گئی۔دوستی برابر کے لوگوں سے ہوتی ہے۔وہ کسی بھی وقت تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اس لیے تم اس سے دست بردار ہو جاؤ۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اسے قابو کرنے کے لیے میں عملیات کر رہا ہوں۔''

''آپ کو کس نے روکا ہے۔آپ کوشش کریں۔''

''ہر بار تم آڑے آرہے ہو۔اسی لیے میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ تم درمیان میں نہ آؤ۔'' بن فاتح نے کہا۔

''بزرگو! میں کب آرہا ہوں۔میں تو ایک بے بس، بے علم، بے بساط نوجوان آپ عامل کامل میرا آپ کا کیا مقابلہ؟'' فاکیہ نے شیریں کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اسی لیے وہ اطمینان بھرے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

''تم اسے دھتکار دو۔دراصل اس میں تمہاری محبت کی قوت ہے۔محبت کی قوت جب تک ختم نہیں ہوگی وہ قوی رہے گی۔''

''بزرگو کوئی اپنے منہ کا نوالہ بہ خوشی کسی کو نہیں دیتا۔فاکیہ میرے بہت کام آتی ہے میں اس سے کیسے دست بردار ہو جاؤں؟''

''اس انکار کی تمہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔''

''میں بزدل نہیں ہوں۔اب تو میں کسی طور تمہیں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔جو کرنا ہے کر لینا۔'' سلمان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' بن فاتح نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

''سلمان! تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔استاد محترم کا علم بہت وسیع ہے۔تم ایک پھونک برداشت نہ کر سکو گے۔سوکھے پتے کی طرح اڑ جاؤ گے۔'' خلیل طبیزائی نے سلمان کو جھڑکا۔

''انہوں نے مجھے دھمکی کیوں دی۔زبان شیریں، ملک گیریں، زبان ہی سے ملک فتح کیا جاتا ہے دل کیا چیز ہے؟'' سلمان نے کہا۔

''اس غلطی کو سدھارنے کا ایک ہی طریقہ ہے' ظہری طبیزائی۔آؤ میرے ساتھ۔اس کے آستانے پر چلتے ہیں۔وقت کم ہے کچھ کر لینا چاہیے ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔'' کہہ کر خلیل کھڑے ہوگئے۔سلمان کو بھی اٹھنا پڑا۔وہ دونوں آگے پیچھے گھر سے نکلے۔مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ ایک آستانے پر پہنچے۔سلمان اندر داخل ہوا تو اس کی نظر ایک باریش شخص پر ٹھہر گئی۔اس شخص کی عمر 80 سال سے زائد ہوگی۔اس کے گرد کئی لوگ حلقہ بگوش تھے..... خلیل نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کیا پھر کہا۔''یہ میرا ہی بچہ ہے۔استاد محترم کو غلطی سے ناراض کر بیٹھا ہے برائے کرم اس کے لیے کچھ کریں۔''

اس شخص نے گہری نظروں سے سلمان کی طرف دیکھا پھر کہا۔''یہ تو خود اپنے آپ

میں کوہ جودی ہے۔ فی الحال بن فاتح اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ جاؤ عیش کرو۔ عیش کرانے کے لیے وہ قوت کافی ہے جس نے سہارا دے رکھا ہے۔'' کہہ کر اس نے جانے کا اشارہ دیا۔

راستے میں خلیل نے بتایا۔ ''یہ میرا دوست ہے اور بن فاتح سے کم ماہر نہیں ہے اسی لیے اس کی بن فاتح سے لگی رہتی ہے۔ کوئی بھی دوسرے کو بڑا ماننے پر تیار نہیں ہے۔''

گھر آ کر سلمان لیٹ گیا۔ یوں بھی کوئی کام تو تھا نہیں اور رات بھی ہونے والی تھی۔

اس گھر میں سلمان نے دس دن گزار دیے تھے۔ اس کا ایک ہی کام تھا۔ دن بھر سب سے گپیں لگانا اور رات کو گہری نیند سونا اور دن چڑھے اٹھنا۔ وہ سحر کا گویا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن سے شیریں بھی نکل گئی تھی۔ اب اسے ہر طرف سحر ہی سحر دیکھائی دیتی تھی۔ وہ اس کی قربت کا خواہاں تھا۔ اسے ایک بار حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ سوتے جاگتے وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس رات بھی وہ کافی دیر تک اسی کے خدوخال کا تصور کرتا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی تھی۔

وہ بے خبر سو رہا تھا کہ صبح ہی صبح خلیل طبیزائی کی غیر متوقع چیخ و پکار سے سلمان کو جاگنا پڑا۔ اب وہ انہیں عمو جان کہا کرتا تھا۔ عمو جان کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ رہے تھے اور رو رہے تھے، سلمان لباس درست کر کے باہر آیا تو انہوں نے سسکیوں بھرے لہجے میں کہا۔

''غضب ہو گیا بیٹے۔ رخسار گھر میں نہیں ہے۔''

یہ خبر سلمان پر بم کی طرح گری۔ ایک لمحے کے لیے وہ سن ہو گیا۔ اس کی منظور نظر، اس کی ناموس، اس کی عزت کو کون گھر سے لے گیا؟ اس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ فاکیہ موجود تھی لیکن اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھی۔ سلمان نے خلیل طبیزائی کو سنبھالا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگے۔ سلمان سے اس کی یہ آہ و بکا نہیں دیکھی گئی۔ اس نے انہیں مطمئن کرنا چاہا لیکن اس وقت تو وہ خود بھی پریشان تھا۔ چند لمحے سکوت میں گذر گئے۔ پھر فاکیہ نے سلمان سے کہا۔ ''سلمان! تم خلیل کو سنبھالو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

سلمان نے خلیل طبیزائی کی ڈھارس بندھائی کہ وہ اپنے اوسان نہ کھوئیں پھر اس نے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال..... گھر میں اس کا چرچا نہ کریں۔ عمہ (چچی) کو رخسار کی بابت کسی طرح سمجھا بجھا دیں۔ ابھی کچھ دیر میں پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں ہے۔''

''میں نے زائچہ کھینچا، اپنے موکل سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اسے پردے سے ڈھانپ دیا ہے۔ یہ کام کسی عامل کا لگتا ہے۔''

خلیل طبیزائی کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں تھا، وہ چلے گئے تو سلمان، فاکیہ کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گی اور اسے اس کے ساتھ کہیں جانا پڑے گا۔ کچھ بھی ہو رخسار نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس لیے اس کی حفاظت سلمان پر فرض تھی۔ اس کے رہتے یہ واردات ہو گئی تھی اس لیے اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مٹھیاں غصے سے بار بار بھینچ جاتی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج میرے ہاتھوں نہ جانے کس کا خون ہونا ہے۔ نامعلوم کون بدنصیب ہے جس نے اپنی موت کو پکارا ہے؟ جس نے سلمان کی غیرت و حمیت کو للکارا ہے۔ وہ کون نامراد ہے جس نے اتنی جرأت کی۔ کہیں رخسار خود تو نہیں بھاگ گئی؟ ہو سکتا ہے پگلی کہیں دل لگا بیٹھی ہو۔ آس پاس کے کسی نوجوان سے محبت کرنے لگی ہو۔

تقریباً دس منٹ کی الجھن اور بے تابی کے بعد فاکیہ آ گئی۔ اس کے آتے ہی سلمان نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ ''رخسار کا پتا چلا؟''

''میں نے رخسار کا پتا چلا لیا ہے؟'' فاکیہ کے لہجے میں اشتعال تھا۔

''پھر جلدی سے بتاؤ کون بدبخت اسے لے گیا ہے؟ مجھے کس کا خون کرنا ہے؟ میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میں آج کا ناشتا اس کے خون ہی سے کرنا چاہتا ہوں۔''

''سلمان! خود کو قابو میں رکھو۔ وہ اس علاقے کے فلاح (زمیندار) کے زیر زمین کمرے میں ہے۔ رفیعی کے بارے میں تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا بڑا کمینہ اور شورہ پشت شخص ہے۔ اس کی نظر کافی عرصے سے رخسار پر تھی اس کے گرگے موقع کی تاک میں تھے۔ انہیں اس کا موقع مل گیا، وہ اسے اٹھا کر لے گئے۔''

''بس کرو، بس کرو۔'' سلمان نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے..... ''مجھ میں اور کچھ سننے کی تاب نہیں ہے۔ مجھے ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا ہے۔'' اس نے سامنے رکھی ہوئی سلفچی کو بے اختیار ٹھوکر ماری۔

''آؤ چلیں۔ وہ ابھی بے ہوش ہے اور ابھی تک تو پوری طرح محفوظ ہے۔'' فاکیہ بولی۔

''آؤ چلیں۔''

''جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے پوری طرح منصوبہ بنا لو۔ کسی بڑے خطرے میں

پڑنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم ہر پہلو پر غور کرلیں۔'' فاکیہ نے مشورہ دیا۔

کافی دیر تک سلمان اور فاکیہ صلاح مشورہ کرتے رہے۔ بالآخر کچھ دیر کے بعد نکلنے پر بات ٹھہری۔

سلمان باہر جانے کی تیاری کررہا تھا کہ سحر کمرے میں داخل ہوئی۔

''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' سحر نے پوچھا۔

سلمان اسے جواب دینے والا تھا کہ خلیل طبیزائی بھی کمرے میں آ گئے۔ سلمان نے ان دونوں کو سمجھایا کہ وہ بچوں سے یہ کہہ دیں کہ رخسار میرے ساتھ کسی بزرگ کے پاس گئی ہوئی ہے۔ میں جلد ہی اسے واپس لے آؤں گا۔ جب تک رخسار مجھے نہیں مل جائے گی میں واپس نہیں آؤں گا۔

خلیل بوکھلائے ہوئے اور پریشان تھے۔ وہ سلمان کو تنہا جانے سے منع کررہے تھے۔ ان لوگوں کو تسلیاں دینے میں خاصا وقت لگ گیا۔ بہرحال اترے ہوئے چہروں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ انہوں نے سلمان کو رخصت کیا۔ خلیل نے کچھ پڑھ کر پھونکا۔ سلمان جتنی دیر رکتا۔ اتنا ہی انہیں سمجھانے بجھانے میں وقت لگتا۔ اس لیے وہ فوراً باہر آ گیا۔

گلی خاموش تھی، سڑکیں بھی آباد نہیں تھیں۔ راستے میں فاکیہ اسے ساری روداد بتاتی رہی۔ فاکیہ اسے قابو میں رکھنے کے لیے کبھی کبھی کوئی شگوفہ چھوڑ دیتی لیکن سلمان کو اس وقت اس کی ہر بات بری لگ رہی تھی۔

رفیعی کی حویلی کے قریب فاکیہ نے اسے روکا اور کہنے لگی۔ ''دیکھو سلمان! یہ سارا معاملہ میں خود بھی نمٹا سکتی تھی مگر تمہاری ضد کے آگے مجبور ہوگئی ہوں۔ اب تم میرے اشاروں پر چلو۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' سلمان نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''رفیعی اس وقت خواب گاہ میں ہے۔ دروازے پر اس کے شہدے موجود ہیں تاکہ تمہاری جوابی کارروائی کا مقابلہ کرسکیں۔ لیکن میں تمہیں لے جاؤں گی۔ اندر جاکر گردوپیش سونگھ کر رفیعی سے ذرا دلچسپ باتیں کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔ بتاتی جاؤ۔''

''مگر تمہارے ارادے کیا ہیں؟''

''تم جانتی ہو۔''

رفیعی کی خواب گاہ تک پہنچنا ایک دشوار گزار مرحلہ تھا۔ راستے میں پاسبانوں، دربانوں اور ملازموں کی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ ہر چند کہ سلمان کے ساتھ فاکیہ بھی تھی لیکن یہاں اپنی آمد کا کوئی نشان چھوڑنا سلمان کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ حویلی کے عقبی حصے سے ایک تنگ راستہ ملازموں کے کوارٹر کی طرف جاتا تھا۔ فاکیہ اسے وہیں لے گئی۔ وہ دیواروں اور گوشوں کی آڑ لیتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

فاکیہ اسے ایک ایسے زینے کی طرف لے گئی، جہاں سے رفیعی کی خواب گاہ کا راستہ آسان تھا۔ وہ زینے سے چھت پر پہنچا اور پھر ایک دوسرے زینے سے حویلی کے اندر داخل ہوگیا۔ رفیعی کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا۔ سلمان نے دھکا دیا تو کھل گیا۔ سامنے ایک شاندار مسہری پر نواب کا بچہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ دروازہ بند کرکے سلمان نے رفیعی کو آواز دی۔ ''اٹھو رفیعی! اٹھو!''

اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر آنکھیں ملنے لگا کہ اس کے سامنے سلمان کھڑا ہے۔ پھر ایک دم وہ کسی شکاری کتے کی طرح اچھل کر مسہری سے نیچے آ گیا۔ اس کا چہرہ سلمان کو دیکھتے ہی زرد پڑ گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی آنکھوں میں آدم خور شیر جیسی خطرناک چمک موجود تھی۔

''تم! یہاں؟ تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

''خوب! تم نے پہچان لیا۔ حالانکہ پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔''

''تمہیں ہمارے خلوت کدے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

''موت کے لیے سارے راستے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میں تمہاری موت ہوں۔''

''تمیز سے بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟''

''تمہارا خون۔''

''تم اس وقت ہماری حویلی میں ہو۔ تمہارے سر پر تمہاری اپنی موت منڈلا رہی ہے۔ ہمارے ہاں گستاخی کی سزا بڑی اور کڑی ہے۔ یہ پالتو جانور ہم نے یونہی نہیں پالے ہیں۔'' رفیعی نے اپنے گرگوں کے بارے میں اشارہ کیا۔

''سیدھی طرح وہ لڑکی میرے حوالے کردو جو تمہارے غنڈے کل رات اٹھا لائے ہیں۔ رفیعی! یاد رکھو۔ اب تمہاری بہن کو مٹھے کی زینت بنے گی۔ میرا نام سلمان ہے۔ تم میرے

بارے میں کچھ نہیں جانتے۔تم نے رخسار پر ہاتھ ڈال کر آتش فشاں کو چھیڑا ہے۔تم نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے۔یہ کسی اور کا گریبان نہیں، میرا ہے۔تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' سلمان نے گرجتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو ذلیل کتے۔میں تجھے شوٹ کر دوں گا نانہجار۔'' رفیعی بھڑک اٹھا اور بندوق اٹھانے کے لیے دوڑا۔

سلمان نے اسے آگے بڑھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔وہ ایک تنومند اور کسرتی جسم کا آدمی تھا۔اس نے سلمان کو زور کا دھکا دیا لیکن وہ جلد ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''رفیعی۔'' سلمان نے دانت پیس کر کہا۔''تو نے رخسار کو اغواء کیا ہے۔میں تیری بہنوں کے ساتھ بھی یہی عمل دہراؤں گا۔اطمینان رکھ۔''

''گستاخ، حرام زادے۔چپ رہ۔'' وہ آگ بگولا ہو گیا۔

''لڑکی میرے حوالے کر دے۔''

عین اسی وقت فاکیہ نے سرگوشی کی کہ وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔اس طرح رفیعی سے تلخ کلامی کر کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔لیکن سلمان اسے ذلیل کر کے اپنے دل کو سکون پہنچانا چاہتا تھا۔وہ خود اس سے نمٹنا چاہتا تھا۔مگر زیادہ دیر ٹھہرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی آمد کے بارے میں اس بڑی حویلی کے لوگوں کو علم ہو جاتا۔اس نے رفیعی کو ایک غلیظ قسم کی گالی دی۔جواباً اس نے بھی سلمان کو کوسا۔پھر سلمان نے موقع پا کر اس کے گال پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا۔وہ دہاڑتا ہوا سلمان کے جسم سے لپٹ گیا۔وہ دونوں کے درمیان مغلظات کا آزادانہ تبادلہ ہونے لگا۔ فاکیہ اسے منع کرتی رہی اور آخر اسے دخل دینا پڑا۔

رفیعی کے انداز اچانک بدل گئے۔اس نے ایک معمول کی طرح سلمان کی انگلی پکڑی اور اپنی خواب گاہ سے ملحق ایک الماری کی طرف بڑھا۔جب اس نے الماری کو گھمایا تو نیچے تہہ خانے کا زینہ تھا۔تہہ خانے میں رخسار بے سدھ پڑی تھی۔سلمان نے اسے آہستہ سے اٹھایا اور اپنے کاندھے پر ڈال کر واپس رفیعی کے کمرے میں آ گیا۔وہاں اس نے گلاب پاش سے عرق گلاب لے کر اس کے چہرے پر چھڑکا۔رفیعی خاموشی سے بالکل گم صم یہ منظر دیکھ رہا تھا۔کچھ دیر بعد رخسار ہوش میں آ گئی اور پریشان نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔وہ فوراً اٹھی اور اس نے بستر پر پڑی ہوئی ایک چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیا۔وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن سلمان نے یہ کہہ کر

اسے خاموش کر دیا کہ تم کوئی بات نہ کرو۔چپ چاپ میرے ساتھ چلی آؤ۔سلمان کے اشارے پر رفیعی نے اسے حویلی کے خفیہ راستے سے باہر کر دیا۔

رخسار کی موجودگی میں سلمان نے فاکیہ سے کہا۔''یاد رکھنا! تمہیں آج کسی کا خون کرنا ہے اور یہ کام اسی منحوس رفیعی سے انجام دلوانا۔کاش میں خود یہ منظر دیکھ سکتا۔اب اندر جاؤ اور خون کرو۔میں رخسار کو لے کر گھر پہنچتا ہوں۔''

رفیعی نے مسکرا کر سر ہلایا سلمان کو ہاتھ ہلا کر رخصت کر دیا، سلمان کو معلوم تھا اب کیا ہو گا۔دوپہر تک اس محل میں پولیس ہو گی، دوپہر ہی کو پتہ چل جائے گا کہ رفیعی قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔فاکیہ وہاں موجود جو تھی۔

کچھ دیر دور جا کر انہیں ایک تانگہ مل گیا۔رخسار اپنے چہرے کو چادر سے ڈھانپے رو رہی تھی۔اسے دلاسا دیتے ہوئے سلمان کے بھی آنسو نکل آئے۔اس نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔''مجھے معلوم ہے رخسار کہ تم بے قصور ہو۔خدا کا شکر ہے کہ تم محفوظ رہ گئیں۔گھر میں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ رات تمہارے ساتھ یہ المناک حادثہ پیش آیا ہے۔''

دروازے پر خلیل مضطرب کھڑے تھے۔سلمان کو رخسار کے ساتھ دیکھ کر ان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔انہوں نے اندر جا کر اسے خوب زور سے چمٹا لیا۔ویران گھر میں پھر سے بہار آ گئی۔اس سارے عمل میں کوئی دو گھنٹے لگے ہوں گے۔سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا تھا کہ رخسار ایک بزرگ کے ہاں گئی تھی۔محلے میں رسوائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

سحر نے فوراً قہوہ کی پیالی پیش کی اور سب نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا۔رخسار کی حالت غیر تھی۔ظاہر ہے حادثے کا اسے جس قدر بھی صدمہ ہوتا۔وہ کم تھا۔

سہ پہر کو سلمان نے رفیعی کی حویلی کا رخ کیا۔وہاں سادے لباس والے ٹہل رہے تھے۔یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ رفیعی نے اپنی ایک کنیز کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ سلمان یہ خبر سن کر سیدھا گھر واپس آ گیا۔باقی تفصیلات کے لیے فاکیہ کا انتظار تھا۔

اس وقت تک رفیعی اقبال جرم کر چکا تھا اور عینی شاہدوں کے بیانات قلمبند ہو چکے تھے۔رفیعی نے یہ قتل اپنے کئی ملازموں کے سامنے کیا تھا۔ایک ملازم کا بیان تھا کہ رفیعی نے بے دردی اور دیوانگی سے چھرا لڑکی کے پیٹ میں گھونپ دیا جس سے اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں اور اس کے بعد وہ اس کے جسم پر وار کرتا ہی چلا گیا۔بڑی مشکل سے ملازموں نے اسے

پکڑا اور اس کے ہاتھ سے چھرا چھینا۔ یہ قتل چھپانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بات چھپی نہ رہ سکی۔

تیسری رات، سلمان جاگ رہا تھا کہ فاکیہ آئی اور اس نے بتایا کہ رفیعی کے اقبال جرم کے باوجود پولیس کا رویہ اس کے ساتھ ہمدرانہ ہے..... وجہ یہ ہے کہ رفیع کے تمام اعزاء اور اس کے واقف کار امراء نے اس کا مقدمہ پیچیدہ بنانے کے لیے اور کمزور کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ انہوں نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا ہے اور بے تحاشہ دولت لٹا رہے ہیں۔ رفیعی کے گرگوں اور کاروباری غنڈوں نے اشارتاً تمام واقعہ امراء کے گوش گزار کر دیا تھا کہ انہوں نے کس طرح رفیعی کی ایماء پر رخسار کو اغواء کیا تھا۔ فاکیہ نے بتایا کہ یقیناً چند آدمیوں نے اس گھر کی نشاندہی بھی کی ہوگی۔ حالانکہ تم یہاں موجود نہیں تھے مگر جب انہیں اس حادثے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ رخسار غائب ہے اور رفیعی ایک سنگین جرم کا مرتکب ہو چکا ہے تو انہیں تم تک پہنچنے کے لیے کڑیاں ملانے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ اب تک وہ تمہیں گرفتار کروا چکے ہوتے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ رفیعی نے اپنی داشتہ کو کیوں قتل کر دیا؟ اور وہ بار بار اقبال جرم کیوں کر رہا ہے؟ رفیعی کے چند عزیزوں نے حوالات میں اس سے ملاقات بھی کی۔ وہ اسے کچھ سمجھانا اور اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس سے کچھ نہیں پوچھ سکے۔ وہ بیچارہ اپنے ہوش میں کہاں تھا؟ میں اس کی زبانی اپنے مطلب کے جوابات دلوا رہی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ پولیس خواہ مخواہ حوالات میں رفیعی کو روکے ہوئے ہے لیکن کب تک؟ انہیں ایک نہ ایک دن یہ معاملہ عدالت کے سپرد کرنا ہی ہوگا اور اس وقت تک مجھے رفیعی کے سر پر رہنا ہوگا۔''

فاکیہ نے آتے ہی سلمان کو گزشتہ دونوں کا ماجرا سنایا۔

''کیا پولیس میرے پاس بھی آ سکتی ہے؟ مگر کیوں؟ پولیس وغیرہ کے چکر سے دور رہنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔'' سلمان نے وحشت سے کہا۔

''پولیس تمہارے پاس کیوں نہیں آ سکتی۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں پکڑ سکتے ہیں تاکہ رفیعی کا جرم مشتبہ اور مشکوک بنا دیں۔''

''تو پھر مجھے تہران سے چلے جانا چاہیے۔ میں کسی تاخیر کے بغیر مشہد جانے والا تھا لیکن سحر نے مجھے ایک ہفتے کے لیے روک لیا۔''

''خوب! اگر تم اس زمانے میں تہران سے چلے گئے تو گویا تم اپنے شبہے کو مزید تقویت پہنچاؤ گے اور اپنے خلاف خود ہی شہادت مہیا کرو گے جانِ فاکیہ۔''

''کیا مذاق کر رہی ہو فاکیہ؟ یہ تو بڑی سنگدلی کی بات ہے اور خصوصاً ایسے وقت۔'' سلمان نے ناراضگی سے کہا۔

''کمال ہے بھئی..... تم بھی خوب ہو۔ جب بھی آتی ہو کوئی چرکا لگا جاتی ہو۔''

''تو میں تمہیں سچی باتیں نہ بتایا کروں؟ ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے کیا؟ اب بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''تم سننا ہی نہیں چاہتے مجھ پر شک کرتے ہو۔ ابھی تمہارے کئی دشمن باقی ہیں جن کے بارے میں تم بھول چکے ہو۔''

''ایسے کون لوگ ہیں۔ ایک دو نام تو بتاؤ؟''

''پہلا نام ہے روحیہ خانم کا، جو ایک عامل کے ذریعہ تم سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس کی بیٹی غائب ہوگئی تھی۔ بیٹی کے غائب ہونے میں وہ تمہارا ہاتھ سمجھ رہی ہے۔''

سلمان کو یاد آ گیا کہ روحیہ خانم کی ایک بیٹی تھی جو سحر کے ساتھ پڑھتی تھی۔ گزشتہ دنوں گھر سے فرار ہوگئی۔ ان کا شک سحر پر تھا کہ اسی نے فرار کرایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان لوگوں نے سحر پر تشدد کیا تھا جس پر سلمان نے روحیہ خانم کی اچھی خاصی خبر لے لی تھی۔ ان لوگوں کو شک ہوگیا تھا کہ سلمان عملیات کرتا ہے۔ اس لیے خانم نے عامل کا سہارا لیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' فاکیہ نے پوچھا۔

''تمہاری باتوں پر غور کر رہا ہوں۔''

فاکیہ کی بات سچ تھی۔ سلمان کو ہر طور پولیس سے بچے رہنا تھا اور اس کے لیے یہ تمام احتیاطیں لازم تھیں۔

فاکیہ تھوڑی دیر میں آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ سلمان نے دو دن سے گھر کے معاملات میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس لیے وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور بباطن بے دلی سے اور بظاہر خوش دلی سے گھر والوں کی گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ پھر لباس تبدیل کر کے فاکیہ کا انتظار کرنے لگا کہ فاکیہ آتے ہی سوالات کرنے شروع کر دے گی۔ جب بہت دیر ہوگئی اور فاکیہ نہیں آئی تو وہ خود ہی گھر سے باہر نکل گیا۔ راستے میں فاکیہ جلوہ گر ہوگئی۔ سلمان عمدہ لباس میں تھا اور خوب جچ رہا تھا۔ فاکیہ نے آتے ہی چھیڑ خانی شروع کر دی۔

''کیا روحیہ خانم پر بجلی گراؤ گے؟''

''صحیح یاد دلایا۔ چلو اسی کے ہاں چلتے ہیں۔''

''وہاں بیٹھا ایک عامل تمہیں بلانے کے لیے عمل کر رہا ہے۔ اس سے ڈرو گے تو نہیں؟''

''میں اسے دیکھنا چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے چلو۔''

روحیہ خانم جیسے سلمان ہی کی منتظر تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر طنزاً سلمان کا استقبال کیا۔ سلمان نے بھی چار چبھتے ہوئے جملے چھوڑ دیئے۔ فاکیہ نے اسے بتایا کہ دور ایک کمرے میں بند ہو کر وہ عامل تمہارے خلاف کوئی عمل آزما رہا ہے۔ اس نے روحیہ خانم کو یقین دلایا تھا کہ وہ سلمان کو ہر حالت میں یہاں کھینچ کر لائے گا۔

سلمان کی آمد سے روحیہ خانم یہی سمجھی کہ یہ اس کے خریدے ہوئے عامل کے چلے کا اثر ہے کہ سلمان کشاں کشاں یہاں چلا آیا ہے۔ وہ مسکرا اٹھی۔ سلمان بھی ہنستے ہوئے تخت پر بیٹھ گیا۔ روحیہ کی سوتیلی بیٹی شمیم اس کے پاس آئی۔ اس کی نظروں میں ایک بے چینی تھی۔ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گئی اور باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ فاکیہ نے اس کی بے چینی کی وجہ بتائی تو سلمان کو اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ سلمان فوراً یہاں سے چلا جائے۔ یہ بات اس نے اٹکتے اٹکتے کہہ بھی دی اور گھبرا کر روحیہ خانم کی طرف دیکھا۔ روحیہ خانم نے اسے سلمان سے اتنے قریب دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور وہ سہمی سہمی سلمان کے پاس سے اٹھ کر اس طرح چلی گئی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑ لی گئی ہو۔ روحیہ خانم نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے ہامی بھرنے کے انداز میں سر ہلایا اور دوبارہ سلمان کے پاس چلی آئی۔ آتے ہی خوش باش انداز میں وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے باتوں باتوں میں اشارتاً ایک بار پھر بتایا کہ روحیہ خانم نے اسے ہدایت کی ہے کہ وہ اسے رجھا کر اندر والے کمرے میں لے چلے جہاں ایک عامل بیٹھا ہوا چلہ کر رہا ہے۔ یہ سن کر سلمان مسکرا دیا۔ اس کا اعتماد دیکھ کر وہ بہت حیران تھی اور سلمان سے دوبارہ وہاں سے بھاگ جانے کے لیے کہنے لگی۔

سلمان نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم یقیناً اچھی لڑکی ہو۔ تمہاری رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔''

''مگر آپ یہاں سے چلے جایئے۔ اس عامل کے بارے میں سنا ہے کہ بہت پہنچا ہوا آدمی ہے۔'' لڑکی نے دیدے نچا کر کہا۔

''چل کے دیکھتے ہیں وہاں کیا تماشا ہوتا ہے؟''

''آپ شاید میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہیں؟'' اس نے حسرت سے کہا۔

''میں تمہاری باتیں دل میں اتار رہا ہوں۔ میں اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا کہ تم نے مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔''

''خانم یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں آپ سے الفت و رغبت کی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ سمجھ گئے نا؟''

''ہاں! اور میں تمہاری محبت کے جواب میں اندر کمرے میں جانا بھی چاہتا ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ واقعی وہاں جانا چاہتے ہیں؟ وہ بہت ظالم ہے۔ صورت سے ہی کریہہ نظر آتا ہے۔''

''ارے چل کے تو دیکھو میری گڑیا۔ گھبراتی کیوں ہو؟''

وہ اسے منع کرتی رہی اور سلمان ہنس کر ٹالتا رہا۔ آخر سلمان کے اشارے پر اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور راہداری میں لے گئی۔ خانم بھی وہیں چلی آئی اور بڑے ٹھسے سے کہنے لگی۔ ''اری! ان کو کہاں لیے جا رہی ہے؟''

''یہ تخلیے میں مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔'' لڑکی کی آواز میں لرزش تھی۔

''زہے نصیب۔ خدا خیر کرے۔'' روحیہ خانم نے مکاری سے کہا۔

لڑکی سلمان کا ہاتھ پکڑے مکان کے آخری سرے پر لے گئی۔ پیچھے خانم بھی خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ سلمان نہایت بے پروائی سے لڑکی کی انگلی پکڑے اس سے کچھ شگفتہ کچھ دل نشین باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

''اس کمرے میں چلی جاؤ نا۔'' عقب سے خانم کی آواز آئی۔

لڑکی اسے ایک بڑے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو وہاں اس نے ایک عامل کو آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ سلمان کو دیکھ کر وہ چونکا اور اس کا اشتیاق دوچند ہو گیا۔ پیچھے خانم تھی۔ اس نے پیچھے ہی سے غالباً کوئی اشارہ کیا تھا جسے عامل سمجھ گیا تھا کیوں کہ اس نے اپنے دانت نکال دیئے تھے۔ سلمان نے انجان بن کر پوچھا۔ ''تم مجھے کہاں لے آئی؟ یہ کون شخص ہے؟''

لڑکی کی زبان میں لکنت پیدا ہوئی۔ اس کی بجائے خانم نے جواب دیا۔ ''چلتے چلتے

ان سے بھی ملاقات کر لیجیے۔ یہ عامل کشفی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ آپ کو میرے غریب خانے پر اپنی طاقت سے کھینچ لائیں گے؟''

''میری ایسی کیا ضرورت پڑ گئی روحیہ خانم؟'' سلمان نے مصنوعی لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ کے دماغ میں پھر کچھ سما گیا ہے؟''

''ضرورت تو کشفی کو پڑی ہے۔ وہی آپ سے بات کریں گے۔''

لڑکی سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ فاکیہ خاموش تھی اور عامل کو گھورے جا رہی تھی۔ خانم کے انداز میں سرخروئی اور فتح جھلک رہی تھی۔ سلمان نے عمدا لڑکی کا ہاتھ چھوڑا اور وہاں سے اس طرح کھسکنے لگا جیسے وہ خوفزدہ ہو گیا ہو۔

''کہاں جا رہا ہے؟'' اس بار عامل کشفی کی آواز آئی۔ ''تجھے ہم نے بلایا ہے۔''

''آپ نے..... آپ نے خادم کو کیوں یاد کیا ہے؟'' سلمان نے اس قدر عاجزی سے کہا کہ فاکیہ کو ہنسی آ گئی۔

''تو بڑا پاجی ہے۔ تو نے جو ایک دو عمل سیکھ لیے ہیں ان سے بچوں کو ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے۔'' کشفی نے کھٹور لہجے میں کہا۔ ''بتا تو نے اس کی بیٹی کہاں چھپا رکھی ہے؟''

''میں تو کچھ نہیں جانتا۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے؟'' سلمان نے خانم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ شخص بہت کمینہ، سازشی اور بدمعاش ہے۔'' خانم نے ایک دم طیش میں آ کر کہا۔

''حوصلہ..... حوصلہ!'' عامل نے ہاتھ اٹھا کر خانم سے کہا پھر سلمان سے مخاطب ہوا۔ ''بتا دے لڑکی کہاں ہے؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے سچ سچ کہہ دیا۔ آپ یقین کیوں نہیں کرتے؟''

''تو ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔ تو اس وقت اس شہر کے سب سے بڑے عامل کے سامنے کھڑا ہے۔''

سلمان نے عاجزی سے پھر منع کر دیا۔ لڑکی کا برا حال تھا۔ خانم جز بز نظر آتی تھی۔ سلمان کے مسلسل انکار پر عامل کو غصہ آ گیا۔ اس نے بپھر کر اپنا کشکول اٹھایا اور اس میں کچھ پڑھ کر پھونکا۔ کشکول دیکھتے ہی دیکھتے انگاروں سے بھر گیا۔ عامل نے غصے میں سلمان سے ایک بار

پھر لڑکی کا پتا دریافت کیا۔ وہ اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے حسب سابق انکار کر دیا۔ اس پر عامل نے انگاروں سے بھرا ہوا کشکول اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔ ادھر فاکیہ اشارہ پاتے ہی حرکت میں آ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کشکول میں جلتے ہوئے کوئلے ٹھنڈے ہو گئے۔ اپنے عمل کا یہ حشر دیکھ کر عامل کی تیوری پر بل آئے۔ اس نے پینترا بدل کر اپنا چمٹا اٹھایا اور زور زور سے دہشت زدہ انداز میں زمین پر مارنے لگا۔ سلمان اب کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر اسے گھور رہا تھا۔ چمٹے کی آواز جیسے ہی تیز ہوئی ایک سیاہ بلی مکروہ اور خوفناک آنکھوں والی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوئی اور آناً فاناً سلمان کے چہرے کی طرف جھپٹی۔ اس کے ایک ہی وار میں چہرے کی اوپری تہہ علیحدہ ہو سکتی تھی۔ فاکیہ کے اشارے پر سلمان نے اپنی ایک انگلی کو جنبش دی۔ بلی بھیانک چیخیں مارتی ہوئی پیچھے کی طرف بھاگی اور لمحوں میں زمین پر لوٹنے پوٹنے لگی۔ عامل نے اُس کی یہ حالت دیکھ کر اسے اٹھایا اور تیزی سے تڑپتی ہوئی بلی کو اپنے جھولے میں ڈال لیا۔ روحیہ خانم کا چہرہ زرد ہو گیا اور لڑکی کی نگاہوں میں طمانیت جھلکنے لگی تھی۔ عامل نے اپنا یہ وار بھی ناکام دیکھ کر سلمان سے کہا۔ ''او..... تو تُو بھی کچھ جانتا ہے۔''

''اور آزمالے الو کے پٹھے۔'' سلمان نے ایک دم اپنا لہجہ بدل دیا۔

''تو مجھے نہیں جانتا۔ اپنی زبان سنبھال۔'' عامل گرجا۔

''تو بھی مجھے نہیں جانتا کمینے۔ جا! یہاں سے دفع ہو جا۔''

''ایک دو شعبدے سیکھ لینے سے کوئی عامل کامل نہیں بن جاتا۔''

''تیرے پاس جتنے شعبدے ہیں تُو سب آزمالے۔''

''ٹھہر! میں تجھے دیکھتا ہوں۔'' عامل نے دانت پیس کر کہا اور اس کے بعد اس نے مختلف قسم کے شعبدے اور تماشے اسے زک پہنچانے کے لیے کیے لیکن وہ سلمان کے لیے بہت معمولی کھیل تھے، ان کا ذکر کیا کیا جائے۔ تکرار ہو گی۔ وہ ان سے زیادہ ہولناک مرحلوں سے گذر چکا تھا۔ القصہ مختصر مسلسل ناکامی دیکھ کر عامل کو پسینہ آ گیا۔ سلمان نے اس سے گرج کر کہا۔ ''اب کچھ تو بھی دیکھ لے..... دیکھ لے کہ میں کیا ہوں۔''

اس کا یہ کہنا تھا کہ عامل کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے کچھ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا اور سلمان کو گھورنے لگا۔ دفعتہً وہ گھبرا کر سلمان سے مخاطب ہوا۔ ''میں سمجھ گیا، مجھ سے بھول ہو گئی، آپ کے پاس تو بہت بڑی قوت ہے شہزادی فاکیہ، عاملوں کا خواب، مجھ پر رحم کریں، ورنہ شہزادی

مجھے سزا دے گی، خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔'' عامل نے گڑگڑا کر کہا۔

وہ اس کی خوشامد پر اتر آیا۔ لیکن سلمان نے معاف کرنے کا اشارہ نہیں دیا تو عامل اس کے قدموں پر لوٹنے اور چیخنے چلانے لگا۔ بار بار معافی مانگنے لگا۔ عامل کا یہ حشر دیکھ کر روحیہ خانم کی روح فنا ہوگئی اور وہ بھی سلمان کے پاؤں پر گر گئی۔

لڑکی آنکھیں پھاڑے ان دونوں کو سلمان کے قدموں پر لوٹتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ خانم نے معاملے کی نزاکت سمجھ کر ہی اپنا رویہ تبدیل کیا تھا۔

سلمان خانم سے بولا۔ ''سنو روحیہ خانم! اتنی نصیحت تمہارے لیے غالباً کافی ہوگی کہ آئندہ کبھی تم نے میرے خلاف کوئی سازش کی تو عبرتناک انجام کے لیے تیار رہنا۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔'' خانم نے گریہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے اب کوئی لغزش نہیں ہوگی۔''

یہ واقعہ بہت اہم تھا۔ خانم اور عامل ریشہ خطمی ہو گئے تھے، وہ لمحوں میں بدل کر سلمان کی بری طرح خوشامد کر رہے تھے۔

لڑکی بھی حیرت اور خوف سے لیکن ایک اپنائیت کے ساتھ سلمان کے پہلو میں دبکی ہوئی تھی، اتنا بہت تھا۔ سلمان وہاں اپنی شخصیت کے کچھ ایسے گہرے نقوش چھوڑے جا رہا تھا جنہیں خانم اور عامل کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔

رخصت کے وقت خانم کی حالت عجیب تھی۔ وہ سلمان پر وارفتہ، فریفتہ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا سارا کس بل نکل گیا تھا۔ وہ جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا اور گھر آ کر بے سدھ پڑ گیا۔

سلمان پانچ روز تک تہران کے خاص علاقوں میں گھومتا رہا، پولیس کی نظروں میں خود کو لاتا رہا اور یہ مشہور کرتا رہا کہ وہ چند دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔

اس عرصے میں جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اس نے کسی حد تک حاصل کر لیا تھا۔ اس دن کے بعد خانم کے ہاں جانے کا موقع نہیں ملا پھر بھی ایک ایک پل اس کا وحشت میں گزر رہا تھا۔ اپنے دل کا حال تو اسے خود معلوم تھا۔ اس کے علاوہ کسے معلوم تھا کہ سڑکوں پر دندناتا ہوا یہ سرکش شخص اندر سے کتنا غمزدہ اور دکھی ہے۔ شب و روز اس پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ اس کے دل کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی غروب ہو رہا تھا۔ قسمت میں اندھیرا چھانے والا

تھا۔ سات روز بیت گئے تھے اور وہ پرانی دھمکی پر کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اسے یاد تھا کہ فاکیہ کو اس سے چھین لینے کے لیے اس کا دشمن چلہ کر رہا ہے۔ اس کے چلے کو باطل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ مشہد جائے۔ خود کو حق پر ثابت کرنے کے لیے امام رضا کے روضے کے احاطے میں بیٹھ کر چلہ کرے، فریاد پیش کرے مگر اب تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا تھا اور سات روز گزر چکے تھے۔

ساتویں روز جب وہ سو کر اٹھا تو دیکھا کہ سحر ایک کونے میں جانماز پر بیٹھی منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا پڑھ رہی ہے۔ سلمان کو اس کی معصومیت پر ترس آ گیا۔ وہ اتنی منہمک تھی کہ سلمان کو نہ دیکھ سکی، اس وقت وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ سلمان اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ سلمان نے خود سے کہا۔ ''سلمان میاں! اسے خوب جی بھر کے دیکھ لو۔ قسمت کا پانسا پھر تمہارے خلاف پڑا ہے۔ نہ جانے پھر اسے دوبارہ دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔''

سحر نے وظیفہ ختم کر کے نظر اٹھائی تو سلمان کو محو نظارہ دیکھا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس نے بڑے والہانہ انداز میں ایک بار پھر دبے دبے لفظوں میں اسے روکنا چاہا، لیکن اب شدید اصرار کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

سلمان اس کی قلبی کیفیت سے واقف تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سلمان نے اسے سمجھایا تو اس سے ضبط نہ ہوا اور وہ رو پڑی۔ سلمان کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ اسے کامیابی کا یقین دلاتی رہی سلمان اس سے جدا ہو کر اس کے والد جسے وہ عمو جان کہنے لگا تھا، ان کے پاس گیا اور اپنی اچانک روانگی کے سلسلے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ عمو جان سے اجازت لے کر وہ باری باری تمام گھر والوں سے ملا، ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر سحر سے جدائی کے آخری لمحات بہت رقت آمیز تھے۔ وہ دونوں جذباتی باتیں کرتے رہے، روتے اور مسکراتے رہے۔ پھر سلمان نے سحر سے سب کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ سلمان کی اس دل خراش بات سے سحر تڑپنے لگی، اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ دل کیوں چھوٹا کرتے ہیں؟''

''نہیں، نہیں!'' سلمان آنسو پونچھ کر بولا۔ ''وعدہ کرو کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، تم یہاں کا خیال رکھو گی۔''

''وعدہ کرتی ہوں کہ کوئی مصیبت آئے گی تو پہلے مجھ پر آئے گی۔''

سلمان نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر سحر سے اجازت لے کر سامان اٹھایا اور اس کے گھر والوں سے دوبارہ مل کر باہر آ گیا۔ مکان پر آخری نظر ڈالی اور قدم آگے بڑھا دیئے۔

وہ جا رہا تھا لیکن ایسی منزل کی طرف جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چلتے وقت قدم ڈگمگائے۔ ''ان لوگوں کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں؟'' وہ سوچتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھنے لگا۔ ''میرے پاس اور کیا تدبیر ہے؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔''

سحر کی حسرتناک نظریں ابھی تک اسے اپنے جسم میں چبھی جا رہی تھیں، دل ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ بن فاتح کو اس طرح چھوڑ دیا جاتا تو زندگی کی کوئی ہلکی سی امید بھی باقی نہیں رہتی۔ یہ سفر تو زندگی برقرار رکھنے کے لیے تھا۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اسے خبر نہ ہو سکی کہ کب اسٹیشن آ گیا۔ تانگے والے نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔ اسے کرایہ دے کر وہ اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوا۔ گاڑی کی روانگی میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ ڈبے میں اس کے سوا کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔ ڈبے میں جا کر وہ سیٹ پر دھڑام سے گر گیا۔ اچانک کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی۔ ظہری طبیزائی اس کے قریب کھڑا گہری، سنجیدہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''سلام!'' اس نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''کہاں جا رہا ہے تو؟'' ظہری طبیزائی نے سلام کا جواب رد کر کے روکھی آواز میں دریافت کیا۔

''مشہد۔'' سلمان نے اس کی الجھن اور بے رخی سے سہم کر کہا۔

''باز آ جا۔ اب بھی وقت ہے۔ اپنی ضد سے باز آ جا مشہد میں تیرا کوئی داؤ نہیں چلے گا۔ وہاں نوری علم والوں کو مقام ملتا ہے، تجھ جیسے گناہ کے پوتڑے کو نہیں۔'' ظہری طبیزائی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تو مصیبتوں میں پھنس جائے گا۔''

''اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔'' سلمان نے کسی قدر جرأت سے کہا۔ ''بن فاتح نے بڑے زخم لگائے ہیں، سحر پر حملہ کیا اور اب..... اب وہ فاکیہ کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے۔''

''مجھے کیا بتاتا ہے؟ میں سب جانتا ہوں..... لیکن تیرا مشہد جانا ٹھیک نہیں۔''

''پر سوچو! اگر بن فاتح فاکیہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں تو برباد ہو جاؤں گا۔ میرے پاس کیا بچے گا؟''

''فاکیہ پر تجھے بڑا گھمنڈ ہے۔'' ظہری نے تیز آواز میں کہا۔

''مگر میں بن فاتح کو اس کے عمل میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' سلمان نے چڑ کر کہا۔

''بے وقوف! تو کیا تو خدا سے جنگ لڑے گا؟'' ظہری طبیزائی نے کانپتے ہوئے کہا۔

''تیری یہ مجال؟''

''یا تو میری مدد کرو، یا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر میری قسمت میں موت ہی لکھی ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ظہری طبیزائی اس کی مدد کرے گا اور ہمت بڑھائے گا۔ لیکن اس کے مایوس کن انداز گفتگو نے اسے اور جھنجھلا دیا۔

''قسمت کا لکھا بھی ٹل سکتا ہے۔ لیکن وقت کا دھیان ہونا چاہیے۔'' ظہری غصے میں بولا۔ ''تیری آنکھوں پر پٹی پڑ چکی ہے۔ تو کالے اور سفید کی تمیز کھو چکا ہے۔ تو نے میری آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر بات کی ہے۔ تو نہیں جانتا کہ اگر مجھے اپنے دوست کا خیال نہ ہوتا تو میں تجھے بتاتا۔''

سلمان جواب میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ گاڑی کی روانگی میں سات آٹھ منٹ باقی تھے۔ اس نے ظہری سے نظریں چرا لیں۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا۔ ظہری کی بزرگی کا خیال تھا۔ خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہوتا۔ ادھر سلمان کو یہ ناز بھی تھا کہ اس کی ضد سے مجبور ہو کر وہ اس کی مدد کو آمادہ ہو جائے گا۔

''کیا سوچ رہا ہے؟'' ظہری نے اسے خاموش دیکھ کر کرخت آواز میں کہا۔ ''بے عقل، میں کہتا ہوں میرا کہا مان لے۔ نہیں تو سر تھام کر روئے گا۔''

''کیا تم بھی مجھے بددعائیں دینے آئے ہو؟'' اس نے تلملا کر کہا۔ ''کیا تم بھی غیر ہو گئے؟''

''بکواس مت کر۔ میری بات کا جواب دے۔''

''میں نے مشہد جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' سلمان نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہارا لحاظ ہے اس لیے میں کھل کر بات نہیں کر رہا۔ میرا ایک دشمن چھپ کر گھات لگا رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں خاموش بیٹھا رہوں۔ میں پہلے بھی ایک بار فاکیہ کے جانے کے بعد مصیبتوں میں گھر چکا ہوں۔ اب اور کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ مشہد جانا میرا ٹھیک نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ تم آخر میں بہرحال میری مدد کرو گے۔ تمہیں آنا پڑے گا اور تم نہیں آئے تو میں مر جاؤں گا۔ میں ایسی موت کو گلے لگا لوں گا جو ذلت کی زندگی سے یقیناً بہتر ہو گی۔'' سلمان پھٹ

پڑا اور اس نے کھل کر سب کچھ کہہ دیا۔

''تو بے وقوف ہے۔ تو کچھ نہیں جانتا۔ تیری مدد کو وہاں کوئی نہیں آ سکتا اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو اپنے ارادے سے مشہد چلا جائے گا؟'' ظہری نے شدید غصے میں کہا۔ سلمان کی باتوں سے وہ بہت ناراض ہو گیا تھا۔

''میں مشہد ضرور جاؤں گا۔ میں جا رہا ہوں۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اچھا۔'' ظہری نے برا سا منہ بنا کر سرد آواز میں کہا۔ ''تیرا فیصلہ اٹل ہے۔''

''ہاں!'' سلمان نے کچھ بگڑ کر کہا۔ ''میں تمہیں سب بتا چکا ہوں۔''

''سن! تو نہیں جا سکتا۔ تو ہر جگہ من مانی کرتا ہے اپنی اوقات سے بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔ تو نے میرے سامنے زبان کھولی ہے۔'' ظہری کی آنکھیں خون برسا رہی تھیں اور زبان آگ اگل رہی تھی۔ ''تو مشہد کی بات کرتا ہے۔ تہران اسٹیشن ہی تجھ پر بھاری ہو جائے گا۔ تو نے میری بات نہیں مانی۔ ظہری کی بات نہیں مانی۔ تجھے اس غلطی کی سزا ضرور ملے گی۔''

پھر ظہری نے ایک نہ سمجھ میں آنے والا خوفناک نعرہ بلند کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سلمان کی کیفیت عجب گومگو کی تھی۔ شدید غصہ بھی تھا اور خوف بھی۔

ظہری کے چلے جانے کے بعد سلمان کو اس پر اور طیش آیا کہ مدد کرنے کے بجائے وہ اسے بددعائیں اور گالیاں دے کر چلا گیا۔ اس نے اسٹیشن کی گھڑی دیکھی۔ روانگی میں تین منٹ تھے۔ اس نے اس شخص کو سرسری نظر سے دیکھا جو ڈبے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی مسافر ہو گا۔ لیکن وہ سلمان کو دیکھ کر چونک پڑا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے گھورنے لگا۔ اس سے سلمان کو کچھ شبہ ہوا۔ اس نے توجہ ہٹانی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے نوارد زہر خند لہجے میں بولا۔

''تہران سے بڑی جلدی دل اچاٹ ہو گیا تمہارا؟''

''کون ہو تم؟'' سلمان نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ''میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''لیکن میں تم کو خوب جانتا ہوں آغائی سلمان! تمہاری تلاش میں مجھے یہاں تک آنا پڑا۔'' نوارد نے مردانگی سے جواب دیا۔ پھر کڑک کر بولا۔ ''اپنا سامان اٹھاؤ اور شرافت سے گاڑی سے نیچے اتر آؤ۔ قراول خانہ (تھانے) چل کر تم سے تفصیلی گفتگو ہو گی۔''

''اپنا راستہ لو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ اگر تمہیں میری تلاش تھی تو تم یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ میں کون ہوں اور تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ خیریت چاہتے ہو تو دم دبا کر یہاں سے

بھاگ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں اپنی غفلت پر پچھتانا پڑے۔'' سلمان نے اسے جھڑک دیا۔

نوارد کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ چھا گئی۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سلمان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک ڈبے میں مسلح سپاہیوں کا دستہ گھس آیا اور اسے جکڑ لیا گیا۔ اسے گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا اور دھکے مار کر اسٹیشن سے باہر لایا گیا۔

پولیس کی بند گاڑی پہلے ہی موجود تھی۔ کوئی احتجاج کوئی فریاد کارگر نہ ہوئی۔ سلمان نے جرم کی نوعیت دریافت کی تو جواب میں گالیوں پر زوردار تھپڑ لگائے گئے۔ پھر اسے کسی جانور کی طرح گاڑی کے پچھلے حصے میں ٹھونس دیا گیا۔ چار مسلح سپاہی اس کے ساتھ اندر آئے۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ حصہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

سلمان کو حیرت تھی کہ انہوں نے کس جرم کی پاداش میں اسے گرفتار کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فاکیہ اس کی تمام مشکلات ختم کر چکی ہے، خانم کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اب کوئی انتقامی کارروائی کرے۔ پھر یہ افتاد کیسے آ پڑی؟ خلاف توقع پکڑے جانے اور پکڑنے والوں کے جارحانہ سلوک نے سلمان کو بوکھلا دیا تھا۔ معاً ظہری طبیزائی کا خیال آیا اور اس کا خون کھول اٹھا۔ یقیناً یہ اسی کی کارستانی تھی۔ اس کے آخری الفاظ سلمان کو یاد آئے کہ تہران اسٹیشن بھاری ہو جائے گا۔

سلمان کو شبہ ہوا کہ کہیں سحر نے ظہری کو خبردار کر کے اسے رکوانے کی تاکید نہ کی ہو۔ اب تو سلمان کو اپنے آپ پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ گاڑی کے اندھیرے میں گم وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ جس فاکیہ کے لیے موت کے منہ میں جا رہا تھا وہی اس وقت غائب ہے۔ نہ جانے کہاں مری ہوئی تھی۔

پولیس کی بند گاڑی مختلف راستوں پر گھومتی رہی، بیس پچیس منٹ بعد گاڑی رکی۔ پچھلا دروازہ کھولا گیا تو سلمان نے خود کو ایک قراول خانہ (تھانہ) کے احاطے میں پایا۔ قبل اس کے کہ سلمان اس قراول خانے کے محل وقوع کے بارے میں کچھ غور کر سکتا۔ دو مسلح سرباز (سپاہی) نے سلمان کو دھکا دے کر آگے چلنے کی ہدایت کی۔ جب وہ تھانے کے دفتر میں داخل ہوا تو اس کی حیرت دوچند ہو گئی کہ وہاں ناظم زادہ کھڑا تھا۔

''مجھے کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا ہے۔'' سلمان نے ہمت کر کے دریافت کیا تو ناظم زادہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''کسی ایک جرم کی پاداش میں؟'' ناظم زادہ مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ''گھبرائیے

نہیں محترم! ہم آپ کو یہاں عزت سے لائے ہیں۔ آپ کا احترام کرنا میرے فرائض میں داخل ہے۔ لیکن کیا بات ہے۔ آج آپ کے لہجے میں وہ گھن گرج نہیں ہے، جو ہوٹل کے کمرے میں محسوس ہوئی تھی۔ خدانخواستہ کہیں دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں ہے۔''

سلمان کو ڈر تھا کہ اگر بات طول پکڑ گئی تو معاملات بگڑ جائیں گے اور بن فاتح کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ لیکن جب ناظم زادہ نے مسلسل اس کی غیرت پر حملے کئے اور اس کی خاموشی کو بزدلی پر محمول کر کے بیہودہ انداز میں مذاق اڑایا تو ضبط نہ کر سکا۔ اس نے کہا۔ ''ناظم زادہ میری زبان نہ کھلواؤ تو بہتر ہے۔''

''گویا تمہارے منہ میں بھی زبان موجود ہے۔'' ناظم زادہ نے مسکرا کر کہا پھر یکلخت اتنی زور کا تھپڑ مارا کہ وہ چکرا گیا۔

''کمینے!'' ناظم زادہ غرایا ''پہلے روحیہ خانم کی ایک لڑکی کو اغوا کرایا پھر اس کی دوسری لڑکی کو بھی غائب کروانے کے چکر میں ہے؟''

''یہ غلط ہے۔'' سلمان نے احتجاج کیا۔ ''روحیہ خانم نے میرے خلاف کوئی جال بنا ہے۔''

''بکواس مت کر مال زادے۔'' ناظم زادہ نے اس کی ماں کے شان میں گستاخی کی۔ ''میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں اور عینی شاہد بھی۔ تجھے یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔''

''قبل از وقت کوئی بات اتنے یقین سے نہ کہو ناظم زادہ۔'' سلمان نے جھلا کر جواب دیا۔ ''آنے والا وقت ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون خسارے میں رہا ہے اور کون فائدے میں؟''

ناظم زادہ نے اشارہ کیا تو مسلح سپاہی سلمان پر خون آشام درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ رائفل کے کندوں نے دس منٹ کے اندر اندر اس کا جوڑ جوڑ ڈھیلا کر دیا۔ وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اور ناظم زادہ نخوت اور حقارت سے سلمان کو گھور رہا تھا۔ پھر اس کے اشارے پر سپاہی دور ہو گئے۔ ''عقل سے کام لو آغائی سلمان! سر باز کی مار کے آگے شیطان بھی نہیں ٹکتا۔ تم تو انسان ہو۔ لڑکی کے سلسلے میں اب بھی کھل جاؤ ورنہ ممکن ہے آٹھ دس روز تک تم اپنا بیان دینے کے قابل بھی نہ رہو۔''

بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کے خلاف گویا ایک محاذ بنا لیا گیا تھا۔ روحیہ خانم سے ساز باز کر کے لڑکی کو غائب کرا کے انہوں نے انتقاماً یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ فاکیہ کی غیر موجودگی میں سلمان کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے کچھ سوچ کر

کراہتے ہوئے ناظم زادہ سے کہا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکی کا پتا بتا دینے کے بعد قانون کی گرفت مجھ پر سست پڑ جائے گی۔''

''تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا ہوگا۔'' ناظم زادہ نے جواب دیا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ لڑکی کی بازیابی کے بعد فوراً تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

ناظم زادہ کے جواب سے اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ روحیہ خانم خود اس قسم کی جرأت کرتی یقیناً انہی لوگوں نے اسے اس امر پر مجبور کیا ہوگا۔ گویا سلمان کو پھانسنے کے لیے جو جال بنا گیا تھا وہ خاصا مضبوط تھا۔ ناظم زادہ کی نگاہوں میں عیارانہ چمک تھی۔ ظاہر ہے اگر وہ لڑکی کا کوئی فرضی پتا بتا بھی دیتا تو اپنا مطلب پورا ہو جانے کے بعد ناظم زادہ کبھی اپنا وعدہ وفا نہیں کرتا۔ ناظم زادہ نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' سلمان سنجیدگی سے بولا۔

ناظم زادہ غرا کر بولا۔ ''کیا تم سیدھی طرح زبان نہیں کھولو گے؟''

سلمان نے تیزی سے جواب دیا۔ ''تمہیں میری بات کا اعتبار کرنا چاہیے۔''

''اعتبار کے بچے تیری ذات کیا ہے، یہ میں تجھے بتاؤں گا، میں تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہوں۔''

ناظم زادہ کا غصہ شباب پر تھا۔ سلمان کے پاس مفر کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بے بسی کا احساس شدت سے غالب تھا۔ فاکیہ ابھی تک غائب تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ''تیار ہو جاؤ سلمان۔ گمنامی کی موت تمہارے مقدر میں لکھی ہے۔''

''میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔'' ناظم اعلیٰ زادہ نے بگڑتے ہوئے تیور سے کہا۔ ''پھر سوچ لو۔''

اچانک سلمان کو محسوس ہوا کہ فاکیہ واپس آ گئی ہے۔ ان کربناک لمحوں میں اس کی آمد سے ایسا معلوم ہوا ہے جیسے تن مردہ میں جان پڑ گئی ہو۔ آتے ہی اس نے کہا۔ ''سلمان! وقت بہت کم ہے۔ تم جلد سے جلد اس جنجال سے نکلو۔ بن فاتح کا چلہ ختم ہونے والا ہے۔''

سلمان نے اس اہم خبر کو سن کر بھی توجہ نہ دی اور وہ ہمت کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور ناظم زادہ سے کہا۔ ''ناظم زادہ! برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ تم اپنی من مانی کر

چکے۔اب میری باری ہے،تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ بہت برا برتاؤ تم نے میرے ساتھ کیا ہے،اسے میں بھول جاؤں گا۔''

''مردود۔تو نے ابھی تک صرف میرا نام سنا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ بڑے بڑے مجرم میرے سائے سے ڈرتے ہیں۔''ناظم زادہ دہاڑنے لگ۔

''روحیہ خانم کے چکر میں مت پڑو میرے دوست۔ وہ تمہیں کیا دے سکتی ہے۔'' سلمان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

ناظم زادہ اس کے بدلے ہوئے رویے سے کشمکش میں پڑ گیا۔ وہ اس سے کچھ نہیں اگلوا سکا تھا۔اس کے پاس کچھ ہوتا تو وہ اگلواتا۔اس کا جارحانہ انداز بڑھتا رہا اور سلمان پرسکون ہو کر جواب دیتا رہا پھر اس نے جھلا کر مسلح سپاہیوں کو سلمان کو زدوکوب کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ سپاہی جو آدم خود بھیڑیوں کی طرح کچھ دیر پہلے ٹوٹ رہے تھے۔یکا یک ہی خاموش ہو گئے۔ پھر ایک سپاہی نے سرگوشی میں کچھ کہا جسے سنتے باقی سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ناظم زادہ نے دوبارہ انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔''مال زادے کو اتنا مارو کہ یہ اپنے پیروں پر چل نہ سکے۔''

تبھی ایک سپاہی نے بے خوفی سے جواب دیا۔''ہم خلاف قانون کوئی کام نہیں کریں گے۔''

اس جواب نے اسے تلملا دیا۔اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔اسے شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔سلمان کو پوری امید تھی کہ اب یہ لوگ آپس میں لڑ پڑیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ناظم زادہ نے آگے بڑھ کر کہا۔''مجھے خود نمٹنا پڑے گا۔''

پھر اس نے اتنی زور سے طمانچہ گھمایا کہ اگر سلمان کے منہ پر پڑتا تو اس کا چہرہ بگڑ جاتا۔اس کا ہاتھ بس گھوم کر رہ گیا تھا۔ایسا لگا تھا کہ سلمان کے گال اور اس کے ہاتھ کے درمیان ایک نادیدہ دیوار آ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ گھوم کر رہ گیا تھا۔اس ناکامی پر اسے سنبھل جانا چاہیے تھا مگر وہ تو گویا مزید بھڑک گیا اور گالیاں بکتا ہوا سلمان کی طرف بڑھا اور کچھ ہی دیر میں اس کی عقل ٹھکانے آ گئی اور اسے معلوم ہو گیا کہ سلمان تک پہنچنا دشوار ہے۔

''مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔وقت رہتے سنبھل جاؤ ورنہ پچھتانے کا بھی وقت نہیں ملے گا۔'' سلمان بولا۔

ناظم زادہ بیچارگی میں دانت کچکچاتا رہ گیا۔

''یاد رکھنا تم اگر ظلم کرو گے تو جواب میں بھی ظلم ہی ملے گا۔'' سلمان نے کہا۔

سپاہی دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔سلمان فاکیہ کی وجہ سے شیر ہو رہا تھا کہ یکا یک فاکیہ کی چیخ بلند ہوئی۔سلمان نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا فاکیہ کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ فاکیہ صرف اسے نظر آ رہی تھی۔ وہ فاکیہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ فاکیہ بولی۔''میں.....میں.....جا.....جا رہی.....ہوں.....اف.....آہ۔''اور وہ غائب ہو گئی۔

اس کے جاتے ہی وہ پھر سے غیر مطمئن ہو گیا تھا۔ناظم زادہ اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ سپاہی جو بھیگی بلی بنے ایک طرف کھڑے تھے،وہ بھی شیر بن رہے تھے اور سلمان کی طرف بڑھنے لگے تھے کہ کمرہ تفتیش میں ایک شخص چیختا چنگھاڑتا داخل ہوا۔اسے دیکھ کر سبھی چونک گئے۔اس نے اندر آتے ہی کہا۔''یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''مگر تم ہو کون؟''ناظم زادہ نے پوچھا۔''اور تم اندر کیسے آ گئے؟''

''میرا نام بن فاتح ہے، میں جب جہاں چاہوں داخل ہو سکتا ہوں۔ یہاں میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں کیوں کہ یہ تمہارے بس کا نہیں ہے۔ابھی ابھی میرا چلہ مکمل ہوا،اسی خوشی میں میں اسی کا جوتا اسی کے سر پر بجانے آیا ہوں۔''

''او کمینے!اپنی زبان کو لگام دے۔نہیں تو میں تیرا سر زمین سے رگڑ دوں گا۔''سلمان نے اس کی لاف گزاف سن کر غضبناک لہجے میں کہا جس کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہو وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔اس نے سوچا،اس آخر وقت میں ذلت کی موت کیوں مرا جائے؟

وہ اس کا جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔اس کی آنکھیں ایک لمحے کو پٹپٹائیں،پھر ان میں غصے کی سرخی چھا گئی۔اس نے حقارت سے سلمان کو دیکھا اور سرد آواز میں بولا۔''میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا۔ میں تمہیں تڑپا تڑپا کر کتوں سے بدتر موت ماروں گا۔ابھی تمہارا ہاتھ توڑوں گا،پھر تم لنگڑے ہو گے،اس کے بعد تمہاری آنکھوں کی روشنی بھی اندھیروں میں بدل دوں گا۔تم در بدر کی خاک چھانتے پھرو گے۔گندی نالیوں میں لوٹ لگاتے نظر آؤ گے۔''

''میں تجھ سے نہیں ڈرتا۔''وہ اس کی طرف کسی پاگل کتے کی طرح لپکا اور جتنی گالیاں اسے دے سکتا تھا،اس نے دے ڈالیں۔اس نے جنون کی حالت میں اس کے کپڑے پھاڑ دیے لیکن اس کے ہاتھ اچانک رک گئے۔اس سے پہلے وہ اس کے جسم پر چڑھ بیٹھتا،اسے آس پاس وہی مانوس خوشبو محسوس ہوئی۔ قدم منجمد ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے خون کی گردش روک دی ہو۔سلمان نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور اس کا ذہن بتدریج پرسکون ہونے لگا۔

اس نے عالم تصور میں اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ وہاں فاکیہ موجود تھی مگر اس کے انداز میں اجنبیت تھی جیسے وہ سلمان کو بالکل نہ جانتی ہو۔ وہ جو کبھی اس کے اشارے پر اپنا خون بہا دیتی تھی۔ اس وقت وہ سلمان کو بڑی خطرناک اور کینہ توز نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں نفرت اور انتقام کے جذبے نمایاں تھے۔ اس کا چہرہ خون کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ سلمان نے جو فاکیہ کو اس عالم میں دیکھا تو سابقہ تعلق کی رعایت چاہی۔ اس نے دل ہی دل میں حسرت سے کہا۔ ''فاکیہ..... تم۔''

حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ فاکیہ پر بن فاتح نے فتح پالی ہے اور اس کا نتیجہ بھی اس نے دیکھ لیا کہ فاکیہ نے منہ پھیر لیا۔

''فاکیہ! مجھے اس کمینے سے بچاؤ۔'' سلمان نے پھر بھی اس سے التجا کی۔

جواب میں وہ بولی۔ ''تو نے میرے آقا پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ اگر بچنا چاہتا ہے تو ہاتھ باندھ کر معافی مانگ۔''

''فاکیہ! یہ تم کہہ رہی ہو؟'' سلمان نے پژمردگی سے پوچھا۔

''آگے بڑھ اور میرے آقا سے معافی مانگ۔''

فاکیہ کا لہجہ اس قدر خوفناک تھا کہ سلمان اسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا، اسے احساس ہو گیا کہ اب فاکیہ سے کوئی امید رکھنا حماقت ہے۔ اس بار فاکیہ بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے فاکیہ کا رویہ بہت جارحانہ لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یکسر بدلی ہوئی فاکیہ کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً فاکیہ نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے اپنے جملے دہرائے اور سلمان نے غیر ارادی طور پر بن فاتح کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

بن فاتح کے مکروہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ حقارت سے بولا۔ ''ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے۔ تمہاری عقل میں بات جلدی آ گئی۔ تم نے اپنے آپ کو پہچان لیا کہ تم کتنے حقیر ہو۔''

یکا یک فاکیہ کے چہرے کے تاثرات زیادہ تیکھے اور خوفناک ہو گئے۔ بن فاتح نے ہونٹ ہلائے۔ اس کی آواز مطلق بلند نہیں ہوئی لیکن سلمان سمجھ گیا کہ وہ اسی کے بارے میں فاکیہ کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ ادھر بن فاتح کے ہونٹ ہلنے بند ہوئے ادھر فاکیہ کا تلخ لہجہ سلمان کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترتا چلا گیا۔ ''میرے آقا بن فاتح کی خواہش ہے کہ تم اسی وقت پرانے قبرستان کی طرف چلو۔''

سلمان نے فاکیہ کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے تلخ لہجے اور دل آزار رویے کی شکایت کرنی چاہی لیکن قوت گویائی نے ساتھ نہیں دیا۔ سلمان کے قدم خود بخود پرانے قبرستان کی جانب اٹھنے لگے۔ اس کے ارادے کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ناظم زادہ اور اس کے سپاہیوں نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

فاکیہ کی پراسرار قوت اسے قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بن فاتح کسی فاتح کی طرح اس کے ساتھ ساتھ سینہ تانے چل رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ پرانے قبرستان کے ویران اور سنسان علاقے میں تھا۔ اس اندھیری رات میں قبرستان کا منظر ایک عام آدمی کے دل کی حرکت بند کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تاحد نظر قبریں اور گہرا سناٹا، درختوں کے کسی جھنڈ میں رات کو بولنے والے جانور۔

''سلمان! کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟'' بن فاتح نے نفرت سے دریافت کیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ تم نہ جانے کیا چاہتے ہو؟'' سلمان نے غیر اختیاری طور پر جواب دیا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ یہاں ایک پرانا کنواں ہے۔ جو اندھا کنواں کے نام سے مشہور ہے۔''

''ہاں۔'' سلمان کے منہ سے نکلا۔

''تم میرے حکم پر اس کنوئیں میں چھلانگ لگاؤ گے۔'' بن فاتح کے لہجے میں حقارت اور نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ''میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ تمہارے ناپاک جسم کا بوجھ اس زمین پر زیادہ دیر، کچھ اچھا نہیں رہے گا۔ اس کنوئیں سے تم باہر نہیں آ سکو گے اور جلد مر بھی نہیں سکو گے۔ بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔''

بن فاتح نے جو کچھ کہا، سلمان پر اس کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ غالباً فاکیہ کے پراسرار قوت نے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کر دی تھی۔ اس کی کسی حرکت یا جنبش میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ گنگ سا کھڑا ابن فاتح کو دیکھ رہا تھا کہ فاکیہ پر نظر ڈالی۔ وہ خون اگلتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو فاکیہ نے سرد آواز میں کہا۔ ''بائیں جانب گھوم کر آگے بڑھو۔ کنواں تمہاری زندگی کا قصہ تمام کرنے کا منتظر ہے۔''

سلمان کسی فرمانبردار بچے کی طرح اپنا رخ بائیں جانب کیا اور آگے قدم بڑھا دیئے،

ابھی بمشکل سو گز دور گیا تھا کہ اس کنوئیں کے نزدیک پہنچ گیا جس کے بارے میں بن فاتح نے حکم دیا تھا۔ اس نے کئی لوگوں سے اس کنوئیں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اگر وہ عام حالات میں یہاں آتا وہ اس کنوئیں کے اسرار جاننے کی کوشش ضرور کرتا لیکن اس وقت تو وہ خود اسرار میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس فتنہ ساماں فاکیہ کے بھیانک وجود کو فریادی نظروں سے دیکھا مگر اس نے سلمان کی کسی التجا، کسی آہ کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ کرختگی سے بولی۔

''سلمان! آگے بڑھو اور اس کنوئیں میں چھلانگ لگا دو۔''

سلمان فاکیہ کے حکم پر خاموشی سے آگے بڑھا اور کنوئیں کے قریب پہنچ کر اس کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ کنوئیں میں اتنی تاریکی تھی کہ اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی باہر ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے کنواں کے گھپ اندھیروں میں اپنی موت کی پرچھائیاں دیکھیں، اور فاکیہ کے حکم پر اپنا جسم آگے کی جانب جھکانا چاہا۔ بس ایک لمحے کی دیر تھی کہ اچانک کسی نادیدہ طاقت نے اس کے شانے پکڑ لیے۔ منڈیر پر اس طرح اس کا جسم متحرک ہونے سے توازن بگڑ گیا۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ ایک مدھم مترنم نسوانی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''سلمان کیا کرتے ہو؟ آگے موت ہے، رک جاؤ۔''

اس آواز میں معلوم نہیں کیا جادو تھا کہ سلمان دفعتہً ہوش میں آ گیا۔ وہ کس کی آواز تھی؟ اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن اس کے اعصاب پر فاکیہ کا جو سحر طاری تھی وہ ضرور ٹوٹ گیا۔ اس نے بوکھلا کر چھلانگ لگائی اور کنوئیں کی منڈیر سے نیچے آ گیا۔ اسی وقت فاکیہ نے سفاکانہ انداز میں اسے دوبارہ حکم دیا۔ ''سلمان! میرے آقا کے حکم کی تعمیل کرنا تمہارے لیے لازمی ہے، اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہارے جسم کا سارا خون پی جاؤں گی۔ تمہارا جسم دیکھتے دیکھتے ہڈیوں کے پنجرے میں بدل جائے گا۔''

وہ فاکیہ کی آواز بخوبی سن رہا تھا لیکن اس پر عمل کرنا نہ کرنا اب اس کے امکان میں تھا۔ اس بار اسے فاکیہ اس آواز سے خوف نہیں آیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ نزع کے اس عالم میں کوئی غیر معمولی قوت اس کی مدد کر رہی ہے۔

بن فاتح اسے کنوئیں کی منڈیر سے اترتا دیکھ کر بری طرح جھلا گیا تھا۔ اس نے بیزاری سے سلمان کے سر کی جانب دیکھا۔ پھر طنزاً بولا۔

''فاکیہ کیا ابھی تک تیرے دل کے نہاں خانے میں پرانے آقا کی کشش باقی ہے۔''

''نہیں جناب، نہیں۔'' فاکیہ نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''پھر.....؟ یہ نیچے کیوں آ گیا؟'' بن فاتح غرا کر بولا۔ ''کیا اس کے لیے مجھے کچھ اور کرنا ہوگا؟''

''نہیں، تجھے اب اور کچھ نہیں کرنا ہوگا۔'' سلمان نے عجیب سی سحر زدہ آواز میں کہا۔ ''میں تیرے حکم کے تابع نہیں ہوں۔''

سلمان کی آواز نے اسے بوکھلا دیا۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اے! تیری یہ ہمت، میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔''

''اگر ہمت ہے تو مجھے سزا دے۔'' سلمان بولا۔

بن فاتح آگے بڑھا۔ ابھی اس نے قدم بڑھائے تھے کہ کسی نے سلمان کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''اب تم کنوئیں میں چھلانگ لگا دو۔''

اس آواز میں ایسی کشش تھی، ایسا سحر تھا کہ سلمان کا ذہن دوبارہ غنودگی کے زیر اثر آ گیا۔ وہ کچھ غور کیے بغیر کنوئیں کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ ہاں اسے احساس تھا کہ کنوئیں کے اندر اذیت ناک موت اس کے انتظار میں ہے، اس کے باوجود اس ہمدرد آواز کی ایماء پر اپنی موت کو خوش دلی سے گلے لگانے کے لیے بے چین ہونے لگا۔

''سلمان! رک جاؤ۔'' بن فاتح نے اسے کنوئیں کی سمت جاتا ہوا دیکھ کر اپنا عمل ادھورا چھوڑ دیا۔ ''تو نے جب میری مرضی کو پورا نہیں کیا تو اب تو اپنی مرضی سے نہیں مر سکتا۔ میں تجھے زندہ رکھوں گا اور آہستہ آہستہ تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔''

بن فاتح کے رعب دار حکمیہ لہجے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے کنوئیں کے قریب آ گیا اور اچھل کر منڈیر پر چڑھ گیا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نے گہری تاریکی میں اپنا جسم دوسری طرف گرا دیا۔ اس کا جسم فضا میں تیرتا ہوا تیزی سے نیچے کی سمت جا رہا تھا۔ نہ جانے موت کا وہ اعصاب شکن تصور تھا یا کسی طاقت کا کرشمہ؟ یا خوف یا کوئی اعصابی دباؤ کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے سارے احساسات اور تمام جذبے تاریکیوں میں ضم ہو گئے۔ ہر شئے اندھیروں کا جزو بن گئی۔ اسے مطلق معلوم نہیں کہ اس نے نیچے کی سمت کتنی دور تک سفر کیا۔ وہ اپنے حواس کھو چکا تھا۔ ہاں اس وقت اسے ایک آخری کربناک خیال آیا تھا کہ وہ مر رہا ہے۔

مگر وہ نہیں مرا۔ وہ سخت جان شخص تھا جو اس پراسرار کنوئیں، اندھیری رات اور

قبرستان کے ہولناک ماحول میں بھی سانس کی ڈوری قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ موت جس شخص کے اتنے قریب سے گزری ہو اور جس کی زندگی میں ایسے جاں گسل لمحے آئے ہوں، وہی اس تحریر کا تاثر محسوس کر سکے گا۔ اسے خوب یاد تھا کہ اس نے اس اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگائی تھی جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ ہر سال نہ جانے کتنی جانیں نگل جاتا ہے، وہ مسلمان تھا اسے سکھایا گیا تھا اور یہ ہی اس کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد جسم خاک میں مل جاتا ہے، لیکن روح روز قیامت تک زندہ رہتی ہے۔ چنانچہ جب ایک حسین آواز اس کی تار سماعت سے ہمکنار ہوئی تو وہ سمجھا کہ کوئی حور اس سے مخاطب ہے۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ عجب کیفیت طاری ہوگئی، آہ! وہ کیا نظارہ تھا کہ ایک گل بدن، سیمیں تن، گل رعنا، سراپا تمکنت، سراپا عشق اس کے سامنے ہے۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی سانسوں کی خوشگوار مہک، روح کے دروازے میں در آئی اور اسے محسوس ہوا کہ اس نے حیات کا وہ لطیف، وہ سب سے خوبصورت گوہر پا لیا ہے جس کے لیے حیات سرگرداں رہتی ہے۔ ''کیا میں زندہ ہوں؟'' اس نے سوچا پھر اس پری شمائل کو دیکھا تو زندگی پر اعتبار آیا۔ وہ خود سے بولا، سلمان بدبخت تو مرا نہیں، زندہ ہے۔ آہ تیرے مقدر میں ابھی اور تماشے لکھے ہیں۔

سلمان کی نظریں اس کے حسین و جمیل نقاب میں ڈھکے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اپنی شبنمی آنکھیں وا کیے نقاب سے سلمان کو معصومانہ انداز سے دیکھ رہی تھی، سلمان نے اپنی زندگی میں بے شمار حسین لڑکیاں دیکھی تھیں، وہ ان چند حسین لڑکیوں میں ایک اضافہ تھی جنہیں اس کی حسن شناس نگاہوں نے سند حسن دی تھی۔ حسینہ کا ایک ایک انداز، زندگی کی سرمستیوں سے معمور تھا۔ سلمان اس کے نظارے میں کھویا رہا اور ذہن گزشتہ واقعات کی کڑیاں ملانے لگا۔ بن فاتح فاکیہ کے ذریعے اسے پرانے قبرستان میں لے گیا تھا۔ وہاں اس نے اس پر جان لیوا حملے کیے تھے لیکن کوئی ان دیکھی قوت اسے بچاتی رہی۔ پھر اس کے اشارے پر سلمان نے خود کو اندھے کنوئیں کی نذر کر دیا تھا اور بیدار بختی کی بناء پر اب وہ ایک حسین لڑکی کے سامنے موجود تھا۔ وہ زندہ تھا اور اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا۔ مگر یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ممکن ہوا؟ یہ راز عجیب اور حیرت انگیز تھا۔ وہ ابھی انہی پریشان خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ حسینہ نے اپنے شیریں لبوں کو جنبش دی۔ ''خدا کی رحمت ہے جو تم بچ گئے۔ ورنہ کنواں اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کی جان لے چکا ہے۔''

''تم کون ہو؟'' سلمان نے لڑکی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لڑکی نے چہرے پر حجاب ڈال رکھا تھا اس لیے وہ اسے صحیح طور سے دیکھ نہ پایا تھا۔ مگر آنکھیں پہچانی پہچانی سی لگ رہی تھیں۔

''میرے بارے میں نہ پوچھو۔ اپنا جی ہلکان نہ کرو۔ قدرت کی یہی مرضی تھی کہ تم ابھی زندہ رہو۔'' اس نے کہا۔

سلمان نے قریب جوار کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہ ایک پرانے قبرستان کے قریب ہی غیر آباد حصے میں پڑا تھا۔ وہاں ایک شکستہ جھونپڑی موجود تھی، اس کے سوا دور و نزدیک کوئی دوسری عمارت نہیں تھی، اس نے لڑکی کے بارے میں پھر اپنے بارے میں سوچا، تعجب ہے اس پراسرار اندھے کنوئیں سے میں کیونکر نکل آیا؟ میرے جسم پر ایک معمولی خراش تک نہیں ہے۔ نہ ہی میرے کپڑے بھیگے ہوئے یا گرد آلود ہیں، یہ لڑکی کون ہے جو اس ویرانے میں دھرنا دیئے بیٹھی ہے، بظاہر یہ بھولی بھالی معصوم سے لڑکی نظر آ رہی ہے۔ اس کی آواز کیوں شناسا سی لگ رہی ہے؟

''وہ تمہاری جان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ کون تھا؟'' لڑکی نے معصومیت سے سوال کیا۔

''وہ میرا دشمن تھا۔'' سلمان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''کیا تم اس جھونپڑی میں اکیلے رہتی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ؟''

''میرے ساتھ۔'' لڑکی نے چونک کر دیکھا، پھر مسکرا کو بولی۔ ''میں اکیلی رہتی ہوں۔''

''تم نے اکیلے مجھے اس کنواں سے نکالا؟''

''نہیں! بھلا میں اکیلی تمہیں کیسے نکال سکتی تھی؟'' اس نے سلمان کا تجسس محسوس کر کے سادگی سے جواب دیا۔ ''تمہاری قسمت اچھی تھی کہ ایک مسافر ادھر آ نکلا۔ میں نے اس سے التجا کی تھی، وہی تم کو کنوئیں سے نکال کر میری جھونپڑی تک پہنچا گیا تھا۔''

''یعنی تم تنہا اس جھونپڑی میں رہتی ہو؟'' سلمان نے اپنا سوال دہرایا۔ یہ لڑکی اسے بہت پراسرار نظر آ رہی تھی، ایک جوان اور حسین لڑکی کا کسی ویرانے میں تن تنہا رہنا بڑی تعجب خیز بات تھی۔

''ہاں!'' لڑکی نے اپنی خوبصورت آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچنبھا کیوں ہو رہا ہے؟''

''یوں ہی۔'' اس نے کہا اور خلاء میں گھورنے لگا۔ بیتی ہوئی رات کے بھیانک لمحات اب پریشان کرنے لگے تھے۔

سلمان کی خاموشی پر لڑکی بھی خاموش رہی۔ پھر اس نے سکوت توڑا۔ ''میں کچھ کھانے کے لیے لے آؤں۔''

لڑکی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جھونپڑی کے اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ تازہ پھل تھے۔ سلمان بھوکا تھا اس لیے ندیدوں کی طرح پھلوں پر ٹوٹ پڑا۔ لڑکی سلمان کے قریب بیٹھی اسے دلچسپی سے دیکھتی رہی، جب سلمان سیر ہو کر پھل کھا چکا اور کچھ جان میں جان آئی تو اس نے لڑکی سے اس کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟''

''میرا نام شیریں ہے۔'' لڑکی نے شرما کر جواب دیا۔

اب اس نے غور سے دیکھا۔ شرعی حجاب میں آدھے چہرے کو ڈھکے بیٹھی لڑکی کوئی اور نہیں اس کی شیریں تھی مگر اس کی نگاہوں میں اب وہ پہلی سی وارفتگی نہیں تھی۔ وہ شیریں جو کبھی اس کے لیے گھر چھوڑ کر آئی تھی آج اجنبی کی طرح بیٹھی تھی۔ مگر بہت بدل گئی تھی۔ اب اس کے چہرے پر نور کا پرتو تھا۔ اسی لیے سلمان کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس سے پرانے مراسم کا ذکر کرے۔ اس لیے وہ بھی بیگانا سا بن گیا۔ شیریں اس مقام تک کیسے پہنچی یہ وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر رعب و جلال نے اس کی اجازت نہ دی۔ وہ اپنے خیالوں میں' سوچ کے گرداب میں گھرا رہا۔

وہ موت کے منہ سے بچ آیا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سکون، یہ زندگی عارضی ہے۔ بن فاتح کو فاکیہ کے ذریعے کسی بھی وقت یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے وہ اس پر ظلم توڑنے کے لیے دوبارہ آمادہ ہو جائے گا۔ پیٹ میں کچھ غذا پڑی تو اسے اپنے پیچیدہ حالات پر سنجیدگی اور سکون سے غور کرنے کا سلیقہ آیا اور فاکیہ کا خیال آیا۔ فاکیہ نے گزشتہ رات جس ڈھٹائی اور بے وفائی کا برتاؤ کیا تھا، وہ یاد آیا تو کلیجہ پھٹنے لگا۔ پھر اس نسوانی آواز کا خیال آیا جو اندھیروں میں نجات دہندہ بنی تھی، وہ آواز کس کی تھی؟

معاً اس کے ذہن میں ایک خیال تیر کی طرح پیوست ہو گیا کہ کہیں وہ شیریں ہی تو نہیں تھی؟

سلمان نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ معصومانہ اور والہانہ انداز سے سلمان کے

چہرے کے ادلتے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی، سلمان اور اس کی نظریں ملیں تو وہ سمٹ کر بولی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟ بہت دکھی معلوم ہوتے ہو؟ کیا پریشانی آ پڑی ہے۔''

''ہاں شیریں!'' سلمان نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ایک پریشانی ہو تو کہوں۔''

''جس خدا نے تمہیں زندہ رکھا ہے، وہی تمہاری پریشانیوں کا بھی کوئی حل پیدا کر دے گا۔'' شیریں نے اپنائیت سے جواب دیا پھر اسے سہارا دے کر کٹیا کے اندر لے گئی، یہاں دو ایک برتنوں اور چارپائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سلمان کچھ دیر شیریں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اسے نیند آنے لگی اور آنکھ لگ گئی۔

شام کو سلمان کی آنکھ کھلی۔ کٹیا میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سلمان نے اٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ شیریں وہاں نہیں تھی، اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ کسی کام سے باہر گئی ہو گی۔ سلمان اٹھ کر کٹیا سے باہر آ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھٹک کر رک گیا۔ ظہری طبیزائی تمام قہر سامانیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس کے تیور اب بھی ویسے ہی اشتعال انگیز تھے، آنکھوں میں وہی غصہ، چہرے پر وہی کھنچاؤ تھا، وہی بیزاری تھی، اسے دیکھ کر سلمان کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ شخص پھر رعونت کے ساتھ سلمان کے سامنے کھڑا تھا، جس نے اسے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اس پر بھروسا کر کے سلمان نے نقصان ہی اٹھایا تھا۔ لیکن سلمان اس کا کیا کر سکتا تھا؟

''مجھے یقین تھا کہ تو بن فاتح کے ہاتھوں مر نہیں سکتا۔'' ظہری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تمہیں تو مجھے زندہ دیکھ کر دکھ ہوا ہو گا؟''

''تیرے دل کا کھوٹ ابھی دور نہیں ہوا؟'' ظہری طبیزائی تیزی سے بولا۔ ''مجھے دشمن سمجھتا ہے؟''

''اور تم مجھے سمجھانے آئے ہو؟ کیا میں تمہیں اپنا دوست سمجھوں؟'' سلمان نے تلخ آواز میں کہا۔

ظہری طبیزائی کا چہرہ گھمبیر ہو گیا۔ ''تجھے تیری بساط سے زیادہ مل گیا؟'' وہ نفرت سے بولا۔ ''پرتو نے ابھی زندگی میں دیکھا کیا ہے؟ فاکیہ کو پا کر تو یہ سمجھا تھا کہ بہت بڑی قوت کا مالک بن گیا ہے۔ تو اس جہان میں سب سے زیادہ قوت والا ہے۔''

''اب تم کیا کہنے آئے ہو، ظہری طبیزائی؟'' سلمان نے چڑ کر کہا۔

''میں تجھ سے پہلے بھی کچھ کہنے آیا تھا لیکن تو نے میری بات سننے کے بجائے مجھ پر

شبہ کیا۔ میں اپنے دوست اور اس کی بیٹی سحر کی وجہ سے مجبور ہوں جو تیرے پاس دوبارہ آنا پڑا'' ظہری طبیزائی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ ابھی تیرے برے دن ختم نہیں ہوئے۔ جب تک تو اپنا دل صاف نہیں کرے گا۔ تو کچھ نہیں کر پائے گا۔''

''تم سدا برے دن کی پیش گوئیاں کرنے آتے ہو۔''

''تو اپنی ہٹ کی وجہ سے اپنے لیے خود کانٹے بوتا آیا ہے۔''

ظہری طبیزائی کی باتیں بڑی تلخ اور زہر میں بجھی ہوئی تھیں لیکن اب سلمان کے ذہن کی وہ حالت نہیں تھی، جو کچھ دیر قبل تھیں، سلمان یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوا کہ ظہری طبیزائی اگر میرا دشمن ہے تو میرا قصہ تمام کیوں نہیں کر دیتا۔ وہ بن فاتح سے زیادہ، بڑا عامل ہے، سلمان نے اس سے کہا۔ ''میری عقل خبط ہو چکی ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔''

''ابھی سے پریشان ہو رہا ہے؟ ابھی تو تیرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔'' ظہری طبیزائی کے لہجے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ''آگے آگے دیکھ کیا ہوتا ہے اور تجھ پر کیا گزرتی ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے، سب میرے دشمن ہیں۔ مجھے معاف کر دو'' جانے کس جذبے کے تحت سلمان آگے بڑھ کر اس کے سینے سے لگ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ سلمان نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ''میرا سب کچھ چھن چکا ہے۔ میں گھر سے بے گھر ہو گیا اور در بدر کی خاک چھان رہا ہوں، بن فاتح میرے تعاقب میں ہے، میں ایک سادہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے چین نہیں ملتا تم میری مدد کر دو یا پھر میرا گلا گھونٹ دو، کچھ تو کرو۔''

ظہری طبیزائی سلمان کی ندامت اور رقت سے متاثر ہوا۔ ''اب تیرے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے، مرد بن کر حالات کا مقابلہ کر۔'' ظہری طبیزائی نے رکھائی سے کہا۔ ''اگر تو نے پہلے میرا کہا مان لیا ہوتا تو میں تیری مدد کر سکتا تھا لیکن اب بات آگے بڑھ چکی ہے۔ اب میری قوت بھی آڑے نہیں آ سکتی۔''

''ایسا نہ کہو۔ میں ہاتھ باندھ کر تمہارے آگے التجا کرتا ہوں، مجھے معاف کر دو، میری مدد سے منہ نہ موڑو۔''

''پاگل۔ جانور۔'' ظہری طبیزائی تلملا کر بولا۔ ''کیا تجھے اس بات کا پتا نہیں تھا کہ جب تک بن فاتح چلہ پر بیٹھا ہے کوئی قوت اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ تیری خواہش یہی تھی کہ تو بن فاتح کا تیاپانچا کر دے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ چلہ کے لیے کھینچے گئے حصار سے باہر

آئے۔ سحر نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں تیری مدد کروں۔ میں نے تجھے مشہد جانے سے اس لیے روکا تھا کہ اگر تو مشہد جاتا تو مزید پریشانی میں گھر جاتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ فاکیہ کی قوت تیرے سر سے چلی جائے کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ بن فاتح، فاکیہ کو قبضہ کر کے گھمنڈ میں حصار سے باہر آ جائے گا۔ اس کے بعد تو اسے مار سکتا تھا لیکن تو اندھا ہو رہا تھا۔ تو نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ تو نے فاکیہ کی قوت کے آگے میری باتوں میں بھی کھوٹ سمجھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب تو کوئی اور ہی قوت تیری مدد کر سکتی ہے۔''

''مجھے راستہ دکھاؤ'' سلمان نے تڑپ کر کہا۔ ''مجھ سے بھول ہو گئی تھی، میرا ذہن پلٹ گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو، میں جانتا ہوں کہ تم قوت کے مالک ہو، تم ضرور کوئی مسئلے کا حل نکال سکتے ہو۔''

''میں اس وقت اسی لیے آیا ہوں۔'' ظہری طبیزائی نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میری باتیں دھیان سے سن۔ کل رات تجھے بن فاتح کے چنگل سے بھی کسی بڑی قوت نے بچایا تھا۔ وہی اب تیری مدد کرے گی۔ میں تجھے اس قوت کا نام نہیں بتا سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر اب بھی تو نے اپنی عقل استعمال نہیں کی تو ساری زندگی روتا رہے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے سلمان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔ ظہری طبیزائی چلا گیا لیکن سلمان کو اپنی قسمت پر آنسو بہانے کے لیے چھوڑ گیا۔

اس کا ایک ایک لفظ آہنی ہتھوڑے کے مانند اس کے دل و دماغ پر ضربیں لگا رہا تھا۔ اسے اپنی ضد، اپنی نادانی اور عجلت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں پر شک کر کے اپنے لیے خود مصیبتیں بوئی تھیں۔ اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ظہری طبیزائی' عمو اور سحر میرے دوست ہیں۔ ان کے آگے فاکیہ کی قوت بے بس ہو جاتی ہے۔ سلمان' ظہری کے سامنے فاکیہ کی بے بسی کا واقعہ بھول گیا تھا۔ فاکیہ کی طاقت معدوم ہوتے دیکھی تھی اور بن فاتح کے سر پر جا کر وہ بے اثر ہو گئی تھی۔ گزشتہ رات بھی فاکیہ کی پراسرار قوت اسے اپنے اشاروں پر نہیں چلا سکی تھی،

وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً کوئی بہت بڑی طاقت میری پشت پناہی کر رہی ہے۔ ظہری طبیزائی کا منصوبہ کس قدر سیدھا اور صاف تھا کہ وہ کسی صورت سے بن فاتح کو حصار سے باہر نکالنا چاہتا تھا اور وہ طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر حصار سے باہر نکل آئے۔ اس کے بعد بازی میرے ہی حق میں ہوتی یوں کہ ظہری طبیزائی میرے ساتھ تھا۔

لیکن سلمان نے اپنی حماقتوں سے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اب پچھتاوے کے سوا اور کیا باقی رہ گیا تھا۔

اسی شدید جھنجلاہٹ اور کرب کے عالم میں اسے شیریں کی آواز آئی۔ ''آغا! کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ سامنے سے اس کی طرف آ رہی تھی۔

اس کی آواز سے سلمان کے خیالوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ وہ اسے اور پراسرار لگی۔ یقیناً یہ کوئی بہت بڑی کاہینہ ہے جس نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ وہ مجھے شیریں نظر آئے۔ بالکل اسی طرح جیسے شیریں کے گھر میں میں اسے اور دیگر لوگوں کو اس کا گمشدہ بھائی نظر آتا تھا۔ یہی بات ہو گی۔ ظہری طبیزائی نے اسی عورت کے بارے میں اشارہ کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر اس کے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ سلمان نے لرزتے ہوئے اس ماہ جبیں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

''شیریں۔'' سلمان نے بڑی عقیدت سے اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے میرے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا ہے۔ اگر رات تم مجھے اس اندھے کنویں سے نہ نکلواتیں تو کسی کو میری موت پر دو آنسو بہانے کا خیال بھی نہ آتا۔''

''نہیں آغا، مجھے شرمندہ نہ کرو۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو تم رات ہی مر چکے ہوتے۔''

''خدا کی رضا اپنی جگہ ہے، مگر تم نے مجھ پر جو مہربانی کی ہے میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں گا۔''

''میں تمہاری کنیز ہوں!'' شیریں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

نہ جانے کیوں سلمان کو ایسا لگا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتا ہو۔ اس خیال نے اسے اور پریشان کر دیا سلمان نے ٹوہ لینے کی غرض سے کہا۔ ''شیریں! میرے کچھ دشمن میرا پیچھا کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے وہ میرے تعاقب میں یہاں بھی آ جائیں اور میری وجہ سے تمہیں بھی پریشان ہونا پڑے۔''

''میری فکر مت کرو آغائی سلمان۔ مجھ کو بھلا کون پریشان کرے گا۔'' شیریں نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

''تم میرے حالات سے ناواقف ہو، جو ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میرا یہاں سے چلا جانا ہی مناسب ہے۔'' سلمان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یوں بھی مجھے تم پر بوجھ بن کے رہنا کچھ

اچھا نہیں لگتا۔''

ایک لمحے کے لیے شیریں کی آنکھوں کا رنگ بدلا۔ پھر وہ سادگی سے بولی۔ ''اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں منع نہیں کروں گی مگر ایک رات رک جاؤ۔''

ایک اور سخت اور کربناک رات گزر گئی۔ سلمان مٹی کے فرش پر اوندھا پڑا اپنی عقل اور قسمت کا ماتم کرتا رہا۔ دوسری صبح جب بیدار ہوا تو شیریں نے اس کے آگے پھل لا کر رکھ دیئے تھے۔ شیریں رات کو دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی تھی، سلمان اپنی محسنہ کے ساتھ کسی قسم کے ہوسناک جذبے کو اپنے دل میں محسوس نہیں کر سکا۔ رات کو وہ کٹیا کے باہر سوئی۔ سلمان نے اس سے لاکھ کہا کہ تم اندر آ جاؤ۔ میں کٹیا کے باہر سو جاتا ہوں لیکن وہ نہیں مانی۔ اب صبح ہی صبح وہ ایک طرف خاموش بیٹھی اسے پھل کھاتے دیکھ رہی تھی، اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ وہ اب بھی اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔

ناشتے سے فراغت پا کر سلمان نے شیریں سے اجازت چاہی اور کٹیا سے باہر آیا تو وہ اس کے ساتھ تھی، اسے خود بھی شیریں سے دور ہوتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی قریبی عزیز چھوٹ رہا ہو۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ سلمان نے الوداعی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرانے لگی اور سلمان گردن جھکائے عجیب کیفیتوں میں اس سے رخصت ہو گیا۔

سلمان نے شیریں کو کریدنے کے لیے طرح طرح کی گفتگو کی تھی لیکن وہ اسے ایک حسین اور معصوم لڑکی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آ سکی۔ سلمان نے اس سے جانے کی اجازت بھی طلب کی تھی کہ اگر ظہری طبیزائی کے کہنے کے مطابق شیریں ہی وہ پراسرار قوت ہے جس نے اسے موت کے منہ سے نکالا تھا وہ یقیناً اسے روکنے کی کوشش ضرور کرے گی اور باور کرائے گی کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی طاقت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر جب اس نے سادگی سے جانے کی اجازت دے دی تو سلمان کا دل ٹوٹ گیا۔ سلمان دل پر جبر کر کے کٹیا سے باہر نکلا تھا۔ ہر چند کہ اس کی کوئی منزل نہیں تھی اور ان اندھیروں میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تاہم اس کی رفتار ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کل رات ظہری طبیزائی سے گفتگو کے بعد اب احساس شکست اتنا نہیں تھا جتنا پہلے تھا۔ یہ صبح کچھ زیادہ ہی بھلی لگ رہی تھی۔

آبادی کے قریب پہنچ کر سلمان نے سوچا کیوں نہ سحر کے پاس جاؤں اور اس کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لوں۔ سلمان نے غلط فہمی میں اسے سخت سست کہہ ڈالا تھا۔

سحر کے خیال سے دل کو کچھ سکون سا ملا۔ سلمان نے اپنی عجیب وغریب ہیئت کے باوجود طے کرلیا تھا کہ اسی وقت عمو جان کے گھر جائے گا۔ وہ جب اس کا یہ حلیہ دیکھیں گے تو حیران ہوں گے لیکن وہ کوئی بہانہ بنادے گا۔

سلمان نے اپنا رخ عمو جان کے گھر کی طرف موڑ دیا لیکن ابھی سلمان چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پشت سے کسی نے آواز دے کر پکارا۔ سلمان نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ بن فاتح کسی درندے کی طرح خوں خوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''اتنی تیز تیز کہاں جارہے ہو سلمان؟'' بن فاتح نے تلخی سے کہا۔ ''کیا سحر کے خیال نے تمہیں بے چین کردیا ہے؟ لیکن جانے سے پہلے میرا حساب تو چکتا کرتے جاؤ۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سلمان نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔ ظہری طبیزائی کی ملاقات نے اس کے حوصلوں کو توانائی بخش دی تھی۔ اس اعتماد میں کہ کوئی پراسرار قوت اس کی مدد پر کمربستہ ہے۔ بن فاتح سے خوف زدہ ہونا حماقت تھی۔

''میرا نام بن فاتح ہے۔ تم نے مجھے اب تک پہچانا نہیں ہے؟ میں نے تم جیسے کمینوں کو اس دنیا سے ختم کرنے کے لیے برسوں چلہ کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس کام میں گزارا ہے۔ میں نے تمہاری فاکیہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے چالیس دن کا مشکل ترین چلہ کیا ہے۔ لیکن یہ خوف ابھی بھی باقی ہے کہ وہ کسی بھی وقت تمہاری محبت کی قوت سے میرا سحر توڑ کر آزاد ہو جائے گی۔ اسی لیے میں اب تک تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' بن فاتح نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تم اب بھی اپنا وقت ضائع کررہے ہو! میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں، لیکن تم نے مجھے پہچاننے میں غلطی سے کام لیا ہے؟'' سلمان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ میں نے رات تمہارے سامنے اندھے کنویں میں چھلانگ لگادی تھی لیکن وہ کنواں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے آگے سے ہٹ جاؤ نہیں تو یہ ساری چلہ کشی خاک میں مل جائے گی۔''

''میں دیکھ چکا ہوں مال زادے، تو مجھے کیا سمجھاتا ہے؟ تُو کیا سمجھتا ہے' میں تیری اوقات نہیں جانتا۔'' بن فاتح گرج کر بولا۔ ''اس رات میرے موکلوں سے چوک ہوگئی۔ لیکن اب کوئی قوت تجھے میرے ہاتھوں سے نہیں بچاسکتی۔ یاد رکھ میں عاملوں کا استاد ہوں۔''

''سنو بن فاتح! تم اپنی بزدلی سے حصار میں چھپ کر جا بیٹھے' میں چپ رہا۔ تم نے

فاکیہ کو حاصل کرلیا، خاموش ہوں۔ تم نے شروع سے اب تک مجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے، میرے ساتھ زیادتیاں کیں اور میں تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکا لیکن اب شاید تمہیں کوئی سبق دینا پڑے۔ اپنی اوقات مت بھولو۔ تم حد سے گزر چکے ہو۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔'' سلمان نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بن فاتح پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

''اچھا!'' بن فاتح زہر خند لہجے سے بولا۔ ''کیا تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے؟''

''وقت کی قدر کرو بن فاتح اور پلٹ جاؤ۔ سلمان نے تمہیں معاف کیا۔ اگر مجھے جلال آ گیا تو تمہیں بھاگنے کا بھی راستہ نہیں ملے گا۔'' سلمان نے دل کڑا کر کے دبنگ لہجے میں کہا۔

بن فاتح مسکرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے تیور اچانک خطرناک ہوگئے۔ اس کی سرخ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ''کمینے موت سے پہلے تجھے کم از کم اتنی چھوٹ دے رہا ہوں کہ تو جو منہ میں آئے بک سکتا ہے۔ زبان ابھی بند ہوئی جاتی ہے۔ اپنا دل خوش کرلے۔'' بن فاتح کی آواز میں غصے کے سبب لرزش تھی۔ پھر اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ کوئی عمل کررہا تھا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ سلمان اسی ادھیڑبن میں تھا کہ بن فاتح نے عمل ختم کرکے اپنا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کیا مگر اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ وہ اپنا معلق ہاتھ جھٹکنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے چہرے پر شدید قسم کی الجھن نمودار ہوئی۔ ماتھے پر شکنیں پڑگئیں۔ پھر اس نے چونک کر سلمان کی پشت پر کسی چیز کو حیرت سے گھورنا شروع کردیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی غیر متوقع حادثے سے بوکھلا گیا ہو۔

اس کا اٹھا ہوا ہاتھ فضا میں جیسے جکڑ کر رہ گیا تھا۔ جس انداز سے اس کینہ پرور شخص بن فاتح نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا، سلمان کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس بار کوئی خطرناک اور آخری وار کررہا ہے۔ اس کے قدم زمین پر لرزنے لگے تھے کہ شیریں نمودار ہوئی۔ وہی شیریں جس نے اسے کنویں سے نکال کر نئی زندگی بخشی تھی۔ وہ بن فاتح کے سامنے سنجیدگی سے کھڑی اس کی کشمکش اور جنوں خیزیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اس وقت کوئی معصوم دوشیزہ کے روپ میں نہیں تھی۔

اس کے حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کا وجود بہت بھیانک ہوگیا تھا۔ وقت کی رفتار اس قدر مدھم پڑگئی تھی کہ سلمان کو اپنے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ شیریں کا اچانک وہاں نمودار ہوجانا کسی بڑے ہنگامے کا پیش خیمہ تھا۔ بن فاتح کا اٹھا ہوا ہاتھ شیریں کو دیکھ کر کیوں

رک گیا؟ سلمان اسی شش و پنج میں چند لمحے ساکت و جامد کھڑا اپنے دل کی دھڑکنیں شمار کرتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ خوب صورت لڑکی کوئی بڑی غلطی کر رہی ہے۔ شاید یہ بن فاتح سے واقف نہیں ہے۔ بن فاتح کے سامنے شیریں کا نرم و نازک بدن ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بن فاتح کا ایک اشارہ اس کے گرد موت کا جال بن سکتا ہے۔ یہ آگ کی نذر ہو سکتی ہے۔ بن فاتح کے موکل اسے لمحوں میں ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ سلمان کے لیے اس وقت زبردست ایثار کر رہی ہے اور شاید نہیں جانتی کہ وہ کس موذی کے سامنے کھڑی ہے۔ اس کا دل دکھنے لگا اور ضمیر نے ملامت کی کہ اس نے شیریں اور بن فاتح کے درمیان سے ہٹ کر بزدلی کا ثبوت دیا ہے۔ اسے خود بن فاتح سے نمٹنا چاہئے۔ اگر وہ زندہ رہا تو، تو شیریں کی قبل از وقت موت ہمیشہ اسے ملامت کے آنسو رلاتی رہے گی۔ اسے ہر قیمت پر بن فاتح کے شر سے بچانا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ بن فاتح کی آواز سے فضا کا سکوت متزلزل ہو گیا۔ وہ شیریں سے مخاطب تھا۔ ''تو یہاں اس وقت کیا کر رہی ہے؟''

شیریں نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ اس کے قہر و غضب کے انداز میں کوئی فرق آیا۔

بن فاتح جز بز سا ہوا اور پہلو بدل کر بولا۔ ''میں کیا پوچھتا ہوں' بتا؟ بتا تیری آنکھوں میں نفرت کیوں ہے۔ تو اس مال زادے کے لیے کیوں کوشش کر رہی ہے' یہ تو خود اپنی زندگی بچانے کے لیے میرے سامنے سے بھاگ رہا ہے؟''

بن فاتح کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا لیکن بے حد تلخ تھا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اب نیچے آ گیا تھا شیریں کے بدن نے ایک جھرجھری سی لی اور وہ پرسکون نظر آنے لگی۔ پھر اس کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ چھا گئی اور وہ نرم و دلکش لہجے میں بولی۔ ''آغائی! تم نے اس بے چارے کو پہلے بھی موت کے قریب کر دیا تھا۔ کیا بگاڑا ہے اس کمزور اور غریب نوجوان نے؟''

''کمزور اور غریب؟'' بن فاتح زہر خند لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تجھے اس بدبخت کی روداد سناؤں۔ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تو یہاں کیوں آئی ہے؟''

''ہاں!'' شیریں نے سادگی اور معصومیت سے کہا۔ ''میں سلمان کو جانتی ہوں۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔''

''ہاں، ہاں، حسین لڑکیاں سلمان کو سدا قریب سے دیکھتی ہیں۔'' بن فاتح نے طنز سے کہا۔ ''پر اب وقت گیا۔ کیا تو اسے میرے چنگل سے بچانے کے لیے آئی ہے؟ کیوں؟''

''ہاں! میں تم سے التجا کرنے آئی ہوں کہ تم اسے معاف کر دو۔'' شیریں نے انکسار سے کہا۔

''معافی اور اس کمینے کو؟'' بن فاتح گرج کر بولا۔ ''مگر تجھے یہ حق کس نے دیا کہ تو میرے سامنے اس جرأت سے آئی ہے؟''

''میرا نام شیریں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حالات نے سلمان کے ساتھ بڑا مذاق کیا ہے۔ پر جناب اس میں اس کا قصور کم ہے اور حالات کا زیادہ۔ یہ کوئی برا آدمی نہیں ہے۔ تم اسے معاف کر دو گے تو یہ تمہاری بڑائی ہو گی۔'' شیریں نے جسارت سے کہا۔

''مجھے تیرے حسین جسم اور تیری عمر پر رحم آتا ہے۔ اس گناہ کے پوٹ نے مجھے بہت دکھ دیئے ہیں۔ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو اس کا خیال چھوڑ دے۔ یہ بہت بڑا کمینہ ہے..... اس سرزمین کو ایسے لوگوں سے پاک کر دینا ہی بہتر ہے۔ جا تو اپنی راہ لے۔'' بن فاتح نے نخوت سے کہا۔

''آغائی، یہ ظلم ہے۔ کسی کے ساتھ ناانصافی کرنا بہتر نہیں ہے۔'' شیریں کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ ''اگر تم ماورائی قوتوں کے مالک ہو تو تمہیں سب کچھ بھول کر اسے معاف کر دینا چاہیے۔''

''میں اس کمینے کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا، ناممکن ہے۔'' بن فاتح نے غصے سے کہا۔ ''جا۔ میری نظروں سے دور ہو جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تیرے لیے بھی کوئی قدم اٹھانا پڑے۔ جا اپنے گھر جا کر آرام کر۔ تیرے استاد سے میں ڈرتا نہیں ہوں' بس تجھ پر رحم آ گیا اس لیے تجھے معاف کر رہا ہوں۔''

شیریں کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک نظر سلمان کی سمت ڈالی۔ پھر دوبارہ بن فاتح کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''جناب! میں اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک تم اسے معاف نہیں کر دو گے۔ میں زبان دیتی ہوں کہ یہ پھر کبھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔

''بے وقوف لڑکی!'' بن فاتح غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''تجھے شرم نہیں آتی؟ اس شخص کے پاس اب کیا رکھا ہے جو تو آس لگائے ہوئے ہے..... اسے تو کوئی اب بھیک دینا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

''شاید تم نے کبھی کسی سے پیار نہیں کیا۔'' شیریں نے بے باکی سے کہا۔

''شیریں! تو میرے سامنے اتنی ڈھٹائی سے باتیں کر رہی ہے۔ کیا مجھے بتانا پڑے گا کہ میں کیا ہوں؟'' بن فاتح نے تلملا کر کہا۔ ''میں تجھ سے آخری بار کہتا ہوں کہ مجھے ایک لڑکی پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور نہ کر۔''

''تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔'' شیریں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اب بہت ہو گیا۔'' بن فاتح کسمسا کر بولا۔ ''پھر مزید کچھ کہے بغیر اس کے قدم حرکت میں آ گئے۔ وہ خبیث شیریں کی سمت کسی خطرناک ارادے سے آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر رعونت اور غضب تھا۔ سلمان دخل دینا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم جواب دے گئے تھے۔ بن فاتح، ایک بڑا عالم، حصار میں پناہ لینا جانتا تھا اور فاکیہ کو بھی اپنے قبضہ میں کر چکا تھا اور جو پہلے ہی ایک بڑے عالم کی حیثیت سے خاصا مشہور تھا۔ سلمان کو وحشت ہو رہی تھی کہ اب شیریں کا انجام کیا ہو گا؟ یہ خوب صورت لڑکی جو میرے پیار میں اتنی بے باکی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ بن فاتح جیسے کمینے اور عیار شخص کی زد میں آ گئی ہے۔ وہ شیریں کو اپنی ایک جنبش لب سے تہس نہس کر سکتا ہے۔

اس کا دل چاہا کہ لپک کر بن فاتح سے الجھ پڑے لیکن سلمان اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سلمان اپنی جگہ سے ایک انچ بھی جنبش کرنے سے قاصر تھا سلمان نے شیریں کی جانب گھبرا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر بدستور معصومیت طاری تھی۔ ایک سکون تھا جسے سلمان اس کی نادانی پر محمول کر رہا تھا۔ بن فاتح لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے قریب پہنچ کر اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ جیسے کسی تیز رفتار گاڑی کو اچانک بریک لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی بن فاتح کے چہرے کے تاثرات حیرت انگیز طور پر بدل گئے۔ آنکھوں میں الجھن اور انداز میں جھنجلاہٹ نظر آنے لگی۔ وہ شیریں کو گھور کر دیکھنے لگا۔

''رک کیوں گئے؟'' شیریں نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کیا تم نے مجھے سزا دینے کا خیال اتنی جلدی دل سے نکال دیا؟''

بن فاتح نے اس طنزیہ جملے کے جواب میں غیر معمولی ردعمل کا اظہار کیا۔ اس نے بڑی بے چینی سے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے جیسے وہ خود کو کسی اور مصیبت سے نجات دلانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اور جیسے اسے کسی نے جکڑ لیا ہو۔

یہ نظارہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔ سلمان، شیریں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے ظہری طُہیزائی کا خیال آیا۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی اور طاقت اس کی پشت پناہی کر رہی

ہے۔ تو کیا وہ طاقت شیریں ہے؟ سلمان اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ شیریں نے بن فاتح کو مخاطب کیا۔ ''آغائی! تم نے میری التجا کو ٹھکرا دیا۔ بھول کی، کس نے کس کو غلط سمجھا، یہ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔ تم اس وقت کتنے مجبور نظر آ رہے ہو۔ حالانکہ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم بڑی قوت والے ہو۔ کہیں مجھے ختم کرنے کے لیے تو یہ انوکھا ناٹک نہیں رچا رہے؟''

''تو بہت پچھتائے گی۔'' بن فاتح تڑپ کر بولا۔ وہ عجیب مضحکہ خیز انداز میں اپنے جسم کو حرکت دے رہا تھا۔

''یہ بھی تمہاری بھول ہے! قوت صرف تمہارے ساتھ نہیں ہے، اوروں کو بھی حاصل ہے۔ دل کا کالا پن دور کرو بن فاتح!'' شیریں سرد آواز میں بولیں۔ اس کا لہجہ بہت بدل گیا تھا اور گمبھیر بھی ہو گیا تھا۔

بن فاتح نے جھلا کر جواب دینا چاہا لیکن وہ ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔ اس کی آواز نہیں نکل سکی۔ پھر سلمان نے اسے تیزی سے پلٹتے دیکھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی غمازی کر رہے تھے کہ اس وقت وہ شدید ذہنی الجھن اور کرب سے دوچار ہے۔ سلمان کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے پلٹ کر شیریں کی سمت نظر ڈالی لیکن وہ اسے قرب و جوار میں کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے اضطرابی کیفیت میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا لیکن نہ جانے وہ کس کھوہ میں غائب ہو گئی تھی اس کا شبہ اب یقین میں بدل گیا۔ اب شیریں کے بارے میں ساری باتیں خود بخود صاف ہو گئی تھیں۔ شیریں یقیناً وہی طاقت تھی جس کی نشاندہی ظہری نے کی تھی۔ اس خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور بے تحاشا پرانے قبرستان کی جانب دوڑنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شیریں کو اس کی کٹیا میں پالے گا۔ رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس نے شیریں کو معصومیت کا پیکر پایا تھا۔ اس کی زندگی میں ہلچل بھی اسی نے پیدا کیا تھا۔ اسے گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا اور زندگی کے دوراہے پر چھوڑ دیا۔ اس پر جو بھی افتاد پڑی اس کی وجہ بھی وہی تھا اس کے باوجود اس نے غیر معمولی مدد کی۔ آخر کیوں؟ اس بدنصیب کا اتنا بڑا ہمدرد کہاں سے پیدا ہو گیا؟

❁

سلمان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ بھاگنے کا گمان ہوتا تھا وہ جلد ہی پرانے قبرستان کی اس

جھونپڑی تک پہنچ گیا جہاں پہلی بار اس نے شیریں کو دیکھا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ وہ تیزی سے جھونپڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی، اس کے اندر ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی بو جو ایک عرصے تک ویران پڑے رہنے والے مکانوں میں ہوا کرتی ہے۔ شیریں کو میں کہاں تلاش کروں؟ وہ تو ایک چھلاوا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اس کا مسکن یہی جھونپڑی ہو، یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ مجھ سے کہاں ملے، کب ملے یا نہ ملے، اس لیے وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔''

سلمان نے اپنے دل کو سمجھایا۔ ''تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟ مگر میں اب کہاں جاؤں؟ عمو جان کے گھر جاتا ہوں تو اس حالت میں کون مجھے پہچانے گا؟ وہ سلمان جو ہمیشہ خوش پوش رہتا تھا اور جس نے تومان پانی کی طرح بہایا تھا، وہ اب ان پھٹے پرانے کپڑوں میں بڑھی ہوئی داڑھی اور شکستہ حالی کے ساتھ کیسے عمو جان کے گھر میں داخل ہوگا۔ نہ پاس میں کھانے کو کچھ تھا نہ کوئی شخص دور دور تک ہمدرد نظر آتا تھا۔

زندگی میں جب کوئی امید نہ ہو اور شب و روز مقصد سے عاری ہوں تو جسم میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ وہ نڈھال ہو کر قبرستان میں گر گیا۔ اب صرف ایک امید تھی کہ شیریں کو جب اس کا حال معلوم ہوگا تو وہ یقیناً اس طرف کا رخ کرے گی۔ طبیزائی بھی کسی لمحے آ سکتا ہے۔

پیروں نے آگے چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خود کو ایک نحیف و ناتواں شخص محسوس کر رہا تھا۔ عجب عجب حادثے پیش آ رہے تھے۔ ایک رات اس نے اسی قبرستان میں گزار دی اور اب بھوک نے بے حال کر رکھا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ بیدار ہو گیا تھا۔ اب مزید بھوکا رہنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ کھانے کی تلاش میں قبرستان سے نیم مردہ انداز میں اٹھا۔ کسی طرح اپنے پیٹ کا جہنم سرد کیا۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور وہ قبرستان کی جانب ہو لیا۔ جب وہاں پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ جھونپڑی میں اب بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ جب نامراد واپس جا رہا تھا تو قبرستان سے ہٹ کر ایک کھلی زمین پر اس نے ایک شخص کو منڈیر کے نزدیک آلتی پالتی مارے کسی عمل میں مگن دیکھا۔ وہ اسے کوئی شناسا چہرہ لگا۔ سلمان تیزی سے اس کی طرف گیا اور اگلے چند قدم چلنے کے بعد ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے پہچان لیا تھا وہ کوئی اور نہیں طبیزائی تھا جو آنکھیں بند کیے اپنے عمل میں بری طرح منہمک تھا۔ اس کے اردگرد چونے سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔

سلمان حیرت سے دور کھڑا اس کا انہماک دیکھتا رہا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنی

سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ طبیزائی نے اس کی چیخ و پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے نرم و گرم لہجے میں اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازیں دیں لیکن بے سود طبیزائی کے استغراق میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا پھر اس نے سوچا کہ قریب جا کر اسے جھنجھوڑ دے لیکن اس کی نظروں میں چونے کی لکیر کسی دیوار کی طرح پھر گئی۔ یہ عملیات کا کھیل، یہ زائچہ اور یہ پراسرار منظر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی کئی عاملوں کو عملیات و زائچہ میں بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر طبیزائی کسی عمل میں مصروف ہے تو زائچہ میں گھسنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے چنانچہ وہ آگے بڑھنے سے باز رہا، اور تھک کر زائچہ کے باہر بیٹھ گیا کہ شاید طبیزائی اپنا عمل ختم کر لے، شاید اس کی مدت بہت کم ہو ممکن ہو وہ شام تک عمل سے باہر آ جائے۔ یوں بھی وہ ظہری طبیزائی کی تلاش میں تھا۔

بہر حال اب یہی جگہ سب سے زیادہ عافیت کی تھی، وہ جھونپڑی کے قریب دھوپ میں آ کر لیٹ گیا۔ ان واقعات نے عقل خبط کر دی تھی، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، آخر ظہری طبیزائی کس قسم کے عمل میں مصروف ہے؟ شیریں کہیں طبیزائی ہی کا تو دوسرا روپ نہیں ہے؟ کوئی بھی بات ناممکن نہیں ہے۔ وہ طبیزائی سے حالات معلوم کرنے کے لیے بے حد مضطرب تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہی وہ کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ وہ رات گزر گئی پھر دوسرا دن گزر گیا پھر تیسرا دن گزر گیا۔ وہ کبھی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ کبھی زائچہ کے قریب بیٹھ کر ظہری طبیزائی کو تکنے لگتا کبھی کھانے کے لیے قبرستان سے باہر چلا جاتا اور گاؤں والوں سے مانگ کر چند روٹیاں زہر مار کر کے پھر واپس آ جاتا۔ عملیات کا خاتمہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چوتھے روز تنگ آ کر اس نے ایک فیصلہ کیا کہ مجھے اسی شکستہ حالی کے ساتھ عمو جان کے گھر چلنا چاہئے وہ گھر اب میرا بھی ہے اور اپنے گھر میں یہ جھجک کیسی؟ چنانچہ اس سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اس راستے ہو لیا جو عمو جان کے گھر جاتا تھا۔

تہران کی شناسا سڑکوں پر وہ کسی اجنبی کی طرح سر جھکائے چل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کوئی پہچان نہیں پائے گا۔ جب محلے کی گلیاں آئیں تو اس نے لوگوں سے کترا کر نکلنا چاہا مگر وہ حالات کے الجھے ہوئے تانے جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر الجھ جاتے تھے۔ جب اس گلی میں داخل ہوا جہاں عمو جان کا گھر تھا تو اس کے دل کا عجب عالم ہو گیا تھا۔ قدم

لڑکھڑانے لگے۔ جی چاہا کہ واپس ہو جائے۔ بدن پر میل کی تہہ جمی ہوئی تھی، سر اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہو گئے تھے جسم کے سارے کپڑے پھٹ رہے تھے اور بوسیدہ ہو گئے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر گزری ہوئی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ وہ ابھی گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ یکلخت اسے اپنے سر پر بھاری پن محسوس ہوا۔ وہی مانوس خوشبو جو فاکیہ کی آمد کا اعلان تھی، ہر طرف سے آنے لگی۔ اس نے گھر جانے کے بجائے اچانک واپس ہونے کا ارادہ کیا اور تیزی سے دوسری گلی میں چلا آیا پھر اس نے بے چینی سے عالم تصور میں اردگرد نظر ڈالی تو فاکیہ موجود تھی۔ اس کی نظروں میں بیگانگی اور بیزاری تھی۔ فاکیہ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل کو ہمیشہ گہرا صدمہ ہوتا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر اس سے پوچھا۔ ''اب کیا حکم دینے آئی ہو؟''

''سلمان!'' فاکیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے پہچانتے ہو میں کون ہوں؟''

''فاکیہ!'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دل پر نشتر مت چلاؤ صاف صاف بات کرو، کیا کہنا ہے؟''

''تم میری طاقت سے واقف ہو؟'' فاکیہ نے رعونت سے کہا۔

''میں تمہارے ہر روپ سے واقف ہوں، کاش تمہیں مرنا بھی آتا، کاش تم محسوس بھی کر سکتیں۔''

''باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے آقا بن فاتح کو بھی خوب جانتے ہو، وہ ایک بہت بڑا عامل ہے، اس سے ٹکرانے والے کا حشر بہت برا ہوتا ہے، تم کبھی بن فاتح کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔'' فاکیہ نے اجنبیت سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے مگر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''تم بن فاتح کی سزا سے بچ سکتے ہو لیکن ایک شرط پر۔'' فاکیہ نے درشتی سے کہا۔

''وہ کیا ہے؟'' سلمان نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''تمہیں مجھے شیریں کی حیثیت سے آگاہ کرنا ہوگا۔ مجھ سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ یہ بات تم جانتے ہو۔'' فاکیہ نے غضبناک آواز میں کہا۔ ''اگر زندگی عزیز ہے تو شیریں کی حیثیت اور اس کے ٹھکانے سے آگاہ کرو، ورنہ مجھے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے تمہارے خون سے اپنا وجود سیراب کرنا پڑے گا۔''

''خوب.....'' سلمان نے سنبھل کر کہا۔ ''جب تم سے کوئی بات نہیں چھپائی سکتی تو پھر تم

اپنی طاقت سے یہ کام کیوں نہیں کر لیتیں۔ تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔''

''سلمان طباطبائی!'' فاکیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ شیریں کون ہے؟ وقت ضائع مت کرو۔''

''میں نے کہہ دیا کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ لیکن فاکیہ کیا تمہاری پراسرار قوت شیریں کا راز معلوم کرنے میں ناکام ہو گئی ہے؟ کیا اس مردود عامل کی قوت بھی ختم ہو گئی کہ وہ شیریں کے سامنے بے بس ہو رہی ہے؟'' سلمان نے جرأت سے کہا۔ ''میری جان فاکیہ! اب تمہاری کوئی دھمکی کارگر نہیں ہوگی۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ مجھے تمہاری بے بسی سے پہلی بار بہت خوشی ہوئی۔ تم شیریں کو کبھی نہیں جان سکتیں کیونکہ اسے غیبی قوت حاصل ہے۔''

اب سلمان کے کچھ کہنے کا وقت تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فاکیہ مایوس ہو کر اس سے شیریں کا راز جاننے آئی ہے، اور وہ بالکل محفوظ ہے لیکن فاکیہ نے چلتے چلتے اپنے عمل سے اسے بے حال کر دیا۔ اس کے اعصاب متزلزل ہو گئے۔ ظاہر ہے اس کے پاس شیریں کا کوئی راز نہیں تھا اس لیے اس نے اپنی تمام تر کوشش کی کہ سلمان کو کسی طرح بے بس کر دے مگر اچانک وہ خود ہی خوفزدہ انداز میں بھاگ اٹھی۔

فاکیہ کے اس اچانک رویے پر سلمان کو بڑی حیرت ہوئی۔ ظہری طبیزائی کی ہر بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ کوئی پراسرار قوت سلمان کی پشت پناہ تھی۔ کوئی ایسی عظیم طاقت جس کے آگے فاکیہ کی شیطانی قوتیں بھی بے اثر ہو گئی تھیں بہرحال اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب کچھ دنوں کے لیے بن فاتح سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ یوں بھی فاکیہ کے آنے سے یہی ظاہر تھا کہ وہ اس کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں تھا کہ وہ اس سے انتقام لینے کے خیال سے اتنی آسانی سے دستبردار ہو گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ذلیل و ظالم شخص اپنے اتنے پرانے دشمن سے یوں سرسری گزر جاتا۔

اس آنکھ مچولی کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے تھے فاکیہ کو اس نے اسی غرض سے سلمان کے سر پر بھیجا تھا کہ وہ شیریں کی حقیقت دریافت کر سکے۔

وہ عمو جان کے مکان کی پچھلی گلی میں اس واقعے سے سہما کھڑا تھا اور اپنے ہوش و حواس درست کر رہا تھا پھر وہ کسی قدر حوصلے کے ساتھ عمو جان کے مکان والی گلی میں آیا اور مکان کے دروازے پر پہنچ کر دوبارہ رک گیا اسے اندر جاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی پتہ نہیں اسے اس حلیہ

میں دیکھ کر اس کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہوگا؟ وہ چند لمحے دروازے پر خود سے الجھتا رہا اور اپنے اندر ہمت پیدا کرتا رہا پھر اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ سحر نے دروازے کی آڑ سے اس کا چہرہ دیکھا پھر تیزی سے دروازہ بند کرلیا۔ وہ یقیناً اسے نہیں پہچانی تھی۔

''ٹھہرو!'' اندر سے اس کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

سلمان کے اندر کے غیرت مند انسان نے کہا کہ واپس چلو لیکن ذرا دیر بعد جب وہ واپس جانے نہ جانے کے تذبذب میں دروازے پر کھڑا تھا کہ سحر کا ہاتھ دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں نان اور اس پر گوشت کی بوٹی رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مجھے واقعی واپس چلے جانا چاہئے۔ اب اگر میں اندر گیا تو سحر شرمندگی سے آنکھ نہ اٹھا سکے گی۔ اس نے سحر کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے روٹی لے لی اور واپس ہونا چاہا، لیکن دروازے پر آ کر اور گھر کے اندر سے آنے والی مانوس آوازیں سن کر واپسی کے لیے قدم نہیں ہلے۔ وہ چلی گئی تھی۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ اس بار کسی اور لڑکی نے دروازہ کھولا اور اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اندر ہی سے بولی۔ ''اب کیا چاہئے؟''

''یہ میں ہوں سلمان۔''

''آپ..... آپ؟'' سحر ایک دم سامنے آ گئی۔ ''آپ۔''

اس نے حیران نظروں سے اسے دیکھا پھر جھٹ سے دروازہ کھولا اور ڈیوڑھی میں ہی وہ بے تابانہ اس کے کندھے سے لگ گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ سلمان اسے سنبھالا دیتے ہوئے اندر لے گیا۔ وہاں اس کی ماں موجود تھی۔ اس نے سراسیمگی کی نظروں سے اسے دیکھا کہ یہ کون پاگل سحر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے درّانہ گھر میں گھسا چلا آ رہا ہے۔ اس نے سحر کی ندامت دور کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے سر کو تھپکا تھا۔ عمو جان بھی آ گئے تھے۔ انہیں سلمان کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی اور پھر ان پر رقت طاری ہوگئی اور انہوں نے اس سے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ سلمان نے انہیں بتایا کہ میں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا اور یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سن لینا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ قوت گویائی جیسے سلب ہوگئی تھی، صرف آنسو بہہ رہے تھے، وہ اس سے لپٹے ہوئے تھے اور وہ انہیں دلاسے دے رہا تھا۔ ''اب میں آ گیا ہوں۔ برے دن گزر گئے۔ میرے امتحان کا وقت گزر گیا۔''

غرض یہ کہ سلمان کی واپسی پر گھر میں خوشیوں کا سیلاب امڈ آیا۔ سحر نے اسی وقت اس

کے غسل کا اہتمام کیا۔ اس نے نہا دھو کر حلیہ درست کیا اور شیو بنایا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کا جسم بے وزن ہو گیا ہے۔

دن بھر عمو جان اور سحر میں گھرا رہا اور انہیں اپنی خود ساختہ روداد سناتا رہا۔ دن میں انہوں نے طرح طرح کے پکوان بنائے۔ سحر نے کوئی دس بار اس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ اس نے اسے فقیر سمجھ کر روٹی دے دی تھی۔

رات دیر گئے تک وہ سب جاگتے رہے۔ سحر نے محسوس کرلیا تھا کہ سلمان نے عمو جان کو جو روداد سنائی ہے، وہ غلط ہے۔ چنانچہ اس نے اصلیت معلوم کرنے کے لیے ضد شروع کر دی۔ سلمان نے تھکن کا بہانا کر کے اسے ٹال دیا۔

چار روز تک سلمان نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ سحر نے ان چار دنوں میں متعدد بار اس سے واقعات معلوم کرنے کی خاطر اصرار کیا لیکن وہ اسے ٹالتا رہا مگر پانچویں دن جب سحر کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو اس نے شروع سے آخر تک تمام حالات سے اسے باخبر کر دیا۔ البتہ شیریں کا ذکر اس نے دانستہ درمیان میں نہیں لایا، سحر بڑی توجہ سے یہ الم ناک روداد سنتی رہی۔ یوں بھی وہ سلمان کے اندر مخفی قوتوں کے بارے میں جانتی تھی اسی لیے جب وہ خاموش ہوا تو بولی۔ ''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' سلمان نے مایوسی سے کہا۔ ''جب تک بن فاتح زندہ ہے، میری زندگی کو ہر لمحے خطرہ لاحق ہے۔ طبیزائی اگر عملیات میں مصروف نہ ہوتے تو میں ان سے کوئی مشورہ کرتا۔''

سحر اس کے حالات سن کر آبدیدہ ہوگئی، اسے فکرمند دیکھ کر خود سلمان کا دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ کچھ دیر خاموشی مسلط رہی، پھر سحر چونک کر بولی۔ ''ایک بات سمجھ میں آتی ہے، اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو تہران کے مضافاتی علاقے کے پہاڑیوں میں جا کر شیریں کو تلاش کریں۔ بابا طبیزائی نے اسے اپنی خاص شاگردہ بنایا تھا۔ پھر اسے ایک اور بڑے عامل نے سہارا دے دیا۔ اپنا پورا علم اسے سونپ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ شیریں آپ کی مدد ضرور کرے گی۔ بابا نے اسے بہت کچھ عطا کیا تھا۔''

''شیریں۔'' سلمان نے چونکتے ہوئے کہا۔ شیریں کا نام سن کر اسے خوشی بھی ہوئی اور خود پر غصہ بھی آیا کہ شیریں کو میں کتنی جلدی بھول گیا تھا، اس شیریں کو جس نے اس کی خاطر اپنا

گھر چھوڑا۔ جس نے ایسے وقت مدد کی تھی جب موت نزدیک تھی، جس نے قدم قدم پر سہارا دیا تھا اور بدترین مصائب میں بھی ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور وہ اسے بالکل ہی فراموش کر بیٹھا؟ شیریں کے نام سے دل کو ایک ڈھارس سی بندھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' سحر نے اسے سوچوں میں مستغرق دیکھ کر پوچھا پھر خود ہی بولی۔ ''میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شیریں نے بابا سے بہت کچھ پایا ہے۔ آپ اس سے ملیں، مجھے یقین ہے کہ دکھ کے دن بیت جائیں گے، ہوسکتا ہے کہ بن فاتح کے سلسلے میں شیریں کوئی راہ ڈھونڈ نکالے۔ یوں بھی وہ جس قبرستان میں رہ رہی ہے، وہ ایک محفوظ جگہ ہے، وہاں بن فاتح کے گندے موکل نہیں پہنچ سکتے۔''

سحر نے اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی تھی۔ اس کے بعد شیریں ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا ایثار، بن فاتح کے مقابل سلمان کو دیکھ کر اس کا اضطراب۔ اب یاد آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا کمینہ، خودغرض اور مادہ پرست شخص ہے کہ وہ اسے بھول گیا مگر نہیں، وہ اسے بھولا کب تھا، ہزار تلاش کے بعد بھی جب وہ نہیں ملی تب وہ قبرستان سے نکلا تھا۔

مصلہ کی پہاڑیوں تک پہنچنے میں سلمان کو کوئی دشواری نہیں ہوئی البتہ جب وہ اس خاص مقام تک پہنچ گیا جہاں شیریں کی جھونپڑی ہونا چاہیے تھی مگر کچھ آگے جاتے ہی وہ راستہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کئی روز تک وہ پہاڑوں پر بھٹکتا رہا۔ جس جگہ بھی جاتا، وہاں کوئی کٹیا نظر نہیں آتی تھی، کوئی جھرنا دکھائی نہیں دیتا تھا حالانکہ قبرستان وہی تھا۔ علاقہ بھی جانا پہچانا تھا مگر پھر بھی وہ پہاڑیوں پر بنے قبرستان کی بھول بھلیوں میں بار بار بھٹک جارہا تھا۔ اس جدوجہد میں یہ بھی گمان گزرا کہ کہیں شیریں نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہوگا کہ وہ علاقے کو پہچان نہ سکے مگر جگہ یہی ہو۔ یہی ویران مقام اور اب وہ اس ویرانی وتنہائی سے اکتا کر واپس نہ چلی گئی ہو۔

حالانکہ شیریں جیسی مستقل مزاج لڑکی سے اس بات کی امید نہیں تھی، لیکن دور دور تک اس کا نام ونشان نہ تھا۔ سلمان کی آس دم توڑ رہی تھی۔ شک اور وسوسوں میں یہ کرب ناک خیال آیا کہ ہوسکتا ہے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو، جتنے دن گزرتے جاتے تھے، امید کے دیے ٹمٹماتے جاتے تھے۔ دشوار گزار راستوں پر اس کا مسکن تلاش کرتے ہوئے اسے آٹھ روز گزر گئے لیکن اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نویں روز صبح کے وقت وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے

جھرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ جگہ اسے کچھ مانوس سی لگی۔ وہ درخت وغیرہ پار کر کے جھرنے کے قریب پہنچ گیا۔

اس میں کسی شبے کا امکان نہیں تھا کہ یہ وہی خوبصورت منظر تھا۔ مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اب اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد شیریں کی کٹیا بھی تلاش کر لے گا۔ اس نے غور سے قریب وجوار کا جائزہ لیا پھر ایک اندازے کے مطابق جھرنے کا راستہ چھوڑ کر قبروں کے درمیان سے اوپر کی جانب چڑھنے لگا۔ کچھ بلندی پر جانے کے بعد ایک لڑکی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پہاڑی سے نیچے جھرنے کی طرف آرہی تھی۔ فاصلہ چونکہ زیادہ تھا اس لیے وہ واضح طور پر اسے نہ دیکھ سکا البتہ دور ہی سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اسی علاقہ کی باسی ہے۔ اس کے بدن پر صرف ایک ایپرن نما مقامی لباس تھا۔ سلمان نے اس کے قریب پہنچنے کے لیے تیزی سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کٹیا اب تک آباد ہے تو یہ لڑکی ضرور میری رہنمائی کرے گی۔

منزل پانے کی خوشی نے دو روز کی تھکن کا احساس مٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں درمیانی فاصلہ کم ہوگیا لڑکی کبھی درختوں کی اوٹ میں ہو جاتی، کبھی بل کھاتے راستوں پر آجاتی اور وہ واضح طور پر سامنے آئی تو سلمان کو سکتہ سا ہوگیا۔ اس نے حیرت سے اپنی آنکھیں ملنی شروع کر دیں اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے خدوخال اور واضح ہوگئے تھے۔ سلمان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے اسے شناخت کر لیا۔ تہران سے اتنی دور اس ویران جنگل میں وہ سحر تھی۔ اسے یہاں دیکھ کر سلمان کا عالم کیا ہوا ہوگا؟ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت یا دھوکا یا مضطرب ذہن نے نگاہوں کی آسودگی کے لیے کوئی خیالی ہیولا تراش لیا ہے۔ وہ سو فیصد سحر تھی۔ کون سحر؟ وہ پری جمال لڑکی جس کے لیے سلمان کے دل میں بہت جگہ تھی۔ جس کے لیے اسے اذیت ناک مصائب سے دوچار ہونا پڑا، وہ سراپا تمکنت لڑکی بادبہاری کی طرح پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی۔ سلمان کے اوسان خطا ہوگئے اور دل بری طرح دھڑکنے لگا، اسے یہاں دیکھ کر اس کے اندر کچھ بے نام سے جذبے پیدا ہوئے، وہ جذبے جو صرف سحر کے لیے مخصوص تھے، اس کا ذہن صرف سحر کی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ وہ مصلہ کی پہاڑیوں میں آنے کا مقصد بھی بھول گیا۔ اس کی بے قرار نظریں سحر کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ سحر نے دانستہ اسے یہاں ویرانے میں بھیجا پھر خود ملنے آگئی۔

وہ سنبھل سنبھل کر بے خیالی میں نیچے اتر رہی تھی۔ ابھی تک اس نے سلمان کو نہیں دیکھا تھا پھر جب اس کی نظر سلمان پر پڑی تو وہ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئی، دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی سلمان کے قریب آئی اور اکھڑی اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان حیرت زدہ لہجے میں بولی۔ ''آپ..... آپ یہاں؟''

''اور تم..... تم یہاں کیسے؟'' سلمان نے تعجب سے دریافت کیا۔

وہ پٹ پٹاتی آنکھوں سے بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح یہاں پہنچی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس رات بن فاتح ہمارے گھر میں گھس آیا تھا۔ اس کو میں مطلوب تھی اور میں اپنی خواب گاہ میں غنودگی کی حالت میں تھی لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ان ویران پہاڑیوں پر پڑا پایا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی شاید میں اسے بیان نہ کر سکوں، بے شمار وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ آخر اسی سیاہ رات میں مجھے ایک عورت نے سہارا دیا۔ اس عورت نے جو ہماری اپنی نہ تھی مگر ہمیشہ سے ہمارے بہت قریب رہی۔ اب بھی جب میں اس دن کے واقعے پر غور کرتی ہوں تو یہ تمام باتیں مجھے خواب کی باتیں لگتی ہیں، آج تک میں اس راز کی تہہ نہ پا سکی کہ اتنی طویل بے ہوشی کی حالت میں میں کیسے زندہ رہی؟'' وہ ایک ہی سانس میں رقت بھرے لہجے میں بولی۔

''سحر! خدا نے تمہیں بچا لیا۔'' سلمان نے اس کی معصوم باتیں سنیں تو بے اختیار ہو کر اسے دلاسے دینے لگا۔

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''مگر آپ کو میرا پتا کیسے چلا؟''

''بعض باتیں بتائی نہیں جاتیں۔'' سلمان نے ہنس کر کہا۔ ''تم شاید اس بھول بھلیاں کو پہچان نہ سکی ہو۔ یہ کوئی اور علاقہ نہیں، تہران کا مضافاتی علاقہ ہے۔ وہی قبرستان جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔''

وہ سلمان کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب سلمان اسے پوری بات بتا چکا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلمان نے بڑی مشکلوں سے اسے دلاسا دیا۔

''قدرت نے مجھے جن حالات سے دوچار کیا، اسی میں بہتری ہے۔ اب میں تہران کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کروں گی۔ اس ویرانے میں بڑا سکون ہے، یہاں آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کھلی فضا کتنی دل کش اور حسین ہوتی ہے۔''

باتوں کی کوئی ایک سمت نہیں تھی۔ وہ شوق سے سلمان کا چہرہ دیکھتی اور اس کی باتیں

سنتی رہی اور وہ مسرت سے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی کہ اب سلمان اسے اپنے ساتھ ہی رکھے۔ جب دل کی ان کیفیات کا اظہار ہو چکا تو اسے کچھ ہوش آیا۔ سلمان نے اس سے پوچھا۔ ''تم رہ کہاں رہی ہو؟''

''یہاں سے کچھ فاصلے پر اوپر کی جانب ایک جھونپڑی ہے، جہاں میں اور وہ پاک باز عورت رہتی ہے جس نے مجھے اس ویرانے میں سہارا دیا تھا۔ پہاڑی کا یہ حصہ بالکل ویران رہتا ہے حالانکہ یہاں ہر جگہ سبزہ ہے، پانی ہے مگر کوئی ادھر نہیں پھٹکتا۔ صرف وہ عورت یہاں رہتی ہے اور اب اس کے ساتھ میں بھی ہوں، قدرت نے شاید اسے میری نگہداشت کے لیے مقرر کیا تھا۔'' سحر اس عورت سے اپنی وابستگی کا شدید اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک پاک باز عورت ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے عالمہ ہی نظر آئی۔ میں نے اس کے ساتھ یہ دن گزار کر زندہ رہنے کا سبق حاصل کیا ہے۔ وہ صبح و شام عبادت میں مصروف رہتی ہے۔'' سحر نے اس کا تذکرہ احترام اور اشتیاق سے کیا۔

''کیا وہ کوئی تارک الدنیا عورت ہے؟'' وہ شیریں کی موجودگی کا یقین کر لینا چاہتا تھا۔

''ہاں۔'' سحر نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اوپر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ ایک عظیم عورت ہے۔ اس سے مل کر آپ کو بھی خوشی ہوگی۔ آیئے میں اس سے آپ کو ملواتی ہوں۔''

اب بہت سے اسرار سلمان پر افشا ہو رہے تھے۔ شیریں کی عظمت کا خیال کر کے سلمان کے خون میں غیر معمولی جوش پیدا ہوا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بڑی بے چینی سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ شیریں ہی کی پراسرار قوت نے سحر کی مدد کی تھی، اس کے خیالوں کے زادیے پھیلتے اور سمٹتے رہے، اسے ایک طمانیت حاصل ہو رہی تھی کہ اب اسے شیریں کا قرب حاصل ہے۔ اس نے اس پہلو پر پہلے کیوں غور نہیں کیا تھا؟ اس کا اسے بہت افسوس تھا۔ بہر حال اب وہ شیریں کے پاس بے تابانہ جا رہا تھا۔ پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے دونوں اوپر کی جانب ایک مسطح حصے پر پہنچے۔ اوپر پہنچتے ہی سلمان کو وہ جھونپڑی دکھ گئی۔ اسے دیکھتے ہی سلمان کے قلب کی حالت غیر ہو گئی۔ یہ ساری جگہ اس کی جانی پہچانی تھی۔

''وہ سامنے رہا میرا خوبصورت گھر۔'' سحر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر چند کہ دو کمروں پر مشتمل اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں تہران کی پختہ حویلیاں جیسی شان و شوکت نہیں لیکن یہاں ایک سکون ہے، ٹھہراؤ ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں! تم نے نفس کی پاکیزگی کا عرفان حاصل کرلیا ہے۔ جو ترنم یہاں کے جھرنوں کے گرتے ہوئے پانی میں ہے، وہ تہران کی کثیف اور آلودہ فضاء میں کہاں؟ یہاں آ کر..... یہاں آ کر محسوس ہوا کہ شہروں کے لوگ اپنے اردگرد نمائش سجائے ہوئے ہیں اور اپنی ہی ان نمائش گاہوں میں مضطرب رہتے ہیں۔'' پھر سلمان نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے اس عورت کا نام نہیں بتایا۔''

''اس کا نام شیریں ہے۔ ہے نا خوبصورت نام؟'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے وہ سلمان سے کہہ رہی ہو' تمہیں بھیج کر میں رہ نہ سکی اور خود بھی آ گئی۔

''بہت خوبصورت یقیناً اس نے تمہاری نگہداشت میں کوئی کمی تو نہیں کی ہوگی۔ آخر کو تمہارے بابا کی شاگردہ جو ہے۔'' سلمان نے شوخی سے پوچھا۔

''وہ ہر اعتبار سے عظیم ہے، پہلے تو مجھے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے جھجک ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس کے دل میں بہت پاکیزگی بہت کشادگی ہے۔''

سلمان نے اثبات میں سر کو جنبش دی، وہ عجیب ذہنی کیفیتوں سے دوچار آگے بڑھا اور جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔ اس عورت کو دیکھتے ہی وہ پہچان گیا۔ وہ شیریں ہی تھی۔ جو مصلے پہ آنکھیں بند کیے ساکت و جامد حالت میں بیٹھی تھی۔ سلمان نے ایک عرصے بعد اسے دیکھا تھا اس لیے بے حد محبت سے اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ شیریں آج بھی نہایت حسین اور جاذب نظر تھی۔ بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ نکھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ تنفس کی شق سے سرخ ہو رہا تھا۔ سفید لباس میں وہ آسمان کی کوئی پری یا حور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے شعلہ رنگ بدن میں وہی پہلے جیسی برق سامانیاں تھیں۔ البتہ چہرے پر ایک تقدس اور جلال کی کیفیت تھی۔ یہ غالباً اس کی مسلسل ریاضت کا نتیجہ تھا، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑا شیریں کا چہرہ تکتا رہا۔ ماضی کی کتنی ہی یادیں ابھر کر ذہن کے پردے پر عریاں ہوئیں۔ سلمان نے عقیدت سے اسے دیکھا۔ شیریں کے چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ ابھر کر گہری ہونے لگی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر سلمان کی جانب نظر کی۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ سلمان کے دل نے کہا کہ اسے آگے بڑھ کر شکریہ کہہ دے لیکن سحر کی موجودگی کے باعث وہ ضبط کیے رہا۔ اسی لمحے اس نے ہونٹوں کو جنبش دی اور اس کی مترنم آواز سلمان کے کانوں میں رس گھول گئی۔ ''آؤ سلمان آؤ۔''

اس نے ایک نظر سحر پر ڈالی پھر آگے بڑھ کر شیریں کے قریب بیٹھ گیا۔

''باجی ان کو میں نے ہی آپ سے ملنے کو بھیجا تھا مگر آپ تو انہیں جانتی ہیں۔''

''بہت کچھ جانتی ہوں۔'' شیریں مشفیق لہجے میں بولی۔

''میں اپنی غلطی پر شرمسار ہوں باجی۔'' سحر نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کے پاس تو علم کا خزانہ ہے۔''

''انسان اگر غلطی نہ کرے تو فرشتہ ہو جاتا ہے۔'' شیریں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر سلمان کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ''آج ہماری کٹیا میں ایک مہمان کے قدم آئے ہیں۔ سحر! تم ان کی خاطر داری کرو۔ ان کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ جب تک میں ان سے باتیں کرتی ہوں۔

سحر الٹے قدموں باہر نکل گئی۔ اب کمرے میں شیریں اور سلمان تنہا رہ گئے۔ وہ مسکراتے ہوئے شیریں کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سلمان کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کی قدموں میں اپنا سر رکھ دے، لیکن ایک جھجک سی تھی، پھر بھی اس نے شدت جذبات میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''شیریں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے گفتگو کا آغاز کروں۔ تمہاری عظمت کے گیت گاؤں یا تمہیں پہلی جیسی شیریں سمجھوں۔ شاید تم مجھے بھولی نہ ہوگی۔''

''مجھ گنہگار کو شرمندہ نہ کرو۔ شیریں تمہارے لیے صرف شیریں ہے۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' شیریں نے مسکرا کر کہا۔

''میں تمہارا مجرم ہوں۔ تم سے معافی کا خواستگار ہوں کہ تمہیں غلط سمجھا۔'' سلمان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

شیریں معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اچھا.. تو کیا تم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے یہاں آئے ہو؟''

''نہیں! لیکن جب سے تمہارا نام ذہن میں آیا مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ ویسے تمہارے پاس آنے میں میری غرض کو دخل ہے۔'' سلمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

شیریں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے سب معلوم ہے۔ میں جانتی ہوں تم کس غرض سے آئے ہو، مجھے یہ خبر پہلے سے تھی تمہیں میرے پاس آنے کا مشورہ سحر نے دیا تھا۔'' شیریں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم حالات کے چنگل میں پھنس کر مجھے بھول

گئے لیکن یقین کرو۔ میں نے تمہیں ایک پل کو بھی فراموش نہیں کیا۔''

شیریں کا جواب سن کر سلمان کا چہرہ ندامت سے جھک گیا۔ اس نے گفتگو کا رخ بدل کر شیریں کو اپنی بپتا سنانی شروع کی لیکن وہ بھول گیا کہ شیریں کو سب کچھ معلوم ہے۔ بہر حال وہ خاموشی سے سلمان کی داستان سنتی رہی۔ اس طرح شاید وہ اس کا دل رکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو اس نے اپنے مخصوص، دھیمے اور شیریں لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے میں اس سے زیادہ جانتی ہوں۔ کیا سحر کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ میں تم سے کبھی غافل نہیں رہی؟''

''حیرت ہے۔ مجھے شبہ تک نہیں ہوا کہ تم نے اس کی مدد کی ہوگی، لیکن شیریں یہ کس طرح ممکن ہوا کہ سحر کو تہران سے یہاں تک لے آئیں اور کسی کو مطلق خبر نہ ہو سکی۔'' سلمان نے تعجب سے پوچھا۔

''ان چکروں میں نہ پڑو سلمان' مقام حاصل کرنے کے لیے من مارنا پڑتا ہے۔ مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ صرف طہیزائی کی مہربانی سے ہوا۔ میں نے ایک عامل کامل کی شاگردی کا شرف حاصل کر لیا۔'' شیریں نے محبت سے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن شیریں یہاں تمہارا دل تو اکتاتا ہوگا؟ باہر کی باتیں یاد تو آتی ہوں گی، کبھی کبھی من چنگیاں تو لیتا ہوگا۔'' سلمان اب اس سے کھل کر باتیں کر رہا تھا۔

''من ہمیشہ فریب کھاتا ہے، میں نے جو کچھ پایا ہے، وہ بہت بڑا انعام ہے۔'' شیریں اپنے لہجے میں چھپی ہوئی حسرت نہ چھپا سکی۔

سحر کے واپس آ جانے سے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سحر اس کے لیے ابلی ہوئی سبزیاں اور پھل لے کر آئی تھی۔ سلمان نے سیر ہو کر کھایا اور تینوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر سحر نے سلمان کو دوسرا کمرا دکھایا جہاں اس کا قیام تھا۔ یہاں پیال کے فرش کے سوا کوئی اور چیز نہیں تھی، اسے حیرت ہوئی کہ سحر جیسی لڑکی جو نرم و نازک بستروں کی عادی ہو، وہ کیسے اس کھردری زمین پر سو جاتی ہے۔ سلمان اس پیال پر دراز ہو گیا۔ سحر اس کے پاس بیٹھی ہوئی شیریں اور اس کی شفقتوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ شیریں کبھی اس کے لیے بہت اہم کردار ادا کر چکی ہے۔ سلمان دل ہی دل میں مسکرا کر ہوں ہاں کرتا رہا پھر سحر کے جانے کے بعد سو گیا کئی روز کی اس تھکن نے اسے خوب سلایا بہت دنوں بعد سلمان نے سکون کی ایک رات گزاری۔

دو روز پلک جھپکتے بیت گئے۔ سحر اور شیریں ہمہ وقت اس کی پذیرائی میں لگی رہتیں۔ سلمان سحر کے ساتھ دور جنگل میں نکل جاتا اور واپسی پر تینوں ساتھ مل کر کھانا کھاتے، شیریں کا زیادہ وقت عبادت میں صرف ہوتا۔ شیریں سے تنہائی میں بات کرنے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا تیسرے روز جب سحر پانی بھرنے جھرنے کی طرف گئی تو سلمان نے شیریں سے بن فاتح کا ذکر چھیڑ دیا۔ سلمان نے اسے بتایا کہ جب تک وہ منحوس عامل زندہ ہے میری زندگی تلخ رہے گی۔

شیریں نے اس کی باتیں سننے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ ''سلمان مجھے معلوم ہے کہ اس کے دل میں تمہاری طرف سے کتنا کھوٹ بھرا ہے اور اس کے خیالات کیا ہیں لیکن ہر بات وقت پر ٹھیک ہوتی ہے۔ وقت ابھی دور ہے۔ تمہیں انتظار کرنا ہوگا لیکن اگر تم نے ظہری طہیزائی کا کہنا مان لیا ہوتا تو اس وقت کے حالات کچھ اور ہوتے۔''

''غلطیاں تو زندگی بھر ہوتی رہی ہیں، یہ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟ سلمان نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''مایوس مت ہو سلمان! مجھے معلوم ہے کہ تم نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ تمہاری اور سحر کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ بن فاتح اپنی سزا کو پہنچے۔'' شیریں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا، ''تمہیں اتنا حواس باختہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔''

''شیریں! شاید تم یہ بات محسوس نہ کرو مگر سچ تو یہ ہے کہ جب سے فاکیہ گئی ہے میں ذہنی عدم توازن کا مریض ہو کر رہ گیا ہوں، فاکیہ میری ضرورت بن گئی ہے۔ اب میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتا ہوں، کیا تم میرے لیے ایک کام نہیں کر سکتیں، تم مجھے کسی طور پر فاکیہ واپس دلا دو۔ اگر کوئی ایسا سریع الاثر عمل شروع کر دو تو چالیس دن کے اندر تم فاکیہ کو حاصل کر سکتی ہو، تمہارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''فاکیہ سے بہت پیار ہے؟..... مگر فاکیہ تو بڑی ہرجائی ہے، وہ طوطا چشم ہے۔'' شیریں نے شوخی سے کہا۔

''ہاں، وہ ہرجائی ہے مگر وہ مجبور بھی تو ہے، وہ جس کی غلام ہو جاتی ہے، پھر اس کی ہو جاتی ہے۔'' سلمان نے کہا۔

''مگر سلمان! میں فاکیہ کے لیے عمل نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ میری نگاہیں اگر پابند ہو

جائیں تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ میں خود کو محصور کر کے اپنی ذمے داریوں سے کیسے کنارہ کشی کر لوں۔'' شیریں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آ رہی ہے، میرا خیال ہے کہ تم آج ہی فاکیہ کے حصول کے لیے عمل شروع کر سکتی ہو اور اس طرح بن فاتح کا غرور بھی توڑ سکتی ہو۔'' سلمان نے زور دے کر کہا۔

''اس وقت یہ ممکن نہیں ہے کہ فاکیہ تمہیں مل جائے۔ میں نے تم سے کہا کہ وقت سے پہلے بہت سی باتوں کے لیے مت اصرار کرو۔''

سلمان شیریں کے لہجے سے سہم سا گیا اور خاموش ہو گیا پھر کچھ دیر بعد سلمان نے خود ہی سکوت توڑا۔ ''فاکیہ کی موجودگی سے ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ اب میں خود کو خالی خالی محسوس کرتا ہوں۔ یہ فاکیہ ہی کا کرم تھا کہ اس نے مجھے تم سے ملوایا تھا۔ یاد ہے تمہیں؟''

''مجھے سب کچھ یاد ہے سلمان! ایسی باتیں بھول کون سکتا ہے۔'' شیریں جذباتی لہجے میں بولی۔ ''مگر وہ باتیں ایک خوبصورت خواب کے سوا اور کچھ نہیں تھیں۔ تم بھی وہ باتیں بھول جاؤ، میں نے اپنی ایک اور دنیا بنا لی ہے، اس دنیا سے میرا رشتہ صرف اتنا ہے کہ تم اس دنیا میں رہتے ہو۔ تم نے سحر کو ساتھی بنا لیا ہے، اب ان باتوں کی تکرار سے کیا حاصل؟''

❁

بیتی باتوں کا ذکر چل نکلا تو فضا بوجھل بوجھل سی ہو گئی۔ شیریں شاید ماضی میں کھو گئی تھی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پایا اور کہنے لگی۔ ''فکر نہ کرو، فاکیہ کسی نہ کسی صورت تمہارے پاس آ جائے گی۔''

شیریں کی اس یقین دہانی کا یقیناً کوئی مطلب تھا، سلمان سمجھ گیا کہ وہ اس سلسلے میں جلد ہی کوئی مثبت قدم اٹھائے گی پھر سلمان نے سحر کا ذکر چھیڑا تو شیریں بولی۔ ''تم اسے فاکیہ کا نعم البدل سمجھو قدرت نے شاید اسے تمہاری مدد کے لیے جنم دیا ہے۔ جب تمہارے دکھ کے دن بیت جائیں تو شاید سحر کا کام بھی ختم ہو جائے گا۔''

''مگر شیریں وہ وقت کب آئے گا جب بن فاتح کے عتاب سے مجھے نجات ملے گی۔ میں اب تھک چکا ہوں۔'' وہ کسی نہ کسی طرح بار بار بن فاتح کا ذکر درمیان میں لے آتا تھا۔

''عملیات کی کامیابی نے اسے مغرور بنا دیا ہے لیکن اسے ایک دن پچھتانا پڑے گا۔

حالات ضرور بدلیں گے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ اتنی جلد پلک جھپکتے ہی یہ تماشہ ختم ہو جائے، اگر ایسا ممکن ہوتا تو کیا شیریں تمہاری مدد سے گریز کرتی؟''

''آج کل وہ کہاں ہے۔'' سلمان نے دریافت کیا۔ ''تم سے آمنا سامنا ہونے کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ کہاں ہو سکتا ہے؟''

''وہ بدبخت میری حقیقت جاننے کے لیے پاگل ہو رہا ہے اسی لیے اس نے فاکیہ کو بھیجا تھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بن فاتح تمہاری قوتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔''

''نہیں..... تم غلط سمجھ رہے ہو، پراسرار قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ الجھنے سے گریز کرتی ہیں۔ میں نے اپنے متعلق احتیاط کر لی تھی کہ میری حیثیت بن فاتح کی نظروں سے روپوش رہے۔ اسی لیے فاکیہ اور بن فاتح دونوں میرے بارے میں لاعلم ہیں۔''

''تم اس کے لیے کوئی راہ ڈھونڈو نا۔''

''وقت آنے پر ایسا ہو جائے گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے کہ بن فاتح کی قوت کا ادراک ہو جائے؟''

شیریں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''میں اتنی ساری باتیں تمہیں نہیں بتا سکتی وقت آنے دو۔''

''صرف ایک بات اور، کیا فاکیہ مجھے دوبارہ پرانی حیثیت سے مل سکے گی۔''

''ہاں اگر تم پر کوئی بپتا نہ پڑی تو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گی۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ میں تم سے خود بھی کسی کام کے بغیر مل لیا کروں۔''

''کیوں؟'' شیریں نے تیزی سے پوچھا۔

''یوں ہی!'' سلمان نے شرارت سے کہا۔ ''تم بہت حسین جو ہو۔ دیکھنے اور باتیں کرنے کو دل تڑپتا ہے۔''

''اب ان شرارتوں سے باز آ جاؤ۔'' شیریں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دوسری عورتوں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو؟'' سلمان بدستور شوخی سے بولا۔ ''کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے میری کنیز بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔'' سلمان پچھلی باتوں کا اعادہ کرنا چاہتا تھا۔

''اس وقت مجھے اتنی سوجھ بوجھ کہاں تھی؟'' شیریں نے کسی قدر شرما کر کہا پھر ایسا لگا

جیسے اس کے اندر ایک بڑی تبدیلی آ گئی ہے جسے سلمان نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے رویئے میں تبدیلی لا دی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ اس کی کیفیت سے سلمان ادرنادم ہوا اور اس نے اپنے نرم لہجے میں کہا۔ ''آئندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔''

سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اس پر یہ کس قسم کا دورہ پڑا ہے، کیا اسے کسی کی روح نے سرزنش کی ہے، آخر کیا بات ہے سلمان نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں ہاتھ جوڑتا ہوں، میں نے بھول کی ہے۔ تم اس کے عوض جو چاہو سزا دے لو لیکن مجھ سے روٹھو نہیں، مجھے معاف کر دو، تمہیں سحر کی قسم۔''

اس کا یہ جملہ اثر کر گیا۔ شیریں نے سحر کا نام سن کر جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے لیکن اس کا چہرہ بدستور غضب ناک رہا۔ چند ثانیوں تک وہ خود سے الجھتی رہی اور سلمان کو گھورتی رہی۔ ابھی سلمان اس سے مزید کچھ کہنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بن فاتح کی بربادی کا وقت آ گیا ہے سلمان! میں تمہیں بتاؤں گی کہ اس کا انجام کتنا بھیانک اور عبرتناک ہوگا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گی کہ اس کی روح تک بے چین رہے گی۔''

شیریں کے منہ سے اس وقت بن فاتح کا نام سن کر سلمان کا ماتھا ٹھنکا۔ کوئی اندرونی خوف دل کو کچوکے لگانے لگا۔ سلمان نے شیریں سے پوچھا۔ ''تمہیں اس وقت وہ منحوس کیسے یاد آ گیا؟''

''سلمان! صرف چند لمحوں کی چوک ہوگئی۔ مجھے زندگی بھر اس کا قلق رہے گا۔ مجھے اپنے نفس کے فریب کی اچھی سزا ملی۔ شیریں نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ''ہماری بھول سے وہ فائدہ اٹھا گیا۔ ہم نے اسے موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنا وار کر سکے۔ میں اپنے ماضی میں چلی گئی تھی بس اسی کا وہ شدت سے منتظر تھا۔ وہ بدبخت اسی لمحے وار کر گیا۔ اس کے گندے موکل سحر کی تاک میں بیٹھے تھے۔ میری نظر اوجھل ہوئی تو انہوں نے اپنا کام کر دیا۔''

''کیا' شیریں کیا؟'' سلمان چیخ پڑا۔ شیریں کے آخری جملے کا مفہوم سمجھ کر اسے ایسا لگا کہ جیسے زمین پیروں تلے سے نکل گئی ہو۔ اسے سارا وجود لرزتا محسوس ہوا۔ ذہن میں بھونچال سا آ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرے لپک اٹھے۔ سلمان نے شیریں کو ایک ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو شیریں؟ کیا اس موذی شخص نے سحر کو.....؟

''ہاں سلمان! وہ ہماری غفلت سے اپنا وار کر گیا۔''

''سحر!'' سلمان نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور دیوانوں کی طرح اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ سحر کے مرنے کی اندوہناک اطلاع نے اس پر جنون طاری کر دیا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ اس ناقابل برداشت سانحے کی خبر نے اس کے دل و دماغ معطل کر دیے تھے۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ زندگی میں اب باقی کیا بچا تھا جو اس کے حواس برقرار رہتے، وہ پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ پتھروں پر الٹ گیا۔ نہ جانے وہ کسی چوٹ کا اثر تھا یا صبر کی قوتیں جواب دے گئی تھیں۔ حواس سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اسے مطلق علم نہیں کہ وہ کب ہوش میں آیا اور کس طرح عمو جان کے مکان پر پہنچا۔ جب آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سلمان نے خود کو عمو جان کے گھر میں سب کے درمیان گھرا ہوا دیکھا۔ ہوش آنے پر سلمان نے سحر کا نام لے کر چیخنا شروع کر دیا پھر اس پر دحشت کا دورہ پڑا تو وہ دوبارہ بے ہوش ہوگیا۔ ایک ہفتے تک اس کی یہی حالت رہی۔ گھر والے اس کی مخدوش حالت سے پریشان تھے اور طرح طرح کے حکیموں اور طبیبوں کو دکھا رہے تھے۔ وہ جب ہوش میں آتا گھر بھر کو قریب پاتا اور سب صبر کی تلقین کرتے تو زخم اور ہرے ہو جاتے۔ سحر کی یاد میں پہروں آنسو بہانے کے سوا اسے کام نہ تھا۔ وہ اپنی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کرتا کم تھا۔ کوئی دس بارہ روز بعد اس کی حالت کچھ سدھری۔

چلنے پھرنے کے قابل ہونے کے بعد سب سے پہلے عمو جان کے ہمراہ قبرستان گیا جہاں سحر دفن کی گئی تھی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد اس پر پھر گریہ طاری ہوگیا۔ سلمان نے قبر کا تعویذ پکڑ کر اس سے اپنا سر ٹکرانا شروع کر دیا اور چیخنے لگا۔ ''تمہارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ سحر، تمہارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔''

عمو جان نے اسے اپنے ناتواں جسم کے پورے زور سے ہٹانے کی کوشش کی تو سلمان نے انہیں بھی دھکا دے دیا۔ آخر بڑی مصیبت سے وہ سلمان کو گھر لانے میں کامیاب ہو سکے۔

تہران سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے واپس جانے کی ٹھانی، اب یہی ارادہ تھا کہ بن فاتح کو ختم کر کے اپنی زندگی کے آخری دن شیریں کی پہاڑی پر گزار دے۔ عمو جان نے روکنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ مگر آخر اس کی ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلمان

کو بھی ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس واپس آئے گا۔

گھر سے نکل کر وہ سیدھا اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔ تہران کی دیواریں، دکانیں، سڑکیں، مکانات۔ ان سب سے اسے نفرت ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سب کو مسمار کر دے۔ اسٹیشن کے قریب جب وہ تانگے سے اتر رہا تھا تو دفعتاً کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ آواز مانوس تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو طبیزائی اس کی پشت پر موجود تھا۔ اس کے چہرے کے اداس تاثرات دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ اسے حالات کا علم ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ طبیزائی نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! تیرے اوپر جو بیتی ہے مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں چلہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ سحر میرے دوست کی نشانی تھی۔ اس کا دکھ مجھے کم نہیں ہوا مگر یہ سب قسمت کے کھیل ہیں، تمہیں اب صبر و ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

چاروں جانب لوگ چل پھر رہے تھے۔ آجا رہے تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے طبیزائی کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

''جناب!'' اس نے طبیزائی کے لہجے کا تاثر محسوس کر کے کہا۔ ''اس کا قاتل تو میں ہوں۔ آپ چلہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف شیریں کو میں نے غافل کر دیا۔ اب میرے اندر صبر کا یارا نہیں ہے، مجھے اس کا خون چاہئے۔ اس کمینے نے پہلے مجھ کو اپنے ستم کا نشانہ بنایا، پھر فاکیہ کو جھپٹا اور اب سحر کو مار ڈالا۔''

''تیرے دل میں جو جوالا مکھی سلگ رہی ہے، میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ بن فاتح نے مجھے بھی للکارا ہے۔ میں تیری مدد کرنے پر تیار ہوں مگر تجھے ابھی انتظار کرنا ہوگا۔'' طبیزائی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''بن فاتح نے ہمزاد پر قابو کر لیا ہے۔ جب تک مدت پوری نہ ہو لے، ہم اسے مباذرت نہیں دے سکتے۔''

طبیزائی کی زبانی یہ احوال سن کر سلمان کا چہرہ لٹک گیا۔ شیریں نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ ابھی بن فاتح سے انتقام لینے کا وقت نہیں آیا ہے۔ گویا ابھی سحر کے قاتل کو ایک بڑی مدت تک کھلی چھٹی حاصل تھی۔ سلمان چند لمحے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''جناب! اگر وہ مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی دوبارہ جا چھپا تو کیا ہوگا۔''

''اس کی فکر مت کرو! اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ بن فاتح اب کسی مزار میں بھی نہیں چھپ سکے گا۔'' طبیزائی نے پر یقین لہجے میں کہا۔ ''اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس

عرصے میں وہ تمہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچائے گا۔''

وہ طبیزائی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے رہ رہ کر اپنی اس نادانی کا خیال آ رہا تھا جو اس نے شیریں کے ساتھ کی تھی۔

''جو کچھ بیت چکا اسے بھول جاؤ! حوصلہ والے بنو۔ اپنے اندر حوصلہ برقرار رکھو۔'' طبیزائی نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میری مانو تو سمندر پار کسی جگہ چلے جاؤ۔ وہاں تمہارا غم بھی غلط ہو جائے گا۔''

''اب میں غم غلط کر کے کیا کروں گا؟'' سلمان نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''زندگی سے مایوس ہونا گناہ ہے میرے بچے۔'' طبیزائی نے اسے پیار سے مخاطب کیا۔ ''کون جانے آج کے اندھیرے کل پھر روشنی میں بدل جائیں۔ تم نے پہلے میری بات مانی ہوتی تو آج یہ حالات نہ ہوتے۔''

طبیزائی دیر تک اسے نصیحتیں کرتا رہا۔ اس کے لہجے میں پہلی بار سلمان نے شفقت اور نرمی دیکھی تھی۔ سلمان روتا رہا اور وہ سمجھاتا رہا۔

سلمان نے سوچا کہ اس کا مشورہ نہ مان کر وہ اس حال کو پہنچا ہے۔ جب طبیزائی نے اسے دوسری بار ملک سے باہر جانے کا مشورہ دیا تو وہ انکار کی جرأت نہیں کر سکا۔ یوں بھی اس کے لیے سارے علاقے ایک جیسے تھے۔ آدمی کا دل دکھا ہوا ہو تو علاقوں کی تبدیلی کیا حیثیت رکھتی ہے؟ یہاں قدم قدم پر ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں۔ پھر اس نے بجھے دل سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو طبیزائی اسے مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ''تم نے میرا مان بڑھایا ہے۔ میں اس وقت تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔''

اس نے وضاحت طلب نظروں سے طبیزائی کی طرف دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پرسکون اور پروقار انداز میں مخاطب ہوا۔ ''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ جب تم شیریں کی تلاش میں اس کی کٹیا تک گئے تھے تو میں وہاں کس چلہ میں مگن تھا؟ میں نے بن فاتح سے فاکیہ کو چھین لیا ہے۔ میں تمہاری فاکیہ کو حاصل کرنے کے لیے چلہ کر رہا تھا۔''

''یا حضرت!'' سلمان نے وفورِ مسرت سے کہا۔ فاکیہ کا نام سن کر اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ اس نے طبیزائی سے پوچھنا چاہا کہ فاکیہ اب کہاں ہے؟ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل

کی بات زبان پر لاتا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فاکیہ واپس آ گئی ہے۔ اس نے داہنی جانب نظر اُٹھائی تو فاکیہ واقعی وہاں موجود تھی۔

''میں نے اسے بن فاتح سے چھین لیا ہے میرے بچے۔'' طبیز ائی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''اب کھلونا سنبھال کر رکھنا۔ یہ سحر کا غم بڑی حد تک دور کر دے گی۔''

سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس زبان سے اس کے احسان کا شکریہ ادا کرے۔ اس نے فاکیہ جیسی انمول طاقت اس طرح اس کی جھولی میں ڈال دی تھی جیسے وہ کوئی بہت معمولی چیز ہو اور اس نے شکر گزاری کے الفاظ ادا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ فوراً نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا اور سلمان اسے چہار سمت آواز دیتا رہ گیا۔

''وہ جا چکا ہے۔'' فاکیہ نے اس سے کہا۔ اس نے داہنی جانب نظر کی۔ وہاں فاکیہ بیٹھی ہوئی تھی۔

طبیز ائی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس نے چالیس روز تک ایک گٹھن چلہ کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور پھر فاکیہ جیسی پراسرار طاقت کو اس کی جھولی میں یوں ڈال دیا جیسے وہ اس کے لیے کوئی معمولی چیز ہو۔ یہ اتنا بڑا احسان تھا جس کی توقع اس نے کبھی طبیز ائی سے نہیں کی تھی۔ اس نے جب فاکیہ کو اپنے پاس محسوس کیا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اس محسن نے اسے شکریے کا موقع بھی تو نہیں دیا اور بڑی بے نیازی سے کہیں روپوش ہو گیا۔

زمانے کے جبر اور ستم کے اتنے مشکل دن گزارنے کے بعد فاکیہ پھر اس کی پاس آ گئی تھی۔ اس سے اس وقت باتیں کرتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ شکووں شکایتوں کا ایک دفتر تھا لیکن یہ پرانی بات ہو گئی تھی۔ فاکیہ کے چہرے پر سنجیدگی مسلط تھی۔ سلمان نے نگاہ اوپر اٹھا کر دیکھا تو اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ شرمندگی اور ندامت کا احساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی۔ پھر سلمان نے دھڑکتے ہوئے دل سے سکوت توڑا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''فاکیہ! کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اس قدر خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں دوبارہ میرے پاس آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟''

''سلمان!'' فاکیہ نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی دراز پلکوں کے گوشے نم تھے، اس کے

نرم و نازک ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کپکپا رہے تھے۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

سلمان نے اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں نہیں! مجھے احساس ہے کہ تم کتنی مجبور تھیں۔ تم حالات کی غلام ہو لیکن تمہاری جدائی نے مجھ پر کیا ستم توڑے، کیا ظلم ڈھائے، یہ داستان بہت دردناک اور طویل ہے۔''

''مجھے معلوم ہے سلمان! مجھے مت بتاؤ۔'' فاکیہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''کاش دوسروں کے سر پر جانے کے بعد میرے بس میں کچھ ہوتا۔''

''کتنے بڑے انقلابات آئے ہیں میری زندگی میں۔ سحر کی موت نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ وہ معصوم لڑکی خواہ مخواہ قربان ہو گئی۔ اس کا خون میری گردن پر ہے۔ آخر یہ ظالم بن فاتح میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔'' سلمان نے کرب سے کہا۔

''بن فاتح نے سحر کو اس وجہ سے ختم کیا ہے کہ وہ سمجھتا تھا طبیز ائی کی امان میں تم اسی وقت تک رہ سکتے ہو جب تک سحر زندہ ہے۔ طبیز ائی کی قوت کا مضحکہ اڑانے اور اسے خوف زدہ کرنے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا تھا۔ مگر سلمان! میرا یقین کرو کہ تم بن فاتح کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اس کا حشر تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ بھیانک ہو گا۔ کچھ دن کی بات اور ہے کیونکہ اس کے خلاف کئی قوتیں متحرک ہو چکی ہیں۔''

فاکیہ کی ہمدردی نے دل کا غبار کسی حد تک دور کر دیا۔ سلمان نے اس سے اپنے دل کا احوال ایک بچے کی طرح بیان کیا اور فاکیہ اسے تسلیاں دیتی رہی۔

طبیز ائی کا خیال درست تھا کہ فاکیہ سحر کا غم بڑی حد تک دور کر دے گی۔ وہ اسٹیشن کے قریب کھڑا دیر تک فاکیہ سے باتیں کرتا رہا۔ بھیڑ میں رہتے ہوئے بھی اکیلا رہا۔ وہ دونوں اس طرح ملے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز ہوں۔ گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں تک ہوئی۔ جب وہ سب کچھ کہہ سن چکا تو فاکیہ نے پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس وقت تم کہاں جا رہے ہو؟''

''کہاں جانا۔ تہران سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس شہر نے بڑے دکھ درد دیئے ہیں۔'' سلمان نے افسردگی سے کہا۔ ''یہاں کے گلی کوچوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس شہر کو آگ لگا دیتا۔ اب یہاں کے در و بام کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ ہر طرف سحر کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہوائیں قریب سے گزرتی ہیں تو سحر کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مجھے

طبیز ائی نے مشورہ دیا ہے کہ میں اس شہر سے دور چلا جاؤں۔ اس ملک سے دور، سمندر پار۔''

''تمہارے دل پر جو گزر رہی ہے اس کا مجھے احساس ہے، مگر میں تمہارے پاس آ چکی ہوں۔ تمہاری کنیز فاکیہ، تمہاری غلام فاکیہ، تمہاری محبوبہ فاکیہ۔ میری جان! اپنے دل سے تکدر دور کرو۔ میری طرف دیکھو۔'' فاکیہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ابھی تہران نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نہ معلوم کہ پھر کبھی یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ پھر اس شہر رنگ و بو کو تم کیا یاد کرو گے۔ اس وقت تم اپنے دوستوں کے درمیان رہو گے تو خوش رہو گے۔ یہاں سے زیادہ سکون تمہیں کہیں نہیں مل سکتا۔''

''مگر وہاں ہر وقت سحر کی یاد آتی رہتی ہے۔'' سلمان نے بے تابی سے کہا۔

''سلمان! سحر اب ایسی جگہ جا چکی ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا تمہیں اسے بھولنا ہوگا۔ اس کی عمر اتنی ہی تھی۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوا۔ تم اسے یاد کر کے اس کی روح کو مضطرب کرو گے۔ چلو گھر چلو۔'' فاکیہ نے اصرار کیا۔

''گھر؟ کس کا گھر فاکیہ۔ اب وہاں وحشت برستی ہے۔ میں جتنے دنوں وہاں رہا۔ کانٹوں پر لوٹتا رہا۔'' سلمان نے بے دلی سے کہا۔

''تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔ لیکن اس شہر نامراد کو اس طرح چھوڑ کر نہ جاؤ، تم اپنے وعدے بھی بھول گئے؟ تم اپنے اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو تو تم کہیں بھی سکون سے رہ سکو گے۔ جب تمہیں یہاں کے لوگ اور ان کے ستم یاد آئیں گے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ یہاں کے زخم تمہارے ساتھ رہے تو پھر تم بے چینی محسوس کرو گے۔''

سلمان فاکیہ کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کا جائزہ لے رہا تھا، اس کی سرخ آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ اس وقت شدید غصے اور رنج کی کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ اتنا مرجھایا ہوا تھا کہ فاکیہ کی باتوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔ وضاحت کی خاطر دریافت کیا۔ ''تمہارے کیا ارادے ہیں؟ کھل کر بات کرو۔''

''سلمان! میرے ارادے تمہارے ارادوں کے تابع ہیں، لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اس بار تم بالکل ٹوٹ چکے ہو۔ سحر کی اچانک موت کے صدمے نے تمہارے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ تمہاری توانائی، شوخی اور شرارت، سب کچھ رخصت ہو گئی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس طرح اداس نہ رہو۔ تم روحیہ خانم جیسی بدکردار عورت کو کس پر چھوڑے جا رہے ہو؟ تم ناظم زادہ کو کس طرح بھول گئے؟ تم نے اس کے سامنے کچھ وعدے کیے تھے۔ ناظم کے شب و روز وہی

ہیں۔ وہ اب بھی اپنی حویلی میں حسن و نشاط کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ کیا تم تہران سے یوں ہی چلے جاؤ گے؟ اپنے ان دشمنوں کو کھلی چھٹی دے کر..... بن فاتح بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ یاد ہے تمہیں، اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ یہاں سے جانا ہی ہے تو دل ٹھنڈا کر کے جاؤ۔'' فاکیہ نے سفاکی سے کہا۔

''فاکیہ! میں ان سب کا خون پینے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ ان باتوں سے کیا حاصل ہوگا؟ میرا سب سے بڑا دشمن بن فاتح زندہ ہے۔ اب میں تھک چکا ہوں۔ مجھے سکون چاہیے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''یہ بات میں تمہارے سکون کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔ سب کا حساب صاف کرتے جاؤ۔ یہ فرض اتار دو گے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو ہنگاموں کا عادی بناؤ۔ زندگی اس طرح نہیں گزرتی جس طرح تم سوچ رہے ہو۔''

''یہ مجھ سے ہونا مشکل ہے۔''

''خود کو سنبھالو ورنہ اس طرح بکھر جاؤ گے کہ سنبھالے نہیں سنبھلو گے۔ تمہیں یاد ہے، سرکس میں تمہاری دوستی مس آئی سے ہوئی تھی۔ وہ آئی جو زمانے پر بجلی گراتی تھی مگر تمہارے لیے اس نے جان قربان کر دیا۔ جس روز تم وہاں سے نکلے ہو اسی رات وہ اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے راسی سے کودنے میں دانستہ غلطی کی اور اوپر سے گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اگر تم وہاں ہوتے تو شاید وہ اس طرح جان نہ دیتی اور وہ سرکس بھی تمہارا ہوتا اس لیے کہ باپ کے بعد اس سرکس کی مالک وہی بنتی۔ تو وہ سرکس ہی بند ہو گیا اس لیے کہ باپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ کسی سے نہیں ملتا۔''

''یہ بڑی بری خبر سنائی۔ بہت اچھی لڑکی تھی وہ۔''

''بڑی کراری لڑکی تھی وہ۔'' فاکیہ نے کسی اوباش کی طرح کہا۔

''بری بات، کسی مری ہوئی لڑکی کے بارے میں ایسی بات نہیں کرتے۔''

''اگر تم اسی طرح مردہ لوگوں جیسا منہ بنائے رہو گے تو میں ایسا ہی کومنٹ کروں گی۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کیا سحر کے اصل قاتل کو چھوڑ دو گے؟''

''نہیں کبھی نہیں۔'' سلمان نے تقریباً چیخ کر کہا۔

فاکیہ نے کچھ اس انداز سے اس کی غیرت کو جھنجوڑا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ

گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ ماضی کی تلخ یادوں کے زخم پر فاکیہ کی باتوں کا نشتر اتنا کاری ثابت ہوا تھا کہ اس کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سحر کے مرنے کے بعد ایک بے مقصدیت سی طاری ہوگئی تھی۔ فاکیہ نے انتقام کا شعلہ بھڑکا کر اس کے سرد جذبات میں گرمی پیدا کر دی۔ اس کے سینے میں جلن سی ہونے لگی۔ اس نے پرانی باتیں یاد دلا دی تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔ زندگی کا کیا بھروسہ، کل بہت بے اعتبار چیز ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہیں۔ جو کل ہوگا ضروری نہیں کہ اس کا تعلق آج سے ہو۔ اب فاکیہ موجود ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو ٹھکانے لگاتے چلو جنہوں نے کبھی تمہارا جینا حرام کر دیا تھا۔

اصولاً اسے طبیزائی کے مشورے کے مطابق یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا لیکن وہ سوچنے لگا کہ کچھ دنوں کے قیام کے بعد بھی کہیں جایا جاسکتا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بیرون ملک روانگی سے پہلے کچھ اور انتظام کر لے۔ اس کی پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ کب تک رہتا؟ ختم ہو چکا تھا۔ عمو جان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ لیکن فاکیہ کی آمد کے بعد سارے مسئلے خود بخود حل ہو جانے تھے۔ فاکیہ سونے کی کوئی کان نہیں جس میں میں ہاتھ ڈال کر جتنا سونا چاہیں نکال لیں۔ روپے حاصل کرنے کے لیے فاکیہ کو فعال ہونا پڑتا تھا۔ اس نے ایک فیصلہ کیا اور جذبات انگیز لہجے میں فاکیہ سے بولا۔ ''فاکیہ! تمہارا خیال صحیح ہے کہ مجھے یہاں سے اس طرح نہیں جانا چاہیے۔ اب تم نے اس آگ کو ہوا دی ہے تو پھر یہ قصے نمٹا کر ہی کہیں چلیں گے مگر تمہیں فعال ہونا پڑے گا۔ میرے اخراجات کا مسئلہ بھی حل کرنا ہوگا۔''

''مجھے یقین تھا، تم میری بات رد نہیں کرو گے۔'' فاکیہ خوشی سے بولی۔ ''میرے علاوہ طبیزائی کا آشیرواد بھی تمہارے ساتھ ہے۔ جہاں جہاں تمہارے قدم پڑیں گے وہاں کی زمین خوف و دہشت سے تھرا جائے گی۔''

''طبیز ائی نے بڑا کرم کیا جو تمہیں حاصل کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں ان کا یہ احسان تا زندگی نہیں بھول سکتا۔ البتہ اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے روٹھ کر.....''

''اب ایسا ناممکن ہے میرے محبوب!'' فاکیہ نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''طبیز ائی کی روحانی قوت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ بہت بڑا عامل ہے۔ اس نے چلہ کر کے مجھے بن فاتح سے حاصل کیا اور پھر تمہیں بخش دیا۔ ایک بات یاد رکھو کہ مجھے حاصل کرنے کے لیے چلہ کرنے والا چلہ کرنے سے پہلے سے یہ اطمینان ضرور حاصل کر لیتا ہے کہ میں کس قوت کے

حامل کے پاس ہوں، اگر وہ عامل اس سے بڑھ کر ہے تو وہ ایسی حماقت نہیں کرتا۔ بن فاتح نے جب مجھے تمہارے پاس دیکھا تو آسانی سے چلہ شروع کر دیا اور مجھے حاصل کر لیا۔ بن فاتح سے ظہری طبیزائی یا اس کے برابر کوئی قوت ہی مجھے حاصل کر سکتی تھی۔ اب ظہری طبیزائی نے مجھے حاصل کر لیا ہے تو یہ بات آسان نہیں رہی، اس سے بڑی یا کم سے کم اس کے برابر کی روحانی قوت ہی میرے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ سمجھے!''

''سمجھا!'' سلمان نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''لیکن فاکیہ اب آرام سے گزر بسر ہو جائے تو ٹھیک ہے تقدیر کی ان گردشوں کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے..... کسی جگہ جا کر تو ہمیں ٹھہرنا پڑے گا، یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟''

''اطمینان رکھو۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے لیے یہی احساس کافی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔''

''نہ تمہیں میرے بغیر چین آتا ہے نہ مجھے تمہارے بغیر، تمہاری ذات، میری عدم موجودگی میں ادھوری ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میری تخلیق تمہاری وجہ سے ہوئی تھی۔''

فاکیہ کی باتیں اتنی جاں افزا اور پراسرار تھیں کہ سلمان نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ سحر کے گھر کی طرف واپس چل پڑا۔ اس ارادے میں بھی فاکیہ کے مشورے کا دخل تھا ورنہ وہ اسی لمحے ناظم زادہ کی حویلی کا رخ کرتا۔

عمو جان وغیرہ اس کی واپسی پر بے حد خوش ہوئے اور آؤ بھگت میں مصروف ہو گئے جیسے وہ بہت دنوں بعد آیا ہو۔ سلمان نے پھر اپنے لیے وہی کمرا منتخب کیا جس میں سحر نے اپنی زندگی کے سب سے دلکش دن گزارے تھے۔ در و دیوار میں سحر کے جسم کی مہک اور اس کے قہقہے رچے بسے تھے۔ بے اختیار اس کا دل بھر آیا اور وہ ہچکیوں میں رونے لگا۔ فاکیہ اسے تسلی اور دلاسے دیتی رہی جب حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تو رخسار اور دوسرے لوگ کمرے میں آ گئے۔ انہوں اسے سنبھالا دیا۔ سارا دن اسی اداسی میں گزر گیا، رات آ گئی سحر کی یاد دل سے نہ گئی۔ فاکیہ نے بہت باتوں میں لگایا۔ مگر اسے اپنا ہوش کہاں تھا، جب سلمان نے فاکیہ سے دریافت کیا کہ بن فاتح نے میری امنگیں کس طرح روندی تھیں تو فاکیہ ٹال گئی۔ اس کا اصرار حد سے بڑھا تو اس نے اداس لہجے میں بتایا۔

''سلمان شاید میں نے تمہیں یہاں لا کر غلطی کی ہے۔ تم اتنی آسانی سے سحر کو نہیں بھول

سکتے۔ مجھ سے مت پوچھو کہ بن فاتح نے کس طرح تمہاری خوشیوں کا گلا گھونٹا تھا اب یہ ذکر چھوڑو۔''

''نہیں مجھے یہ بتاؤ فاکیہ! کیا تم اس میں شریک تھیں؟'' سلمان نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

''میں اس وقت محض مجبور و بے بس تھی میرے محبوب! بن فاتح کسی چالاک چیتے کی طرح سحر کی گھات میں لگا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی روحانی قوت کے زور سے معلوم کر لیا تھا کہ کچھ پراسرار قوتوں نے سحر کے گرد حفاظتی جال بُن دیا ہے جسے توڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا جس روز سحر کو اس نے ظلم کا نشانہ بنایا، اس روز وہ صبح ہی سے بے چین تھا۔ وہ بار بار منتر پڑھتا اور پراسرار طاقتوں کو آواز دیتا تھا پھر اس کے موکلوں نے اسے یہ اطلاع دی کہ سحر کے گرد وہ پراسرار دھند چھٹ چکی ہے، اس نے فوراً اپنی کالی طاقتوں کی مدد سے ایسا بھرپور وار کیا کہ تمہاری خوشیوں کا چراغ پل بھر میں بجھ گیا۔''

فاکیہ کی زبانی ان حالات کی تفصیل سن کر سلمان کا دل تڑپ اٹھا، آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس عالم میں، سلمان نے فاکیہ کو مخاطب کیا۔ ''فاکیہ مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری حیثیت کیا تھا لیکن کیا سحر کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بناتے وقت تمہارے دل کو دھچکا نہیں لگا؟''

''سلمان!'' فاکیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ کمینہ بڑا چالاک اور عیار واقع ہوا ہے، سحر کے سلسلے میں اس نے میرے بجائے اپنے موکلوں سے کام لیا تھا اسے خدشہ تھا کہ شاید میں اس کے حکم کی تعمیل نہ کروں حالانکہ یہ اس کا وہم تھا، وہ مجھے جو بھی حکم دیتا، میرے لیے اس سے مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''یعنی تم سحر کو مار ڈالتیں؟'' سلمان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں مجھے ایسا کرنا پڑتا۔'' فاکیہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اف۔ تم اپنے محبوب کی امانت ختم کر دیتیں۔'' سلمان نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اور کیا کرتی؟ مگر اب ان باتوں سے کیا حاصل، سلمان! میری خاطر صبر کرو۔'' فاکیہ نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

سلمان فاکیہ کے مشورے پر دوبارہ عمو جان کے گھر آ تو گیا تھا مگر وہاں پہنچ کر بھی اسے سکون کا ایک پل نہ مل سکا۔ دن بھر خالی خالی سا ان کے درمیان رہتا۔ فاکیہ نے لاکھ اصرار کیا

کہ سلمان باہر نکلے لیکن سحر کے چالیسویں کے بعد ہی سلمان نے کہیں باہر جانے کے لیے سوچا، اس عرصے میں فاکیہ بھی مضمحل سی رہی، بار بار اسے سمجھاتی رہی، سلمان کے پاس روپے کی کمی تھی۔ جب تک گھر میں رہا، خاموش پڑا رہا، عمو جان کا کاروبار خاصا چل رہا تھا۔ مگر ان سے مانگتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ چالیسویں کے بعد سلمان باہر نکلا، تو فاکیہ نے دو تین ہی دن میں ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ روپے کی کمی نہ رہی۔ یہ فاکیہ کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ وہ سلمان کو آسودہ رکھنے کے لیے ایسے ایسے علاقوں میں لے گئی جہاں روپے کا الٹ پھیر ہوتا تھا۔ کیسینو کی خوب سیر کرائی۔ سلمان ہر بازی جیت لیتا۔ جب وہ رات کو لدا پھندا گھر واپس لوٹتا تو اسے روپے گننے میں زحمت ہوتی تھی۔ سلمان انہیں بے نیازی سے الماری میں ڈال دیتا۔ کسی بھی قمار خانے میں فاکیہ اور وہ جاتے۔ مگر لوگوں کو صرف وہی نظر آتا۔ وہ بازیاں لگاتا اور فاکیہ بورڈ پر ردوبدل کرتی۔ ہاتھ کے پتے بدلتی۔ لوگ اسے رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھتے اور وہ مسکراتا ہوا وہاں سے چلا آتا۔ حالانکہ اتنے حادثات کے بعد وہ بہت چڑچڑا اور بدمزاج ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر الجھ پڑتا۔ سارے انسان اسے ایک جیسے نظر آتے تھے، ظالم بے رحم اور درندے۔ صرف گھر کے لوگ اچھے لگتے تھے اور ان سے صرف رسمی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ روپے کی اتنی افراط کے بعد سلمان نے ایک ہفتے کے اندر اندر عمو جان کے لیے ایک خوبصورت علاقے میں جدید طرز کی ایک کوٹھی خرید دی۔ گھر پر چند ملازم بھی رکھے، مالی، باورچی، دربان، چھوٹے موٹے کام کرنے والے دو لڑکے ایک نوکرانی۔ اس ایک ہفتے وہ بہت مصروف رہا۔ نئے مکان کی خرید، فرنیچر کی ترتیب، ملازمین کا تقرر، ایک ہفتے بعد کوٹھی کا رنگ بدل گیا، سب کا مسرت سے برا حال تھا عمو جان خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور حیرت سے یہ انقلاب دیکھ رہے تھے اس کے علاوہ سلمان نے عمو جان کو ایک خاصی معقول رقم کاروبار میں اضافے کے لیے دی تاکہ وہ اس بڑی کوٹھی کا بار پوری طرح اٹھا سکیں۔ ان کاموں کے لیے اس نے اس لیے سوچا کہ یہ معرکہ اہم ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ پھر اسے اپنی ماں بہن اور زندگی کی حاصل، پہلا پیار تیریں کو بھی تلاش کرنا ہے۔ اس ہنگامے میں وہ ان سب کو بھول بیٹھا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ان کے لیے اتنا کچھ کر دیا تھا کہ اس کے بعد بھی یہ لوگ خوش رہیں اور پھلیں پھولیں۔

سلمان نے ایک صبح رفیعہ کی حویلی کی طرف جانے کا ارادہ کیا لیکن فاکیہ نے مشورہ دیا کہ اسے اپنے انتقام کی ابتدا ناظم زادہ سے کرنی چاہیے۔ سلمان کو اس بات سے کوئی فرق نہیں

پڑتا کہ پہلے ناظم زادہ کو بھگتایا جائے یا رفیعی کو مگر فاکیہ ایک منصوبے کے تحت ایسا سوچ رہی تھی۔ اس کے کہنے پر اس دن صبح ہی صبح سلمان نے تھوڑا سا ناشتہ کیا اور کپڑے تبدیل کر کے مکان سے باہر آ گیا۔

جس وقت سلمان سر باز خانہ (کوتوالی) میں واقع ناظم زادہ کے دفتر پہنچا، اس وقت وہ کسی فائل کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس کے دفتر کے باہر کھڑے سنتری نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن فاکیہ نے سنتری کو بے بس کر دیا اور سلمان کسی مزاحمت کے بغیر اندر چلا گیا۔

ناظم زادہ خواب میں بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ سلمان اس انداز میں سینہ تانے اس کے سامنے پہنچ جائے گا۔ چنانچہ خلاف توقع اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے نفرت بھری نظروں سے سرتاپا گھور کر رعونت سے بولا۔ ''تم یہاں کس لیے آئے ہو؟''

''ناظم زادہ! مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے جلد شناخت کر لیا، مجھے اپنا تعارف کرانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔'' سلمان زہر خند سے بولا۔

ناظم زادہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، کرخت لہجے میں بولا۔ ''تمہیں میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ دفع ہو جاؤ گٹ آؤٹ۔''

''وقت وقت کا کھیل ہے ناظم زادہ! وہ وقت گزر گیا۔ اب تمہاری گرفت کا وقت ہے۔ میں تمہارے لیے قہر بن کر آیا ہوں، میں نے معاف کرنا نہیں سیکھا ہے، تمہاری بدقسمتی سے میری یادداشت بہت تیز ہے۔'' سلمان نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''تم نے میرے آنے کا مقصد پوچھا ہے سنو، تم نے اپنی طاقت اور عہدے کے نشے میں میری عزت و ناموس پر نگاہ اٹھائی تھی میں قید و بند کی مشقتیں جھیل کر اب پھر تمہارے روبرو ہوں۔ اس زعم میں نہ رہنا کہ تم اس وقت مجھ پر حاوی ہو گئے تھے۔ تم نے مجھے بے بس دیکھ کر ظلم و ستم توڑے تھے۔ میں تہران سے جا رہا تھا مگر پھر خیال آیا کہ تمہارا حساب بے باق کیے بغیر تہران سے چلا جاؤں گا تو تمہیں شکایت ہو گی۔''

ناظم زادہ نے سلمان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خطرے کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا۔ ایک پل کے لیے اس نے اسے گھورا پھر بڑی پھرتی سے اپنا سروس ریوالور نکال کر سلمان کے سینے کا نشانہ لے کر بولا۔ ''تم نے اچھا کیا کہ خود ہی میرے پاس آ گئے۔ تمہیں تلاش کرنے کی زحمت مجھے نہیں اٹھانا پڑی۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں جیل کی آب و ہوا راس آ گئی ہے، یوں بھی تم جیسے

خطرناک مجرموں اور شورہ پشت غنڈوں کو باہر کھلی ہوا میں زیادہ دن نہیں رہنا چاہئے۔''

سلمان کے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ فاکیہ بھی اسی لمحے تیزی سے رینگ گئی۔ سلمان سمجھ گیا کہ اب ناظم زادہ کا برا وقت آ گیا ہے۔ سلمان ناظم زادہ کے اور قریب گیا اور زور سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا، ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔ ناظم زادہ کو کونے میں پڑا ہوا ریوالور اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ سلمان کے بلاوے پر دوسرے ہی لمحے فاکیہ دوبارہ آ گئی۔ سلمان نے اسے دل ہی دل میں سمجھایا کہ میں کچھ دیر کے لیے خود ہی ناظم زادہ سے زور آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ فاکیہ جز بز ہو کر خاموش ہو گئی۔ سلمان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زناٹے دار تھپڑ ناظم زادہ کے گال پر رسید کر دیا۔ ناظم زادہ کو اس اچانک حملے کی توقع نہ تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ اسکے ہاتھ پاؤں چلانے سے پہلے سلمان نے ایک اور زوردار طمانچہ رسید کیا جس سے خون کی ایک باریک لکیر اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ''کرسی پر بیٹھ جاؤ، ناظم زادہ زیادہ تیزی دکھانے کی کوشش مت کرو۔'' سلمان نے رعونت سے کہا۔ ''تمہارا برا وقت آ چکا ہے۔''

ناظم زادہ فوراً کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا منہ رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ بھی اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ سلمان نے اپنے لہجے کی کاٹ قائم رکھی۔ ''ناظم زادہ! ایک بار تم نے مجھ پر ظلم کی انتہا کر دی تھی مجھے سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا مگر میں اتنا ظالم نہیں ہوں میں تمہیں وقت دیتا ہوں، اگر تم اپنے عزیز و اقارب کے لیے کوئی آخری پیغام دینا چاہو تو دے سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا یہ پیغام مطلوبہ شخص کو پہنچا دیا جائے گا۔ مگر جلدی کرو مجھے تہران سے جلدی جانا ہے۔ ابھی مجھے تمہاری والدہ روحیہ اور تمہارے باپ رفیعی سے بھی ملنا ہے۔''

ناظم زادہ جو چند لمحے پہلے بڑا خونخوار نظر آ رہا تھا، اچانک ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت کے آثار جھلک رہے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت پل بھر میں ہلدی کی مانند زرد پڑ گئی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے سلمان کی طرف دیکھا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سلمان! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تم پر ظلم کیا ہے لیکن خدا گواہ ہے اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اوپر سے مجھے احکام ہی ایسے ملے تھے۔''

''اوپر کے احکام؟ فضول باتوں سے پرہیز کرو ناظم زادہ! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، تم اپنی آخری خواہش کا اظہار کرو۔'' سلمان نے حقارت سے جواب دیا۔

ناظم زادہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کے چہرے پر موت کے سائے لرزنے لگے۔ اس

نے ایک نظر ریوالور کی طرف دیکھا، اسے اٹھانے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ اس نے دروازے کی طرف نگاہ ڈالی تو سلمان نے ہنس کر کہا۔ ''اب کوئی تمہارے کام نہیں آ سکتا۔''

''مجھے معاف کر دو سلمان!'' اچانک وہ گڑگڑانے لگا۔ ''میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔''

''رحم اور آپ پر ناظم زادہ صاحب! آپ جیسے بڑے عہدے دار پر؟'' سلمان نے نفرت سے کہا۔ ''وہ عیاری کے دن یاد ہیں، وہ ظلم یاد ہیں جو تم نے مظلوم اور معصوم لوگوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔''

ناظم زادہ کے چہرے کا رنگ ہر لمحے بدل رہا تھا۔ سلمان اس کی حالت سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سلمان نے اس ظالم و جابر شخص کی رحم طلب نظروں کا پیغام سختی سے ٹھکرا دیا۔ ایک اٹل ارادے سے اٹھا اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''میں جا رہا ہوں ناظم زادہ زیادہ باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں خودکشی کرنا ہوگی اور میں چاہتا ہوں کہ تمہاری خودکشی کے گواہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں۔ حالات نے مجھے محتاط رہنے کا درس دیا ہے۔''

سلمان اتنا کہہ کر تیزی سے نکل گیا۔ اسے قوی امید تھی کہ فاکیہ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا ہوگا۔

سلمان تھانے سے نکل کر سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور ہجوم میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ سلمان نے ناظم زادہ کو تھانے کی عمارت سے پریشان، گریباں چاک، حواس باختہ باہر نکلتے دیکھا۔ سروس ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے دو آژان (پولیس والے) بھی تھے جو غالباً اس کی مجنونانہ حالت سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے آ گئے تھے۔

سڑک پر آ کر ناظم زادہ نے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا اور اپنے جرائم کا اعتراف اپنے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کے سامنے کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''لوگو۔ میں خود کو ختم کر رہا ہوں۔ میں نے متعدد بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں، میں ایک مجرم ہوں، میرا نامہ عمال سیاہ ہے، لاوارث بچوں کی کراہوں، معصوم لڑکیوں کی آہوں اور بے سہارا عورتوں کی فریادوں نے آج مجھے دیوانہ کر دیا ہے، میں تمہارے سامنے

اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں، سلمان نے اپنے لیے سزا تجویز کر لی ہے، میں مر رہا ہوں، دیکھو..... یارو میں مر رہا ہوں تم گواہ رہنا دوستو! میں اپنے ضمیر کا فیصلہ تسلیم کرتا ہوں۔''

راہ گیروں کی اچھی خاصی تعداد ہکا بکا کھڑی سراسیمہ نظروں سے ناظم اعلیٰ زادہ کو گھور رہی تھی، دونوں آژان (پولیس والے) بھی دم بخود کھڑے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی حالات کا اندازہ کر سکتا، ناظم اعلیٰ زادہ نے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھی اور لبلبی دبا دی۔ فضا میں ایک دھماکے کی آواز گونجی اور ناظم اعلیٰ زادہ خون میں لت پت ہو کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک اس کی لاش تڑپتی رہی۔ ناظم کیفر کردار کو پہنچ گیا تھا۔ سلمان کو اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوا بلکہ ایک سکون سا محسوس ہوا، سلمان کو بے حس کہہ کر یاد کرنے والے حضرات اتنا ضرور سوچیں کہ شدید ظلم و تشدد سہنے کے بعد ایک ایسی منزل بھی آتی ہے جب انسان اتنا ہی بے حس ہو جاتا ہے۔

چند لمحوں میں فاکیہ بھی آ گئی۔ آتے ہی بولی۔ ''مجھے خوشی ہے سلمان کہ تم نے اس بار دور اندیشی سے کام لیا۔'' پھر فاکیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم تھانے کے اندر کوئی جذباتی قدم اٹھاتے تو حالات مختلف ہوتے۔ اب ناظم زادہ کے سلسلے میں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

❁

سلمان بے خبر سو رہا تھا کہ یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ کسی نے اسے جھنجوڑا ہے۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ وہ رخسار تھی۔ اسی نے اٹھا دیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' سلمان نے یہ کہتے کہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

رخسار نے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

''مجھ سے؟'' سلمان حیرت میں پڑ گیا تھا۔ ایسا کون ہے جو مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اس نے سوالیا نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت رخسار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

''آپ چلیے تو صحیح۔'' اس نے تقریباً دھکا دے کر کہا۔ سلمان اس کے ساتھ باہر والے کمرے کی طرف چل پڑا۔ نشست گاہ میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بیٹھی تھیں۔ جن کے ساتھ ایک حسین لڑکی بھی تھی۔ خاتون کا پروقار چہرہ، کشادہ پیشانی اور چہرے پر تقدس، بڑا پرنور چہرہ تھا۔ ایسے پرتقدس و پرنور چہرے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے چہرے جنہیں دیکھ کر ان کی تعظیم کو

دل آمادہ ہو جائے۔

''السلام علیکم آغائی سلمان!'' خاتون نے باقاعدہ مہذب روایتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! تشریف رکھیے ہمشیرہ!'' سلمان نے جواباً کہا۔

''بیٹی! تم نے سلام نہیں کیا؟'' خاتون نے دوشیزہ کو سرزنش کے انداز میں مخاطب کیا۔

''السلام علیکم!'' لڑکی نے پیشانی کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے سلام کیا۔

''جیتی رہیے'' سلمان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ پھر اس نے پوچھا ''یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

''جی نہیں'' خاتون نے جواب دیا ''یہ میری عروس زن (بہو) ہے لیکن میں اسے بیٹیوں ہی کی طرح چاہتی ہوں۔'' خاتون کے لہجے میں جو پیار تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہیں۔ وہ واقعی اسے بیٹی کی طرح چاہتی ہوں گی۔

''کہیے خاتون! آپ نے کیسے تکلیف کی؟'' سلمان نے مہذب انداز میں پوچھا دراصل وہ الجھن میں تھا کہ یہ کون ہیں اور مجھ سے ملنے کیوں آئیں ہیں۔

''رخسار میری عروس کی سہیلی ہے۔ اسی نے زور دیا کہ آپ سے مل لیا جائے!''

''خانم!'' سلمان نے انہیں ٹوکا ''رخسار نے ایسا کیا کہا کہ آپ مجھ سے ملنے چلی آئیں۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان کر دیں۔ کیوں کہ میں کچھ تھکا ہوا ہوں، آرام کر رہا تھا کہ یہ اٹھا لائی۔'' اس سے پہلے کہ ان کے جوشِ حُسنِ ذوق پر مزید ابال آ جائے سلمان نے ان کی توجہ ان کے یہاں آنے کے مقصد کی طرف مبذول کی۔

''اوہ..... ہاں'' انہوں نے ایک دم اپنے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا اور بولیں ''یہ میری عروس ہے!'' انہوں نے دوبارہ تعارف کرایا ''اور میں اسی کے سلسلے میں آپ کے پاس بڑی آس لے کر آئی ہوں۔'' انہوں نے بڑی بے چارگی کے انداز میں کہا ''یہ میری منجھلی عروس ہے اس کی شادی کو پانچ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ایک عجیب مسلہ ہے اسی سلسلہ میں آئی ہوں۔ حالانکہ میری دو عروسیں اور بھی ہیں۔ بڑی اور چھوٹی مگر خدا کا شکر ہے کہ دونوں کے ساتھ کبھی کوئی مسلہ پیش نہیں آیا۔ یہ میری بھتیجی بھی ہے اس لیے مجھے اس کی زیادہ فکر ہے۔''

''اگر کھل کر بتائیں تو زیادہ بہتر ہے!'' سلمان نے ان کی منشا نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ.....'' خاتون ذرا جھجکیں۔

''جی..... جی! میں سن رہا ہوں۔'' سلمان نے کہا۔

''اس کا شوہر..... یعنی میرا منجھلا بیٹا۔ عقیل نجیبی.....! اسے اولاد کی بڑی تمنا ہے۔ اس اللہ نے اسے بیٹا دیا بھی ہے مگر ان دنوں اس کر پیچھے ایک مصیبت لگ گئی ہے۔ میں اسی لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ اس کے لیے اللہ کی بارگاہ میں دعا کر دیجئے۔''

''آمین! مگر میں نہ تو کوئی ولی کامل ہوں اور نہ میں کوئی عامل۔''

''بات یہ ہے کہ ہر صاحب کمال خود کو مخفی رکھتا ہے۔ رخسار نے بتا دیا ہے کہ آپ بہت بڑے عامل ہیں اور خود کو ظاہر نہیں کرتے۔ آپ میری مدد ضرور کریں۔''

''آپ کی عروس کا نام کیا ہے؟'' سلمان سمجھ گیا تھا کہ یہ رخسار کی شرارت ہے مگر وہ اسے ناامید لوٹانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے پوچھا۔

''سیدہ زریں نجیبی۔'' خاتون نے جواب دیا۔

''اور ان کی والدہ کا نام.....؟'' سلمان نے سوچ لیا تھا کہ رخسار کی دل لگی کو حقیقت میں بدل دوں گا۔ وہ شرارت میں اسے لے کر آئی ہو گی مگر میں اسے حقیقت بنا دوں گا۔ آخر فاکیہ سے کچھ تو کام لینا چاہئے۔ یہی سوچ کر سلمان نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا۔

''برجیس قدر۔'' اس بار لڑکی نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

سلمان نے زیر لب فاکیہ کو مخاطب کیا اور اس کا جواب سنتے ہی اس کی پیشانی پر خود بخود شکنیں پڑ گئیں۔ صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا قیافہ کچھ اور کہہ رہا تھا اور فاکیہ کچھ اور۔ خاتون نے بڑے غور سے اس کشمکش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کوئی خاص بات؟'' بالآخر ان سے رہا نہ گیا۔

''ہاں خانم!'' سلمان نے اپنی پیشانی کی شکنوں کو درست کرتے ہوئے کہا ''آپ کی عروس پر ''سحر'' کے اثرات پائے جا رہے ہیں جب کہ.....'' سلمان نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''جب کہ کیا؟ برائے کرم وضاحت کریں۔'' خاتون کے لہجے میں عجلت مترشح تھی۔

''خانم!'' سلمان نے ان کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے کہا ''اگر آپ

میری روحانیت کا امتحان لینے آئی ہیں تو اور بات ہے۔ ورنہ آپ کو اس کی وضاحت کی کیا ضرورت.....''

ایک لمحے کے لیے خاتون ششدر انداز میں اسے دیکھتی رہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے ایک گہری سانس لی' اطمینان وسکون سے پُر سانس۔

''آغائی سلمان! میرے سارے شکوک وخدشے دور ہوگئے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ مجھے آپ سے مل کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس لیے کہ جس تعلق کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی' آپ کی علمیت اور روحانیت نے اسے محسوس کرلیا اور خوشی اس وجہ سے ہوئی کہ میں صحیح جگہ پہنچی ہوں۔'' خاتون بلا کسی جھجک کے بولتی رہیں۔ ''آپ سے ایک درخواست ہے۔ برائے کرم میرے نام اور میرے گھرانے کا کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔''

خاتون نے اپنا تعلق جس گھرانے سے ظاہر کیا' وہ بڑا ہی محترم ومکرم نام تھا۔

خاتون کے اس انکشاف کے بعد لازم ہوگیا تھا کہ ان کے ادب لحاظ اور احترام میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی جائے۔ اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کی جائے مسئلہ نہ صرف غور سے سنا جائے بلکہ اس کے حل کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔

''خاتون محترم! آپ مجھے پوری تفصیل کے آگاہ کریں۔ گھر میں کتنے لوگ ہیں؟ آپ کے اور آپ کی عروس کے تعلقات گھر کے دیگر لوگوں کے ساتھ کیسے ہیں۔ گھر میں کون کون آتا جاتا ہے' وغیرہ وغیرہ.....''

خاتون نے جو واقعات بیان کیے' ان کا لب لباب یہ تھا۔

وہ اپنے خاوند کے ساتھ شاہرہ پہلوی کے ایک اعلیٰ بنگلے میں رہتی تھیں۔ گھر میں دو عدد نوکر اور ایک نوکرانی بھی رہائش پذیر تھے۔ ان کی رہائش سرونٹ کوارٹر میں تھی۔ دو ملازم' میاں بیوی تھے اور ایک پاکستانی بلوچ تھا' جس کے ذمے..... گیٹ کی چوکیداری اور گارڈن وغیرہ کی دیکھ بھال تھی۔ جب کہ دونوں ملازم میاں بیوی گھر کی صفائی باہر کا کام اور کھانے پکانے وغیرہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔

خاتون کی بڑی عروس بقول خاتون کے نئے زمانے کی موڈرن لڑکی تھی اور شادی کے کچھ ہی دنوں بعد آپس میں کچھ اختلافات ہوگئے مگر اس کی نوعیت زیادہ سنگین قسم کی نہ تھی چنانچہ بڑی عروس سے صرف ضرورت کے وقت ہی بات کرتی تھیں۔ شاید اس اختلاف کی خلیج میں اس

بات کا بھی ہاتھ تھا کہ بڑے بیٹے نے ''لو میرج'' کی تھی جو ماں باپ دونوں کو قطعی پسند نہ آئی تھی۔ ظاہر ہے ایک مذہبی گھرانے کی اقدار کو ٹھیس جو پہنچی تھی۔ یہ ''لو میرج'' والی بات ان کے وقار' عزت اور آبرو کے منافی جاتی تھی۔ بھلا وہ کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ مگر انہیں برداشت کرنا پڑا کیوں کہ معاملہ بڑے بیٹے کا تھا۔ چنانچہ گھر کی بات باہر نہ نکلے کے مصداق انہوں نے تلخ آب غم کا یہ گھونٹ حلق سے اتار ہی لیا۔ کیونکہ شاہ رضا شاہ پہلوی ایسی باتوں کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں بڑی عروس اور مادر محترم میں اختلافات تو ہونے ہی تھے البتہ پوتے کی پیدائش نے بہت حد تک دادا' دادی کے زخموں پر پھایا رکھ دیا۔ مگر بڑی عروس نے بیٹے کو ورغلا کر کسی اور شہر اپنا ٹرانسفر کرا لینے پر بیٹے کو مجبور کردیا اور بیٹا قصبہ ہرموز منتقل ہوگیا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اسی محاورے کے مصداق دونوں میاں بیوی نے بڑے بیٹے کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی اپنی پسند سے منجھلے کی شادی کردی۔ منجھلا بیٹا فرمانبردار نکلا۔ اس نے بغیر کسی چوں چرا کے والدین کا فیصلہ قبول کرلیا۔ مگر بیوی زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے سکی۔ اور معمولی بخار میں چٹ پٹ ہوگئی۔ بیوی کے مرنے پر عقیل ٹوٹ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ماں نے شادی پر راضی کیا اور زریں اس گھر کی دوسری عروس بن گئی۔

زریں نجیبی کی یہ دوسری شادی تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی اتنی دلدادہ بھی نہ تھی۔ دوسرے اس کی پرورش بھی ایرانی ماحول میں ہوئی تھی اور گھرانا بھی مذہبی تھا۔ چنانچہ دونوں مادر محترم اور پدر مکرم کی آنکھوں کا تارہ بن گئی اور یوں ماں باپ کے بے قرار دل کو گویا قرار آ گیا۔

شادی کے بعد وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے مگر چھوٹی عروس منجھلی کی طرح اپنی جگہ ان دونوں مادر محترم سسر کے دل میں نہ بنا سکی۔

''خاتون محترم! اس نے چند سوالوں کے جواب پانے کے بعد انہیں مخاطب کیا۔ ''مجھے دو دن کا وقت درکار ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی مثبت حل نکل آئے گا۔''

''مجھے پورا یقین ہے!'' خاتون نے اطمینان بخش لہجے میں کہا ''اب میں کب حاضر ہو جاؤں؟''

''نہیں خانم! میں نے مؤدب انداز میں کہا ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں پرسوں صبح 10 بجے آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں؟'' دراصل سلمان اس جگہ کو اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ فاکیہ کا ساتھ پا کر اب اسے بھی ایسی باتوں میں دلچسپی محسوس

ہونے لگی تھی۔

''زہے نصیب!'' خاتون نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا ''لیکن اگر 10 بجے کے بجائے 11 بجے کا وقت رکھ لیں تو نوازش ہوگی کیوں کہ 10 بجے میرے دونوں بیٹے اپنے اپنے دفتر روانہ ہوتے ہیں۔''

''کوئی حرج نہیں۔'' سلمان نے جواب دیا ''آپ کے گھر کا ایک سرسری جائزہ ہی تو لینا ہے لینا ہے۔''

خاتون کے جانے کے بعد سلمان نے فاکیہ سے رابطہ کیا۔ وہ فوراً حاضر ہوگئی۔ آتے ہی اس نے کہا ''سلمان پتا نہیں کیوں یکا یک تم سے جو بھی مل رہا ہے ایک مصیبت ہی اسے سمجھو۔''

''یہ عورتیں تو خاصی مہذب اور ایک اچھے گھرانے کی ہیں۔'' سلمان بولا۔

''عورتیں تو واقعی اچھی ہیں مگر ان کا دم چھلہ مصیبت ہے۔ جب ان کے گھر پر جاؤ گے تو اصل بات کا پتا چلے گا۔''

''ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟''

''وہاں جاؤ خود ہی پتا چل جائے گا۔'' اس کی نقرئی ہنسی گونج اٹھی جو صرف سلمان سن سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے مت بتاؤ۔'' سلمان نے برا مان جانے کے انداز میں کہا۔

''جو مزہ الجھن میں ہے وہ سلجھن میں کہاں۔ بس کل کا انتظار کرلو۔''

❁

سلمان اگلے دن ٹھیک گیارہ بج کر دس منٹ پر خاتون کے عالیشان بنگلے پر پہنچ چکا تھا۔ غالباً خاتون نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو پہلے ہی اس کی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ داخلی گیٹ پر خاتون بہ نفس نفیس خود موجود تھیں۔ انہوں نے بڑے احترام سے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

سلمان کی ہدایات پر خاتون نے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگربتی سلگا کر رکھ دی گئی تھیں اور ایک گلاس میں پانی رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر عمل پڑھنے کی اداکاری شروع کر دی۔ پانی کے گلاس پر عمل پڑھ کر پھونک دیا۔ ڈرائنگ روم کی فضا اگربتی کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

اداکاری سے فارغ ہونے کے بعد اس نے خاتون کو مخاطب کیا۔ ''خانم! کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر کے تمام کمرے ایک نظر دکھا سکیں؟''

''جی!'' خاتون نے گردن ہلائی ''قہوہ بھی تیار ہے' آپ چاہیں تو قہوہ کے بعد میں کمرے دکھا دوں؟''

''میرے خیال میں کمروں کا ایک نظر پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔ قہوہ اس کے بعد پی لیں گے۔''

''ٹھیک ہے' جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' خاتون نے کہا ''آیئے! سب سے پہلے اپنا کمرا دکھا دوں۔''

خاتون کا کمرا آرام و آسائش کی ضروری اشیاء سے سجا ہوا تھا اور انتہائی سلیقے سے آرائش کی گئی تھی۔ اصل میں مجھے فاکیہ کی طرف سے کچھ ایسے اشارے ملے تھے کہ اس گھر پر کچھ ایسا ہے' کوئی قوت ہے جس کی سزا عروس بھگت رہی ہے۔ سلمان کا اپنا اندازہ یہ تھا کہ اس کا ماخذ اسی گھر میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس نے پانی کا گلاس ہاتھ میں لے لیا تھا۔ خاتون کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے اس پانی کے چند چھینٹے اس کمرے میں چھڑکے' توقع کے برخلاف کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا جس کی بنیاد پر میں کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے انہوں نے تقریباً سات کمرے دکھائے اور سلمان کی پریشانی بڑھنے لگی کیوں کہ ان ساتوں کمروں کا مکمل جائزہ لینے کے بعد بھی وہ اثرات ظاہر نہیں ہوئے' جن کی اسے توقع تھی۔

''آیئے آغا سلمان'' خاتون نے کہا ''اب میں آپ کو اپنی عروس کا کمرا دکھا دوں۔''

کمرے میں اس وقت زریں موجود نہ تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھی۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی سلمان کی حسیات بیدار ہونے لگیں۔ اس نے پانی کے چند چھینٹے دیگر تمام کمروں کی طرح اس کمرے میں چھڑکے اور چند سیکنڈ بعد ہی اس کے ذہن پر پھیلی ہوئی مایوسی یک لخت غائب ہوگئی۔ پانی چھڑکتے ہی اس کمرے میں ہلکی سے ناگوار بو پھیل گئی۔ سڑے ہوئے گوشت کی بدبو۔ خاتون اس ساتھ ہی کمرے میں موجود تھیں۔ اس سڑے ہوئے گوشت جیسی بدبو کا ہلکا سا بھبکا ان کی ناک سے ٹکرایا تھا۔ یہ سلمان نے ان کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی محسوس کرلیا تھا۔ کیوں کہ ان کی ناک کے نتھنوں کی جنبش چغلی کھا رہی تھی کہ انہوں نے بھی اس ناگوار بو کو محسوس کیا ہے اور اب اس بدبو کو محسوس کرتے ہی سلمان کی ساری ذہنی کوفت دور

ہوگئی۔ فاکیہ نے ایک بار پھر اس کی رہنمائی کی تھی۔

''آغائی سلمان!'' خاتون کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی بے چینی مترشح ہو رہی تھی۔ جیسے اس کمرے میں ان کا سانس گھٹنے لگا ہو۔

''مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑا سا پانی پی کر آتی ہوں۔ شاید میرا بلڈ پریشر گڑبڑ ہو رہا ہے۔''

''چلیے خاتون! ہم ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' سلمان نے انہیں مشورہ دیا ''آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا بلڈ پریشر قطعی نارمل ہے۔ یہ جو آپ اپنے اندر کمزوری اور گھبراہٹ محسوس کر رہی ہیں' اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ آپ اس پانی کا ایک گھونٹ پی لیں۔ انشاءاللہ بہتر محسوس کرنے لگیں گی۔''

سلمان نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔ پانی کا گھونٹ بھرتے ہی خاتون نے کمرے سے باہر قدم نکالا۔ کمرے کی فضا سے باہر نکلتے ہی کھلی فضا میں انہوں نے دو چار گہری گہری سانسیں لیں۔

''یا میرے خدا! میری تو سانس ہی گھٹ کر رہ گئی تھی' وہ بو کتنی ناگوار تھی۔ پتا نہیں زریں نے کیا چیز سڑا دی ہے' کمرے میں.....''

''نہیں خانم!'' سلمان نے انہیں ٹوکا۔ ''یہ بو کسی چیز یا کسی شے کے سڑنے کی نہیں بلکہ یہ گندی روح یا عمل کا نتیجہ ہے اور اس گندے عمل کا ماخذ یہ کمرا ہے۔''

خاتون نے ایک لمحے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا ''آغائی سلمان! یقین کیجیے' میرے دل میں پہلے ہی سے یہ خیال موجود تھا کہ آپ فوراً بات کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ خیال کیوں کر میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ میریز ریں پر جادو یا سحر وغیرہ کرایا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے ایک ماہ سے جیسے کوئی انجانی قوت' کوئی غیبی آواز مجھے یہ باور کرا رہی ہے کہ اس پر سحر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پریشان تھی کہ اب یہ سب شروع ہو گیا۔ میں بہت پریشان تھی کہ عزیزہ رخسار نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور آپ سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے باوجود ان باتوں پر توجہ نہ دینے کے نہ جانے کیوں آپ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ ملاقات میں حرج ہی کیا ہے' اور بس یہی سوچ کر آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی تھی۔ مگر آپ سے مل کر واقعی مجھے ایسا سکون محسوس ہوا۔ کہ ان باتوں کو کوئی

اہمیت نہ دینے کے باوجود میں نے آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کو گھر کا جائزہ لینے کی اجازت دے دی اور اب اس انکشاف کے بعد مجھے آپ کی روحانیت کا قائل ہونا پڑ رہا ہے۔''

''خانم!'' سلمان نے اس طویل تمہید پر گرہ لگاتے ہوئے کہا ''آپ کے خواب سچے تھے۔ آپ کو اس سلسلے میں باخبر کیا جا رہا تھا۔ آپ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے' آپ کی رہنمائی کی جا رہی تھی۔''

باتیں کرتے ہوئے خاتون اور سلمان دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ان کے اندر پہنچتے ہی قہوہ کی ٹرالی لیے ایک ملازم داخل ہوا اور اس نے بڑے سلیقے سے قہوہ بنا کر پیش کی۔ سلمان کی طرف قہوہ کا فنجان بڑھاتے وقت مجھے اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے اثرات نظر آئے۔ کچھ خوف' کچھ سہم زدہ سے تاثرات' سلمان نے اس کیفیت کو محسوس تو کیا مگر کوئی اہمیت نہ دی۔

قہوہ پیتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل زریں' زریں کی گردان کر رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ''گندے علم'' کی طرف کیسے رجوع ہوئی؟

گندہ علم یا سفلی علم کے بارے میں مختصراً یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ وہ علم ہوتا ہے جس کا عمل' شریعت کے سراسر خلاف ہوتا ہے اور اس سے مقصود کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو فتنہ' فساد کا باعث ہو اور شریعت تو نور ہی نور ہے اور نور پاکیزگی کی علامت ہے' خیر علامت ہے' جب کہ تاریکی علامت ہے بدی کی' گندگی کی اور شر کی۔ اسی لیے اسلام' سحر یا جادو کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ مگر میں اتنا کچھ جانتے ہوئے بھی فاکیہ کی وجہ سے اسی قسم کے چکر میں اب تک پڑا ہوا تھا۔

ایک سوال سلمان کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ وہ یہ کہ ''عروس'' خود تو یہ عمل کر نہیں سکتی۔ ظاہر ہے یہ کوئی اتنا آسان عمل نہیں ہے۔ پھر کسی رشتے دار کے حوالے سے' وہ کسی کالے علم کے عامل تک پہنچی..... مگر اس کے رشتے داروں میں کسی ایسی ہستی کا وجود مشکل ہی نظر آتا تھا' جس کی موافقت میں وہ کسی عامل سے رجوع کر سکتی..... پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بات تو ابھی قبل از وقت ہے کیوں کہ ابھی یہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس کے پس پردہ کون شخصیت ہے۔

لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا' جس طرح فاکیہ سے اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس ''سحر'' کا ماخذ وہ کمرا ہے۔ اسی طرح اس کی مدد سے میں اس شخصیت کو بھی بے نقاب کر سکتا تھا۔ چنانچہ چائے پینے کے بعد' اس نے خاتون سے زریں کو بلانے کے لیے کہا۔ ظاہر ان پر یہی کیا تھا کہ ان کے لیے خصوصی دعا کرنا ہے۔

سب سے پہلے زریں ہی سلمان کے سامنے آئی۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کمال ہوشیاری سے پڑھے ہوئے پانی سے اپنا ہاتھ غیر محسوس انداز میں گیلا کرلیا تھا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہی ناگوار بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی' جو اس کمرے میں پانی چھڑکنے سے پھیلی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہاں اس کی شدت تیز تھی مگر یہاں؟ اس نے اِس بو کو محسوس کرتے ہی ہاتھ بڑی عروس کے سر سے ہٹالیا تھا۔ اس لیے اس کی شدت بہت کم تھی' بالکل نہ ہونے کے برابر۔

سلمان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب یہ بات بالکل صاف ہوگئی تھی۔ یہ ہی اس مکروہ عمل کی مرتکب ہوئی ہے۔ مگر کیسے یہ ایک راز تھا' جس کا سراغ لگانا ضروری تھا۔ لیکن اپنے طور پر۔ بغیر فاکیہ کی مدد لیے۔

گھر کے دیگر لوگوں کو بھی دیکھنا ضروری تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے سلمان نے دیگر افراد کو بھی پڑھے ہوئے پانی کے عمل سے گزارا۔ اسی غیر محسوس انداز میں..... مگر ان پر کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ اسی لمحے وہی نوکر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ شاید خاتون نے ٹرالی واپس لے جانے کا حکم دیا تھا۔ نوکر کے چہرے پر سلمان کی نظر پڑی تو ایک عجیب قسم کا خوف سا اس کے چہرے پر اسے نظر آیا۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ یہ غریب ملازم پیشہ لوگ' کسی عزت دار شخص کو دیکھ کر ویسے بھی سہم جاتے ہیں اور یہاں تو خود اس کی مالکہ بڑے ادب و احترام سے پیش آرہی تھی مگر جب اس نے اپنی نظریں فوراً ہی جھکالیں۔ جیسے سلمان سے نظر ملانے میں اسے کوئی خدشہ ہو تو سلمان ٹھٹکا اور محض اپنا تجسس دور کرنے کے لیے بڑے ملائم انداز میں اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیوں میاں! تمہارا نام کیا ہے؟''

گو اس کے لہجے میں نرمی تھی' مگر نہ معلوم کیوں اس انداز تخاطب پر وہ ایک دم چونک اٹھا۔ بدحواسی میں اس کے ہاتھ سے وہ پیالی چھوٹ گئی جو وہ میز سے اٹھا کر ٹرالی پر رکھ رہا تھا۔ اس کی یہ بدحواسی سلمان کے لیے ہر لحاظ سے غیر متوقع تھی۔ وہ اس انداز میں ہڑبڑا اٹھا تھا جیسے پہلے ہی سے وہ اس کشمکش میں گھرا ہوا ہو کہ کہیں اس سے کوئی بات نہ کرلی جائے۔

''جواب دو۔'' خاتون کی تحکمانہ آواز گونجی تو وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولا۔

''جی! میرا نام رمزی بلوچ ہے۔'' وہ سلمان سے نظریں چراتا ہوا بولا۔

''ادھر آیئے!'' سلمان نے اشارے سے اپنی طرف بلایا' اسی اثنا میں سلمان نے پانی کی چند چھینٹیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے رمزی پر ڈالیں۔ کمرے میں یکدم وہی سڑاند بھری بدبو کا بھپکا اٹھا اور دوسرے ہی لمحے میں' سلمان سب کچھ سمجھ گیا۔

وہ گتھی جو وہ چند لمحوں پہلے تک سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا' یکدم اس کا ایک سرا ہاتھ لگ گیا مگر وہاں کچھ کہنا مناسب نہ تھا اس لیے اس نے محض ایک دو رسمی جملے بول کر اسے فارغ کر دیا۔ رمزی ایسے وہاں سے نکلا جیسے جان بچی سو لاکھوں پائے۔

سلمان نے اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد موقع پا کر تنہائی میں خاتون سے پوچھا۔

''کیا آپ کے اس گھریلو ملازم اور اس کی بیوی سے کہیں تنہائی میں کچھ بات ہو سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں! آیئے' میں آپ کو ان کے کوارٹر میں لے چلتی ہوں۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔''

''اس سے پہلے میں آپ کی عروس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہوں گا۔'' سلمان نے کہا۔

''کیوں نہیں' چلیے میں آپ کو اس کے کمرے تک پہنچا دیتی ہوں۔'' کہہ کر وہ سلمان کو لے کر چلی۔

''سلمان اب اصل بات سے پردا اٹھنے والا ہے۔'' فاکیہ جو اب تک خاموش تھی، سرگوشی میں بولی اور سلمان ہوشیار ہو گیا۔ فاکیہ اس کے تجسس سے لطف لے رہی تھی۔ وہ کھل کر کچھ بتا نہیں رہی تھی اور سلمان بھی غصے میں اس سے کچھ پوچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اس مسئلہ کو اپنے طور پر حل کرنا چاہتا تھا۔ اسے بھی ضد چڑھ گئی تھی۔

کمرے میں پہنچا کر خاتون چلی گئیں۔ اب کمرے میں صرف سلمان اور زریں بخاشی رہ گئی تھی۔ فاکیہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

''یاد رکھو جب تک حقیقت نہیں بتاؤ گی تم اسی طرح عذاب میں گرفتار رہو گی اس لیے بغیر کسی جھجک کے ایک ایک بات کھل کر بتاتی چلی جاؤ۔'' سلمان نے کہا۔

''کہاں سے بتاؤں؟'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''شروع سے تاکہ بات کی گہرائی تک آسانی سے پہنچا جا سکے۔'' سلمان نے مہمیز کیا۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میری شادی کو تین سال ہوئے تھے مگر میری گود خالی

تھی۔ میں جب پاس پڑوس کے بھرے پرے گھروں کو دیکھتی' اپنے دیوروں کے بچوں کو دیکھتی تو میرے دل سے ایک آہ سی نکلتی۔ میں جانتی تھی کہ میری اس کمی کو اصغر زبائی بھی محسوس کر رہے ہیں مگر انہوں نے ابھی تک یہ بات زبان پر نہیں لائی تھی۔ ہاں! مادرِ محترم بھی اب پہلے کی طرح ہر بات کو طرح نہیں دیتی تھیں۔ ان کے مزاج میں دھیرے دھیرے تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ اب وہ ٹوکنے بھی لگی تھیں۔ ذرا سی دیر کو میں گھر سے نکلتی تو وہ سوالات کا انبار لگا دیتیں جبکہ خود دن بھر غائب رہتیں۔'' وہ سانس لینے کو رکی پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔

''میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اب انہیں بھی میری خالی گود کھلنے لگی ہے۔ وہ جب تب طعنے بھی دے دیا کرتی تھیں کہ میں بانجھ ہوں اور ان کا خاندان ختم ہو رہا ہے۔ وہ بیٹے کے سامنے بھی گھر کے سونے پن کا رونا رونے لگی تھیں۔ اب مجھے اس خوف نے گھیر لیا تھا کہ کہیں اصغر زبائی میری اس کمزوری کا سہارا لے کر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں، ایک روز تو میں بری طرح ڈر گئی۔ اس دن میں خانم تربزی کے گھر سے لوٹی تھی کہ دروازے پر ٹھٹک گئی۔ اندر سے مادر محترم کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بیٹے کو مشورہ دے رہی تھیں کہ وہ دوسری شادی کر لے۔

یہ بات معمولی نہ تھی۔ عورت ہر چیز برداشت کر لیتی ہے' ہر دکھ سہ لیتی ہے مگر شوہر میں ساجھے داری برداشت نہیں کرتی۔ میں بھی بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی کہ مرد کا کیا بھروسا؟ اصغر زبائی بھی اولاد کی چاہت کا بہانہ بنا کر مجھ سے دور ہو سکتے ہیں' کسی اور کے قریب جا سکتے ہیں۔

میں اسی وقت مڑ گئی تھی۔ آنسو پونچھتے وقت پڑوسی کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو بے چین ہو گئیں اور کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔ ہمدردی پا کر میرے جذبات بھپر اٹھے۔ ضبط اور حوصلے نے سپر ڈال دیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل کے نہاں خانے میں دبے غم آنسوؤں کی بوچھاڑ میں بہہ گئے تو میں نے انہیں مادر محترم کے الفاظ سنا دیے۔

''بیٹی! اس دنیا میں یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرد عورت کے دشمن ہوتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے' وہی اس کی ہستی بستی گرہستی کو اجاڑتی ہے۔ صدیوں سے ساس ہی عروس کو جلاتی تڑپاتی آئی ہے لیکن تم فکر نہ کرو اس مسئلے کا حل میں تلاش کروں گی۔ میری نند بھی بڑی ظالم تھی۔ اس نے بھی اپنی عروس کو ستا مارا تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کر میرا خون بھی کھول اٹھتا تھا۔ جانتی ہو اسے کیسے آزادی ملی؟''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ماں نے کسی عامل سے تعویز لا کر دیا تھا۔ اس تعویز نے میری نند کی زبان پر تالے ڈال دیے تھے۔ اس کا دل موم ہو گیا تھا اور وہ اپنی عروس کو سر آنکھوں پر بٹھانے لگی تھی۔ میں بھی تمہیں کسی پہنچے ہوئے عالم سے تعویز لا کر دوں گی۔ اگر ہمارا شہر ہوتا تو میں عروس کی ماں سے اس عامل کا نام پوچھ لیتی مگر تم فکر نہ کرو میں یہیں کسی اچھے عامل کو ڈھونڈ لوں گی''۔

پڑوسن کی باتوں نے مجھے نیا راستہ دکھا دیا تھا۔ میں خود بھی کسی پہنچے ہوئے عامل کو تلاش کرنے لگی تھی۔ ایک دن شاہرہ صدر سے لوٹ رہی تھی کہ ایک آدمی نے بہت سارے اشتہار کھڑکی سے اندر پھینکے۔ ایک اشتہار کو اٹھا کر میں بھی پڑھنے لگی۔ وہ اشتہار کسی کالے جادو کے ماہر کا تھا۔ اشتہار میں لکھا تھا۔ ''سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں۔ صرف پندرہ دن میں آپ کو آپ کے من کی مراد مل جائے گی''۔

''میں نے اشتہار کو سنبھال کر رکھ لیا۔ اسے میں پڑوسن کو دکھانا چاہتی تھی۔ سیدھی ان کے گھر پہنچی۔ انہیں اشتہار دکھایا۔ وہ بھی خوش ہو اٹھیں اور اگلے دن اس پتے پر پہنچنے کا پلان بنا لیا۔

اگلے دن ہم انسانوں کا سمندر پار کرتے ہوئے اس دکان میں پہنچ گئے جس کا اشتہار میں ذکر تھا۔ وہاں ایک بابا جی بیٹھے تھے۔ وہ ایرانی نہیں تھے۔ باتوں سے ہی وہ غیر ملکی لگے تھے۔ انہوں نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''بی بی! تمہاری کوکھ کو ایک دشمن عورت نے باندھ دیا ہے۔ تم اس وقت تک ماں نہیں بن سکتیں جب تک اس عمل کا توڑ نہ کیا جائے۔ میں بنگال سے آیا ہوں۔ بنگال جانتی ہو کہاں ہے؟ یہاں سے بہت دور۔ وہاں صرف جادو منتر ہوتا ہے۔ یہاں کے شاہی خاندان کے بہت سے لوگ میرے مرید ہیں۔''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ عورت کون ہے؟'' پڑوسن نے پوچھا۔

''بابا جی خلا میں گھورنے لگے۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر وہ اسی حالت میں بڑبڑائے۔ وہ تجھ سے عمر میں دوگنا بڑی ہے۔ اس کے سر میں سفیدی ہے۔ وہ قد آور ہے۔ رنگ بھی صاف ہے۔ کئی دانت ٹوٹ چکے ہیں''۔ پھر انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں میں سمجھ گئی۔ یہ حلیہ میری ساس کا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی بھی ہے اور اس کے بال بھی سفید ہیں۔ ضرور یہ بدمعاشی اسی کی ہے۔ بابا جی آپ اس کا توڑ کر دیں''۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ ہر مادر محترم کا یہی حلیہ ہوتا ہے اور میں بابا جی کو بتا چکی ہوں کہ میری دشمن میری ساس ہے۔

''کچھ خرچ آئے گا۔ بول تو کرے گی؟ کالے جادو کا توڑ آسان نہیں ہے''۔ بابا جی نے کہا۔

''کتنا خرچ آئے گا؟'' میں نے منمنا کر پوچھا۔ خرچ کا نام سن کر میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''پورے دو ہزار تومان خرچ ہوں گے''۔

اس زمانے میں دو سو تومان معمولی رقم نہ تھی۔ آج تو دو لاکھ تومان بھی کم پھر بھی میں راضی ہوگئی۔ زندگی بھر کی تڑپ کو پرے دھکیلنے کے لیے مجھے یہ رقم بھی چھوٹی لگی اور میں ایک دو روز میں آنے کا کہہ کر چلی آئی۔ آتے وقت میں نے بابا بنگال والے کو پانچ تومان بطور فیس دے دیے تھے۔ اب دو ہزار تومان کا انتظام کرنا تھا۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی' میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ پڑوسن نے حل بتا دیا۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ اپنا کوئی زیور چپکے سے بیچ دو۔ اصغر زبائی نے کبھی پوچھا تو کہہ دینا پتا نہیں کون لے گیا۔ تمہاری ماں بہن تو ہیں نہیں جو اسے شک ہوگا کہ انہیں دیا ہے۔ کچھ دیر شور مچا کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ اس کا ایک فائدہ اور ہوگا۔ تمہارے گھر پڑوس کی عورتیں آتی رہتی ہیں۔ انہیں تمہاری ساس بلاتی ہیں اس لیے انہی پر الزام آجائے گا۔

اگلے ہی دن میں نے اس مشورے پر عمل کر ڈالا اور بابا بنگال والے کو رقم پہنچا دی۔ اس نے رقم لے کر اگلے دن پھر بلایا۔ میں پڑوسن کے ساتھ دوسرے دن پھر پہنچی۔ بابا نے پانچ عدد لونگ اور دو کیلیں دیں۔ ہر روز ایک لونگ مجھے خود کھانا تھا اور کیلوں کو اس بیڈ میں ٹھوک دینا تھا جس پر میں سوتی تھی۔

یہ عمل کیے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ مجھے ایک نئی بیماری لگ گئی۔ اب میں نفساتی طور پر اپنی ساس اماں سے خوف زدہ رہتی تھی۔ مجھے ہر وقت یہی ڈر رہنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر کوئی عمل کرا رہی ہیں۔ مجھے کچھ کھلا دیں گی۔ جس طرح میں نے ان کے کمرے میں تعویذ دفن کیا ہے' اسی طرح وہ بھی میرے کمرے میں تعویذ دبا جائیں گی۔ انہی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ اب میں رات کو سوتے سوتے خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ ہر وقت دل پر گھبراہٹ طاری رہنے لگی تھی۔ ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ اب اماں کی صورت سے بھی مجھے نفرت ہوگئی تھی۔ اس دوران میں ایک دن بابا کے پاس پہنچ گئی۔ انہیں خوب کھری کھری سنائیں۔ اس لیے کہ میں انہیں دو ہزار تومان سے زائد رقم دے چکی تھی۔

میرے تیور دیکھ کر بابا جی نے کہا۔ ''بی بی! تم پر کالا جادو کیا گیا ہے اور کالے جادو کا توڑ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں' لیکن اب تک کالے علم کو آزمایا نہیں ہے کیونکہ یہ بہت ٹیڑھا علم ہوتا ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ پر شک کرنے لگو گی اس وجہ سے بھی میں یہ عمل کرنے سے گریز کر رہا ہوں''۔

بابا جی کی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اتنی رقم لے کر بھی وہ کہہ رہے تھے کہ ابھی صرف کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے جل کر کہا۔ ''اپنا علم تب آزمائیں گے جب میرے گھر میں سوکن آجائے گی؟''

''دیکھو بی بی! کالے علم کی فیس ایک ہزار تومان اور لوں گا اس لیے کہ اس عمل میں جان کا خطرہ ہوتا ہے''۔ بابا جی نے کہا۔

گھر آکر میں نے اپنا ایک جڑاؤ ہار نکالا اور اسے فروخت کرنے کے لیے پڑوسن کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی۔ اسے بیچ کر جو رقم ملی اسے لے کر بابا کی دکان پر آگئی۔ بابا جی اکیلے بیٹھے تھے۔ ان کا اسسٹنٹ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔

''بابا جی' میں رقم لے آئی ہوں''۔ ہزار تومان نکالتے ہوئے میں نے کہا۔

''یہ تم نے اچھا کیا۔ کل پورے چاند کی تاریخ ہے اور کالے علم کے لیے ایسی ہی رات کی ضرورت ہوتی ہے''۔ کہہ کر بابا نے میرا بھرپور جائزہ لیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''چلو اندر والے کمرے میں آجاؤ لیکن اکیلے''۔

میں نے پڑوسن کی طرف دیکھا انہوں نے جانے کا اشارہ کیا تو میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ اس وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں اس کمرے میں پہلے بھی جا چکی تھی مگر اس وقت جب پوری محفل جمی ہوئی تھی۔ اسی ہال میں بابا کا دربار سجتا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر سیاہ مخمل کی چادر بچھی تھی۔ اسی کپڑے کے غلاف والا ایک گاؤ تکیہ بھی تھا جس سے ٹیک لگا کر بابا جی بیٹھتے تھے۔ بابا جی سیدھے جا کر اسی چوکی پر بیٹھ گئے۔ چوکی کے نیچے لوبان دانی تھی جس میں انگارے بھرے تھے۔ بابا جی نے انگاروں پر چٹکی بھر لوبان چھڑکا جس سے گاڑھا گاڑھا سفید دھواں مرغولے کی شکل میں اٹھا اور کمرے میں خوشبو پھیل گئی۔ میں فرش پر ایک جانب بیٹھ گئی۔ میں سوچ رہی تھی پتا نہیں بابا کون سا عمل کرنے والے ہیں یقیناً کوئی خاص عمل ہوگا تبھی تو انہوں نے مجھے اکیلے بلایا ہے۔

کمرے میں پراسراریت کا راج تھا۔بابا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے۔کافی دیر تک وہ زیرلب بڑبڑانے کے انداز میں کچھ پڑھتے رہے پھر انہوں نے ایک جانب رکھے پانسے کو اٹھایا اور اسے ہاتھ گھما کر پھینکا پھر اس پانسے کے نمبر کو کاغذ پر لکھ کر جوڑ گھٹاؤ کرنے لگے۔کافی دیر بعد سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔''بی بی! تمہاری گود بھر سکتی ہے مگر اس کے لیے تمہیں ایک بہت بڑا عمل کرنا ہوگا۔''

''میں .....میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔آپ حکم کریں۔''میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھی طرح سوچ لو۔تمہاری ساس اماں تمہاری زندگی حرام کرنے کے لیے دیور کی سالی سے دوسری شادی کرانے کی تیاری کر چکی ہے۔تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں' سوکن کو برداشت کرو یا پھر میں جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔''

''میں سب کچھ کرنے کیلئے تیار ہوں۔میری گود بھر جائے اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے پر تیار ہوں۔''

''اچھی طرح سوچ لو۔''بابا جی بولے۔اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ایسی چمک جو صرف شکاری کی آنکھوں میں شکار کو دیکھ کر ابھرتی ہے۔ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور اپنی نگاہوں کو جھکا کر بیٹھ گئی۔

''میں جو کچھ کہوں گا کرو گی؟''

''جی ہاں!''میں نے جواب دیا۔اب مجھے پوری امید ہو چلی تھی کہ بابا جی میری مراد پوری کر دیں گے۔

''اگر میں کہوں کہ کسی کا خون کر دو تب؟''

میں سوچ میں پڑ گئی زبانی طور پر کہہ دینا بہت آسان ہے کہ میں قتل کر سکتی ہوں مگر جب قتل کا وقت آتا ہے تو بڑے بڑے سورما بھی دھل اٹھتے ہیں۔بحالت اشتعال قتل کر دینا آسان ہے مگر قتل کرنے کے لیے پہلے سے پلاننگ کرنا بہت مشکل ہے۔مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بابا جی نے کہا۔''کیوں ڈر گئیں؟''

''جی.....جی نہیں۔میں نے سوچ لیا ہے۔میں یہ بھی کر لوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے۔کل چودھویں کی رات ہے کسی طرح ایک بچے کا انتظام کرو۔بچہ

پلوٹھی کا ہو یعنی پہلا بچہ۔عمر بھی کم ہو۔ایسا کوئی بچہ ذہن میں ہے؟''

میں ذہن پر زور دینے لگی۔تبھی مجھے یاد آ گیا کہ میرے پڑوس میں اصفہان کی ایک فیملی نئی نئی آئی ہے۔ان کا ایک ہی بچہ ہے۔شادی کو بھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں یقیناً پہلوٹی کا ہوگا۔ان لوگوں سے میری واقفیت بس واجبی سی تھی لیکن وہ بچہ ہر روز میرے دروازے کے سامنے کھیلنے آ جاتا تھا۔چار پانچ سال کی عمر ہوگی۔میں نے اسی کو شکار کرنے کا سوچ لیا۔

شاید میری دلی کیفیت کا اظہار میرے چہرے نے کر دیا تھا۔تبھی تو بابا جی نے کہا۔

''کیوں یاد آ گیا؟''کوئی بچہ ہے نظر میں؟''

''جی ہاں!میرے ہی محلے میں ایک بچہ ہے۔''

''ٹھیک ہے!کسی بوتل میں اس کے نرخرے کا خون جمع کر کے لے آؤ۔لیکن یہ کام کل دن میں ہی ہونا چاہیے ورنہ اگلی چودھویں کی رات کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''جی!میں کل ہر حال میں اس کا خون لے آؤں گی۔''

''اور یہ بھی سن لو۔اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا۔اگر کسی کو بتاؤ گی تو عمل الٹا ہو جائے گا۔تمہاری جان بھی چلی جائے گی' ساتھ آئی خاتون کو بھی نہیں بتانا۔بلکہ کل انہیں ساتھ لے کر بھی نہ آنا' اکیلی آنا۔''کہہ کر بابا جی کھڑے ہو گئے۔

میں باہر آ گئی۔پڑوسن نے میرا متفکر چہرہ دیکھ کر پوچھا۔''کوئی خاص بات بتائی ہے کیا؟''

''ہاں ایک خاص عمل بتایا ہے۔''میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''کالے علم کا ہر عمل اپنی جگہ انوکھا ہوتا ہے شاید ایسا ہی کوئی انوکھا عمل بتایا ہوگا تبھی تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔''پڑوسن نے کہا۔''لیکن کالا علم بڑا ہی زود اثر ہوتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔خاموشی سے آگے بڑھتی رہی۔گھر پہنچ کر بھی میرا دماغ ماؤف رہا۔یہ کام معمولی نہیں تھا اتنے بڑے کام کو میں کیسے انجام دوں یہی سوچتی رہی۔اسی فکر میں کوئی کام صحیح طور سے نہ کر سکی۔جیسے تیسے کھانا بنایا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔اصغر دفتر سے آئے تو مجھے لیٹے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''کیا بات ہے؟طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں!''میں نے کہا۔میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اگلے دن صبح میں اصغر کے دفتر جانے تک سوتی رہی۔ان کے جاتے ہی اماں بھی پڑوس کے گھر کی خبر لانے برقعہ اوڑھ کر نکل گئیں۔ان کے جاتے ہی میں اٹھ کر کھڑکی پر آ گئی۔ میری نگاہیں سامنے گلی میں ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے پوری امید تھی کہ پڑوسی کا بچہ کھیلنے ضرور آئے گا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کی وہ بچہ نظر آ گیا۔یہ میری خوش قسمتی تھی یا اس بچے کی بدقسمتی کہ وہ بالکل اکیلا تھا۔گلی پوری طرح سنسان تھی۔میں نے بچے کو اشارہ کیا۔

''یہاں آؤ''میں نے اسے آواز دی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میرے پاس آ گیا۔اس نے نیلی نیکر اور سفید قمیض پہن رکھی تھی۔میں نے اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کیا اور اسے لے کر باورچی خانے میں آئی۔چھری پہلے سے تیار تھی۔میں نے باورچی خانے میں لا کر اسے خمیری روٹی دی وہ بیٹھ کر کھانے لگا۔اس وقت میرا دل دھڑک رہا تھا۔سینے کا پنجرہ توڑ کر کسی بھی لمحے دل اچھل کر باہر آ سکتا تھا۔میں نے ریڈیو پوری آواز سے چلا دیا تھا۔گانے کی آواز کان کے پردے پھاڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں میں لرزہ آ گیا تھا۔میں نے کانپتے ہاتھ سے سل پر رکھا بٹا اٹھایا اور پوری قوت سے اس بچے کے سر پر دے مارا۔ بچے کے گلے سے ایک چیخ نکلی اور فضائیں دور تک تیرتی چلی گئیں۔بچہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔میں نے چھری اٹھائی' آنکھیں بند کیں اور اس کے گلے پر زور سے ماری۔وہ پھر چیخا اور بری طرح تڑپنے لگا۔اس کے نرخرے سے بھل بھل خون نکل رہا تھا۔میں نے جلدی سے ایک چوڑے منہ والی بوتل اس کے کٹے ہوئے نرخرے پر رکھ دی۔تھوڑی ہی دیر میں بوتل بھر گئی۔بچہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس بچے کو کہاں پھینکوں۔کافی دیر تک سوچنے کے بعد میں نے اس ننھی سی لاش کو ٹھایا اور کالے کمبل میں لپیٹا پھر اٹھا کر باہر آ گئی۔گلی اب تک سنسان پڑی تھی۔میں نے لاش کو لے جا کر کچرے کے ڈرم میں پھینکا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی واپس آ کر باورچی خانے کو دھونے لگی۔اس کام سے بارغ ہو کر میں نے بوتل کو کاغذ کے تھیلے میں بھرا اور سیدھی بابا کے پاس پہنچ گئی۔

بابا جی آج بھی اکیلے تھے۔مجھے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔انہوں نے پوچھا۔

''خون کا انتظام ہوا؟''

''جی یہ رہا۔'' کہہ کر میں نے بوتل بڑھا دی۔بوتل دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''آؤ اندر آ جاؤ۔'' کہہ کر وہ اندر والے کمرے کی جانب بڑھے۔میں بھی ان کے

ساتھ اندر پہنچی۔انہوں نے کمرے کی کنڈی اندر سے لگائی تھی اور سیدھے جا کر اپنی چوکی پر بیٹھ گئے تھے۔میں ہر بار جس جگہ بیٹھا کرتی تھی اسی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

بابا جی آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھنے لگے۔کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بولے۔''بی بی! ڈاکٹر' دائی اور عامل برابر ہوتے ہیں۔ان سے پردہ اپنی جان سے کھیلنا ہے۔تم خود کو اس کمرے میں تنہا محسوس کرنے کی کوشش کرو۔میری آنکھیں بند ہوں گی۔میں یہیں سے پڑھ پڑھ کر پھونک مارتا رہوں گا۔تمہاری طرف میری پیٹھ ہوگی اس لیے شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔اگر شرم کرو گی تو اپنی مرادوں سے محروم رہ جاؤ گی۔'' کہہ کر وہ دیوار کی جانب گھوم گئے۔کچھ توقف کے بعد بولے۔''اپنا دوپٹا لا کر میرے سر پر ڈال دو' اس طرح کہ پیچھے کا منظر بغیر گھومے نظر نہ آئے گا''۔

میں نے اپنی مراد پانے کے لیے یہ بھی کر دیا اور آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''دیکھو بی بی! میرا چہرہ دیوار کی سمت ہے میں لاکھ چاہوں مگر مڑے بغیر تمہاری طرف نہیں دیکھ سکتا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ایک عامل کے لیے یوں بھی یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔میں کالے علم کا ماہر ہوں۔جب جو خواہش کروں پوری ہو جائے گی لیکن ایک عامل کو یہ زیب نہیں دیتا۔جس طرح ایک ڈاکٹر کے لیے مرض کے آگے سب کچھ ہیچ ہوتا ہے اسی طرح ایک عامل کے لیے بھی دنیا کہ ہر نعمت بے معنی ہوتی ہے۔تم خود کو اس کمرے میں بالکل تنہا محسوس کرو اور اپنے جسم کے ان تمام حصوں پر اپنی انگلی سے خون کے چھینٹے مارو جہاں جہاں تمہارے شوہر کا ہاتھ زیادہ لگتا ہے۔''

میں گود ہری کر لینے کی خواہش میں اندھی بن چکی تھی۔میری مادرِ محترم میرے شوہر کی دوسری شادی کرا دیں گی' خوف نے میری سوچ پر پردہ ڈال دیا تھا۔بابا جی جو جو کہتے گئے میں وہ کرتی گئی۔بوتل آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی کہ بابا نے کہا۔''آج بس اتنا ہی کافی ہے باقی کل کیلئے چھوڑ دو۔اب یہاں سے سیدھے اپنے گھر جاؤ۔نہانے کی ضرورت نہیں ہے اسی حالت میں سو جانا۔اسی حالت میں آج شوہر کو راضی کرنا ہے۔پھر دیکھنا تمہاری زندگی خوشیوں کا گہوارہ بن جائے گی۔کل کا عمل بہت اہم ہے سب کچھ کل والے عمل سے ہی ممکن ہوگا مگر یاد رکھنا اپنی زبان کبھی نہیں کھولنا اس لیے کہ تم قاتل بن چکی ہو۔ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو پھانسی تمہارا مقدر بن

جائے گی مگر فکر نہ کرو۔ میں جب تک نہ چاہوں دنیا کہ کوئی طاقت تمہارا کچھ نہیں بیگاڑ سکتی۔ اب گھر جاؤ۔''

میں اپنے گھر لوٹ آئی۔ اس دن میں بہت خوش تھی۔ مجھے اپنے چمن میں بہار کے آجانے کی پوری امید تھی۔ اصغر بائی مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اس بھری دنیا میں ایک وہی تو میرا سہارا ہے اس سہارے کو آنے والا وقت مزید مستحکم کردے گا یہی خیال میری روح کو سیراب کر رہا تھا۔ میں نے خود کو سجا سنوار کر تیار کیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔۔ میں بار بار کھڑکی پر جا کر باہر جھانک رہی تھی کہ ساس اماں گلی میں داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ کوئی خاص بات ہے۔ تبھی وہ اتنی خوش ہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میرا بناؤ سنگھار دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''شب عروسی منانا ہے۔''

میں نے ان کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا۔ جانتی تھی کہ اگر انہیں جواب دیا تو وہ بھڑکی طرح چمٹ جائیں گی اس لیے خاموش رہ گئی۔ اس خدشے کے تحت کے ماحول میں کشیدگی پیدا نہ ہوجائے۔ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر بولی۔ ''آپ تھیں کہاں صبح سے میں پریشان ہوں''۔

''میرے دور پرے کے ایک عزیز ہیں۔ پہلے بندر عباس میں رہتے تھے اب یہیں آگئے ہیں۔ آج ان سے بھی ملنے گئی تھی۔ بے چارے بہت پریشان ہیں۔ چھوٹی بیٹی بھی اب شادی کے لائق ہے اسی کی فکر میں ہلکان ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ بچی کے لیے کوئی رشتہ دیکھو تاکہ میں جلد سے جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ جس گھر میں جائے گی، گھر کو بھر دے گی۔'' ٹھنڈی سانس لے کر انہوں نے بات ختم کی۔

میں سمجھ گئی کہ بڑی بی چکر چلا رہی ہیں۔ مجھے اب کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ چکر دو چار روز کا ہے جیسے ہی انہیں پتا چلے گا کہ میں امید سے ہوں، وہ فوراً ہی نرم پڑ جائیں گی۔ اس لیے میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا میں پھر سے غور کرنا چاہتی تھی کہ کہیں ایسی کوئی کھلی جگہ تو باقی نہیں رہ گئی جہاں سے وہ حصہ نظر آرہا ہو جس پر خون کے چھینٹے ہیں لیکن وہ تمام حصے پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ اب مجھے اصغر

کا انتظار تھا تاکہ میں اس پر اپنی عشوے طرازیوں کا جال پھینک سکوں۔ وہ وقت آہی گیا۔

''کیا بات ہے جان! آج بڑی کھلی کھلی نظر آرہی ہو۔'' اصغر بائی نے کمرے میں آکر بیٹھتے ہوئی کہا۔

''کیوں کیا میرا دل نہیں ہے؟ کیا میں ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ رہوں؟ آخر مجھے بھی تو کسی عنایت کہ ضرورت ہے۔'' یہ آخری جملہ میں نے ایک انداز سے کہا۔ میری اس قاتل ادا نے جادو کا کام کیا اور وہ گویا مجھ پر مرمٹے۔

اس رات میں نے ایسا محسوس کیا گویا وہ میری شادی کی پہلی رات ہے۔ محبت کی میٹھی میٹھی آنچ میں جلتے ہوئے وہ رات گزر گئی۔

صبح کے وقت میں اٹھی تو اصغر نہا دھو کر تیار تھے۔ ہر روز کی طرح ناشتا نوکر نے تیار کر دیا تھا۔ میں کسلمندی محسوس کر رہی تھی لیکن بابا جی کے ہاں جانا ضروری تھا اس لیے اٹھ کر سیدھی غسل خانے میں پہنچی اور جلدی جلدی نہا دھو کر تیار ہوگئی پھر چادر اوڑھ کر گھر سے نکل پڑی۔

آج بھی میں نے پڑوسن کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ اکیلے ہی بابا کہ ہاں جارہی تھی۔ گلیوں گلیوں ہوتی ہوئی میں روڈ پر آئی اور بابا جی کی دکان کے سامنے پہنچی۔ آج خلاف معمول وہاں کافی لوگ جمع نظر آئے۔ دکان کے سامنے کھڑے جمع غفیر کو دیکھ کر میں ٹھٹک گئی تھی۔

''یہ بھیڑ کیوں جمع ہے؟'' سوچتے ہوئے میں ایک بڑے میاں کے نزدیک پہنچی اور بولی۔ ''بزرگوار! یہ اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔ کوئی بات ہوگئی ہے کیا؟''

''ہاں بیٹی! اس نامراد سنیاسی بابا کا بھانڈا آج پھوٹا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کرنے آئی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ فراڈیا ہے لیکن میری بات کوئی سنتا ہی نہیں تھا۔ اس کمینے کے ایسے ایسے کرتوت ہیں کہ اسے آدھا زمین میں دفن کر کے کتے چھوڑ دینا چاہئیں۔''

میں سوچ میں پڑ گئی جو شخص اتنا بڑا عامل ہے، اس پر پولیس نے کیسے ہاتھ ڈال دیا۔ بابا جی نے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی منتر کیوں نہیں پڑھا؟ معاملہ کیا ہے، یہ جاننے کیلئے میں نے بڑے میاں سے پھر پوچھا۔ ''چچا جان آخر بات کیا ہوئی؟ آخر ایسی کونسی غلطی بابا سے ہوگئی؟''

''بابا! بنہ!'' بڑے میاں نے ہنکار کر کہا۔ ''وہ فراڈیا ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ پتا نہیں کتنی بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگی ہے کھیل چکا ہے۔ اللہ بھلا کرے اس لڑکی کا جس نے کلانتری (تھانے) پہنچ کر بھانڈا پھوڑا ہے۔ اس بدمعاش نے اس کو کھ جلی لڑکی کو اولاد کا لالچ دے کر لوٹ

لیا۔ بے چاری دنیا والوں کے تعنوں سے تنگ آ کر اس کے پاس آئی تھی اور اس نے اس بیچاری کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا۔'' بڑے میاں نے بات ختم کر کے زمین پر تھوک دیا۔

میں کانپ کر رہ گئی۔ اب مجھے اس کی ایک ایک حرکت یاد آنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جو ہوس کی چمک تھی' اس وقت مجھے محسوس نہ ہوئی لیکن اب احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مجھے بھی اپنے جال میں پھانس رہا تھا۔ مجھ سے قتل جیسا گھناؤنا جرم کروانے کے بعد اپنی مٹھی میں جکڑ ہی چکا تھا۔ ایک دو دن میں میری عزت بھی لوٹ لیتا اور میں زخمی پرندے کی طرح پھر پھڑا کر رہ جاتی۔ پولیس کا خوف دکھا کر وہ اپنی من مانی کرتا رہتا اور اس کے حکم پر خود ہی سر جھکانے کے لیے مجبور ہوتی۔

شاید میری کوئی اچھائی آج میرے کام آ گئی تھی تبھی تو عزت محفوظ رہ گئی۔ یہ سوچتی ہوئی میں اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ عجیب سی دہشت نے گھیر لیا تھا۔ بچے کی لالچ میں ایک معصوم کی جان تو لے لی تھی مگر اب خیال آ رہا تھا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ یہ راز کھل بھی سکتا ہے۔ پولیس والے شکاری کتوں کی طرح مجرم کی بو سونگ لیتے ہیں۔ اگر وہ مجھ تک نہ بھی پہنچ پائے تو بھی میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دے گا۔ میں کیسے اس بچے کی ماں کے بین سن سکوں گی۔ برابر والا ہی گھر اس بچے کا ہے۔ بچے کی لاش ملے گی تو کیا کہرام مچے گا۔ اس کی ماں تو پچھاڑیں کھانے لگے گی۔ میں اسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی پیدل ہی واپس چل پڑی۔ گلیوں گلیوں ہوتی ہوئی اپنے محلے پہنچی۔ اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میرا دل کنپٹی میں دھڑکنے لگا ہے۔ پیروں میں رعشہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میرے گھر کے سامنے ازدحام سا لگا ہوا تھا۔ پولیس کی ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔ کچرے کے ڈرم میں لوگ جھانک رہے تھے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ لاش دریافت ہو چکی ہے۔ میں اپنے جسم کو گھسیٹتی ہوئی اپنے دروازے پر پہنچی۔ بہ مشکل دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اکیلا ڈر مجھے کاٹنے کو دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے انجانے خوف نے گھر لیا تھا۔ میں ڈری سہمی اپنے بیڈ پر دبکی ہوئی بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل خوف سے لرز اٹھا۔ دستک دوبارہ ہوئی اور مادر محترم کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ میرا نام لے کر پکار رہی تھیں میں نے دھڑکتے دل پر بہ مشکل قابو پایا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلیپر پہن کر دروازے پر پہنچی۔ آہستہ آہستہ کنڈی کھولی اور باہر کی جانب نظر ڈالی لیکن مجھے دیکھنے کا انہوں نے موقع ہی نہ دیا۔ وہ مجھے دھکیلتی ہوئی اندر آ گئیں۔

''کیا گھوڑے بیچ کر سوئی تھی۔ کب سے میں پکار رہی ہوں۔ اور دوسرے لوگ کہاں ہیں۔ نوکر کہاں مر گیا ہے۔'' وہ غصے سے گھورتے ہوئے بولیں۔

''بس یوں ہی لیٹ گئی تھی کہ نیند نے گھیر لیا۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''اے ہے کیا کہنا ارے کام کرنے والے کو ہزاروں کام نظر آ جاتے ہیں۔ یہ کونے کھدروں میں لگے عنکبوت کے جالے ہیں صاف کر لیتی یا کل کے لیے میاں کے کپڑے استری کر دیتی۔ بے چارا خود ہی اٹھ کر استری کرتا ہے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم ایسی پھوہڑ نکلو گی۔ میں تو اس وقت کو کوس رہی ہوں جب رشتہ لے کر اماں کو بھیجا تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے ابا کو انہوں نے کہا تھا خون سے خون کو ملاؤ نسل اعلیٰ ہو گی اور یہاں تو نسل آگے بڑھتی نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کتنی منتیں مرادیں مانگیں۔ کس کس درگاہ پر نہیں گئی۔ کتنے پیر فقیروں کا دامن تھاما مگر مراد نہ ملی تو میں کیا کروں؟''

''سوکھے پیڑ میں بھی کبھی پھل لگا کرتے ہیں۔ تم تو ٹنڈ درخت ہو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' انہوں نے جھٹکے سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ تالی جیسی آواز دور تک پھیل گئی۔ پھر وہ بولیں۔ ''تاکہ میں اپنیلا ڈلے کی شادی کرا سکوں۔ میں نے تو لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ ان لوگوں نے بھی ہاں کر دی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط یہ ہے کہ تمہیں طلاق دے دی جائے۔''

مجھ ایسا لگا جیسے میرے اندر بم کا دھماکہ ہوا ہے۔ ڈائنامیٹ پھٹا ہے جس نے میرے وجود کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ میں اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ کھڑے ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ پیروں نے میرے جسم کے وزن کو سنبھالنے سے انکار کر دیا اور میں کھڑے کھڑے تیورا کر گر پڑی۔ جس گھر کو بچانے کے لیے میں نے ایک معصوم بچے کو قتل کیا تھا' اس کے خون کی سرخی سے اپنے جسم کو لالہ زار کرنا چاہا تھا وہ گھر ٹوٹنے ہی والا تھا۔ میری آنکھیں جل تھل ہو گئی تھیں۔ میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر دل میں اٹھتے ہوئی طوفان پر بند نہ باندھ سکی اور سر پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ میری آہیں' میرے آنسو بھی مادر محترم کا دل موم نہ کر سکے اور وہ منہ ٹیڑھا کر کے ''ہنہ'' بولتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

پتا نہیں میں نے کتنی دیر آنسو بہائے۔ روتے روتے ہی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میری نیند ٹوٹی تھی اصغر کی آواز پر۔ آج وہ خلاف توقع میرے کمرے میں نہیں آئے تھے۔ برابر کے کمرے سے ان کی آواز آ رہی تھی۔ ساس اماں انہیں سمجھا رہی تھیں کہ نور بہت اچھی لڑکی ہے بلا کی

خوبصورت ہے تمہارے ساتھ بہت اچھی جوڑی رہے گی۔

مرد خواہ کتنا ہی محبت کرنے والا کیوں نہ ہو۔نئی لڑکی کے نام پر با آسانی رام ہو جاتا ہے۔شاید انہوں نے نور کی تصویر دیکھی تھی تبھی تو وہ حیرت بھری آواز میں بولے تھے۔''واقعی ہے تو بہت خوبصورت۔ایسی لڑکی کو تو چٹکی بجاتے دلہا مل جاتے ہیں پھر مجھ جیسے مرد سے اس کے ماں باپ کیسے راضی ہو گئے۔''

''قسمت کی بات ہے بے چاری کی قسمت میں دکھ لکھے تھے۔چھ سال پہلے نکاح ہوا تھا۔لڑکا ڈاکٹر تھا۔انہوں نے سوچا تھا کہ لڑکی کی قسمت سنور جائے گی مگر اس بدذات لڑکے نے اس دکھیاری کی قسمت میں آگ بھر دی۔بجائے رخصتی کرانے کے طلاق نامہ بھجوا دیا۔رخصتی ہو یا نا ہو لیکن طلاق کا کلنک لگ جائے تو لڑکی کی زندگی ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔اس بیچاری کی بھی کہیں شادی نہیں ہو پا رہی ہے اسی لیے اس کے والدین راضی ہو گئے ہیں''۔ساس اماں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔میں پوری طرح ہم تن گوش ہو گئی تھی۔میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہتی تھی۔اصغر کی زبان سے نکلا ہوا ایک چھوٹا سا جملہ میری قسمت بدل سکتا تھا۔میرا دامن خوشیوں سے بھرے گا یا آگ سے'اسی ایک جملے پر منحصر تھا۔تبھی اصغر کی آواز ہوا کے دوش پر سوار میری سماعت تک پہنچی۔وہ کہہ رہے تھے۔''زریں کا اس دنیا میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔وہ کہاں جائے گی؟اس کے ابا جان زندہ ہوتے تو بات دوسری تھی''۔

''لیکن بیٹا بڑے میاں نے ایسی کون سی بھلائی کی۔زندگی بھر ہمیں رلاتے رہے۔ماں باپ کی کرنی کا پھل بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔پھر ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اپنی نسل کو آگے بڑھائیں۔تمہارے ابا کا نام زندہ رکھیں''۔

''آپ کا کہنا درست ہے مجھے اس شادی سے انکار نہیں ہے مگر میں زریں کا کیا کروں؟اسے بے یار و مددگار میں نہیں چھوڑ سکتا''۔

''میں اس کے ساتھ رہ لوں گی۔تم مجھے ہر ماہ خرچہ دے دیا کرنا۔اسی میں ہم دونوں گزارہ کر لیں گے مگر تم نور سے شادی کر لو تا کہ نسل آگے بڑھے۔''

''اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں راضی ہوں''۔اصغر کی آواز آئی۔

میں نے اپنا سینا پکڑ لیا۔مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر

زور سے مسل دیا ہو۔میں سمجھ گئی تھی کہ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔میں نے ایک ماں کی گود اجاڑی تو خدا نے میرا گھر اجاڑ دیا۔قسمت کے لکھے کو اب کوئی نہیں ٹال سکتا۔ٹھوکریں میرا مقدر ہو چکی ہیں۔اس رات اصغر ایک لمحے کیلئے بھی میرے کمرے میں نہیں آئے۔میں ساری رات ان کا انتظار کرتی رہی۔اگر وہ آ جاتے تو میں ان کے پاؤں پکڑ کر اپنی خوشیوں کی بھیک مانگ لیتی مگر وہ تو نئی بیوی کی خوشی میں سرشار تھے۔

اگلی صبح کا سورج میری تباہی کا پیغام لے کر نمودار ہوا۔اصغر نے شاید رات ہی میں طلاق نامہ لکھ لیا تھا۔دفتر جانے سے پہلے مجھے سونپ گئے اب میرا اس گھر سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔میں عدت کی مدت کہاں گزاروں' یہ مسئلہ بھی منہ پھاڑے کھڑا تھا۔پڑوسن نے ہی اس مسئلے کا حل تلاش کیا۔انہوں نے ایک گھر تلاش کر لیا۔وہیں مجھے پہنچا دیا گیا۔

اب میں تھی اور تنہائی۔اس اکیلے گھر میں صبح سے شام تک پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر گھومتی رہتی۔وقت گزرنے کا نام نہ لیتا۔جب رات آتی تو ایسا لگتا تھا کہ اندھیرے کی چادر میں لپٹے ہزاروں عفریت مجھے دبوچنے کے لیے بڑھے آ رہے۔اسی دوران میں ایک دن میری یہ مادر محترم جو میری سگی چچی ہیں' مجھے تلاش کرتی ہوئی آ گئیں۔یہ لوگ پہلے مشہد میں رہتے تھے۔کچھ ہی دن پہلے یہاں آئی تھیں۔

وہ خدا ترس قسم کی ہیں۔انہیں معلوم تھا کہ مجھے بس اس لیے بے سہارا کر دیا گیا ہے کہ میں بانجھ تھی۔انہوں نے میری پریشانی کا حل یہ تلاش کیا کہ مجھے ایک سلائی مشین دلا دی۔تھوڑی بہت سلائی میں جانتی تھی۔پہلے پہل کچھ کپڑے خراب بھی ہوئے مگر پریکٹس نے ہاتھ میں صفائی بھر دی اور میں نہایت تیزی سے مشہور ہونے لگی۔اب اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔اصغر کی اماں نے واقعی آنا چھوڑ دیا تھا مگر مجھے اس کا غم بھی نہ تھا۔دن بھر سلائی مشین کھٹکھٹاتی رہتی۔میرے لیے پڑوس کی ایک عورت آرڈر لا دیا کرتی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا کہ میری زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔چچی نے ایک دن مجھ سے کہا۔''بیٹی!یہ پہاڑ سی زندگی اکیلے کیسے کاٹو گی۔میری مانو تو شادی کر لو۔مرد کا سہارا بہت ضروری ہے''۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔میں نے کہا۔''چچی جان!جن کی قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہوتا ہے''۔

اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے رشتہ دیکھوں۔'' بڑی بی سانس لینے کے لیے رکیں پھر قدرے رازدارانہ انداز میں بولیں۔ ''اتم ہاں تو کرو میں کیسے جوڑا ملا دیتی ہوں''۔

ان کا مشورہ معقول تھا۔ وہ میرے بھلے کی سوچ رہی تھیں۔ مجھے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور جیسا انہوں نے بتایا تھا اگر یہ صحیح تھا تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ میری زندگی سدھر جاتی۔ میں جواب میں کیا کہوں یہ سوچنے لگی۔

کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''اوپر میرا اللہ ہے نیچے آپ کا سہارا۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں اگر یہ رشتہ آپ کی نظر میں اچھا ہے تو کرا دیں۔ میں آپ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں''۔

''ٹھیک ہے میں آج ہی بات کرتی ہوں۔ بیٹی! اگر یہ رشتہ ہو گیا تو تم بہت عیش کرو گی''۔ انہوں نے میری بلائیں لے کر کہا اور جانے کے لیے اٹھ گئیں۔

چچی جان کے جاتے ہی میں سوچ میں گم ہو گئی۔ اگر ایسا ہو جائے تو برا نہیں ہے۔ اتنے دنوں میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اکیلی عورت کٹی پتنگ بن جاتی ہے جسے ہر کوئی لوٹنے کی تاک میں رہتا ہے۔ ابھی میں خیالوں میں ہی کھوئی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے' آ جائیں دروازہ کھلا ہے''۔ میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا اور پڑوسن ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل تھامے اندر داخل ہوئی۔

''لو بی بی یہ کپڑے سنبھالو' جس نے دیے ہیں اس نے ایک دن میں مانگے ہیں انہیں کسی تقریب میں جانا ہے''۔ پڑوسن نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''! میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نہ ہوتیں تو میں کب کہ مر کھپ گئی ہوتی۔ آپ ہی نے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ گھر گھر سے کپڑے لا کر دیے تا کہ عزت سے روٹی کما سکوں۔ میرا ہر موئے تن آپ کے احسانوں تلے دبا ہوا ہے''۔

''نہ بیٹی نہ۔ ایسا نہیں کہتے۔ میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ایک پڑوسی کا حق''۔ پڑوسن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور دعا دے کر باہر نکل گئیں۔

میں نے جلدی جلدی ناپ لے کر کپڑے تراشے اور سلائی مشین لے کر بیٹھ گئی۔ دوپہر تک میں نے قمیض سی لی اور پڑوسن کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کام میں اس طرح ڈوب گئی تھی کہ مجھے کھانا پکانے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ اب جب کام ختم ہوا تو بھوک کا احساس بھی

جاگ اٹھا۔ میں جلدی جلدی پیاز کا سلاد بنانے لگی تا کہ نان کے ساتھ کھا سکوں۔

ابھی بھی کھانا کھا ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ایک نظر پلنگ پر پھیلے ہوئے سلے' ادھ سلے کپڑوں پر ڈالی اور سمجھ گئی کہ پڑوسن کپڑے لینے آئی ہے۔ میں نے نوالہ نگل کر کہا۔ ''آ جائیے! دروازہ کھلا ہوا ہے''۔

دروازہ کھلا تو میں بری طرح چونک گئی۔ چچی جان ایک مرد کے ساتھ اندر آ گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک عورت بھی تھی۔ میں نے جھوٹی پلیٹ ہٹالی اور ہاتھ دھو کر انہیں سلام کیا۔

اجنبی مرد نے بغور میرا جائزہ لیا۔ میں نے بھی انہیں سرتاپا دیکھا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بہت اچھے لگے تھے۔ ان کے خدوخال میں کچھ ایسے تاثرات پوشیدہ لگتے تھے جس سے احساس ہوتا تھا کہ ان کہ زندگی کسی نہ کسی وجہ سے بڑی محرومیوں کا شکار رہی ہے۔

انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ ''تمہارا شوہر اصغر یا اس کی ماں نے مڑ کر خبر نہ لی پھر بھی تم نے جس حوصلے سے ایک سال کا عرصہ گزارا اسی بات نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں نے ہی امی سے کہا تھا کہ وہ تمہیں راضی کریں''۔

میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ انہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ہے۔ لگتا ہے وہ میری جاسوسی کرتے رہے ہیں۔

''ارے یہ عقیل نجیبی ہے' پہچانا؟ میرا بیٹا ہے۔ چار سال پہلے اس کی بیوی بچے کی پیدائش کے وقت مر گئی۔ تب سے وہ دنیا کی ہر خوشی سے کنارہ کش ہو گیا ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم اسے زندگی کی طرف کھینچ لاؤ۔ بولو بیٹی یہ کام کر سکو گی؟'' چچی نے کہا۔

میں نے سر جھکا لیا۔ ان کی بات نے مجھے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا ایک جانب خوشیوں کی نوید تھی اور دوسری جانب ہڈی توڑ محنت' گدھ جیسے مردوں کی جلتی ہوئی نگاہیں اور عدم تحفظ کا احساس۔ میں نے سر اٹھائے بغیر دھیرے سے کہا۔ ''میں راضی ہوں''۔

اگلے ہی دن چچی نے مجھے دلہن بنایا۔ اور دوبارہ نکاح ہو گیا۔ اس بار میں عقیل نجیبی کی بیوی بنائی گئی تھی۔ عقیل صرف نام کا شوہر نکلا۔ واقعی وہ دنیا کہ ہر خوشی سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ ماں کے کہنے سے اس نے مجھے بیوی کا درجہ دے تو دیا مگر اسے میری پروا نہیں تھی۔ کبھی بھی ایک لفظ نہ بولا۔ خاموشی سے آ کر کمرے میں لیٹ جاتا تھا اور اس کی یہ خاموشی مجھے زہر لگتی۔ اس کی لاتعلقی دیکھ کر میرے دل میں ایک تیر سا پیوست ہو جاتا۔ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سہتے سہتے جب

میں عاجز آ گئی تو ایک دن دل کا غبار زبان پر آ ہی گیا۔ جیسے ہی وہ آ کر لیٹے میں نے کہا:

''میں آپ کی بیوی ہوں۔ کیا بیوی سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا کہ آپ کر رہے ہیں؟''

''تم میری امی کی پسند ہو انھی کے لیے بیاہ کر لایا ہوں۔ ان کی خدمت کرو یہ ہی بہت ہے۔ میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ میں نے بانو سے پیار کیا تھا۔ وہی میرے لیے سب کچھ تھی۔ وہ مر گئی تو میں بھی زندہ لاش بن گیا۔''

''یہی آپ کی بھول ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ کوئی کسی کے مرنے سے نہیں مرتا۔ زندگی سے فرار مردانگی نہیں ہے۔ مرد تو اسے کہتے ہیں جو حالات کا مقابلہ کرے۔ حالات کے آگے جھک جانے والے مرد نہیں ہوتے۔'' میں نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

عقیل اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا پھر بولے۔ ''تم کیا چاہتی ہو؟''

''مجھے بیوی کا مقام دیں۔ آخر کب تک ایک مردہ وجود میں کھوئے رہیں گے۔ آپ بھی مجھے قبول کر لیں۔''

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا۔'' عقیل نے کہہ کر کروٹ بدل لی۔

انسان اگر پہلا قدم اٹھا لے تو منزل قریب آتی چلی جاتی ہے۔ میری لگاتار کوشش نے بھی عقیل کے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ بنا دی۔ وہ اب میرے لیے بھی وقت نکالنے لگے۔ ان کی اس تبدیلی سے چچی بھی خوش ہوا ٹھیں۔

عقیل نجیبی بہت دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اس سفر کو طے کرنے میں انہوں نے ایک سال لگا دیا۔

عقیل نجیبی کو اپنی جانب راغب کرنے میں میری ایک پرانی بیماری خود بخود صحیح ہو گئی۔ اب اندھیرے سے مجھے خوف نہیں آتا تھا اور نہ دیواروں پر کوئی عکس بنتا بگڑتا دکھائی دیتا تھا۔ ذہن ہی تو وہ کارخانہ ہے جہاں غم خوشی اور خوف کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں تو صرف عقیل نجیبی باقی رہ گئے تھے اسی لیے باقی سب کچھ مٹ گیا تھا۔

اسی دوران میں میری طبیعت گری گری سی رہنے لگی۔ مجھے سست سست سا دیکھ کر ایک دن عقیل نجیبی بولے۔ ''میں نے محسوس کیا ہے کہ آج کل تم کچھ بیمار بیمار سی لگ رہی ہو؟''

''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں۔''

''یہ کام آپ کا ہے۔ میری تکلیف کا احساس آپ کو ہونا چاہیے۔ آپ کا فرض ہے کہ مجھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ بغیر آپ کی اجازت میں کیسے چلی جاؤں؟''

''بے وقوف کہیں کی۔ اگر ایسی بات تھی تو اشارہ ہی کر دیتیں۔ ٹھیک ہے چلو میرے ساتھ۔'' کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

رات کے آٹھ بجے ہم محلے کی ہی ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ انہیں نے چیک اپ کرتے ہی کہا۔ ''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ آپ ہر پندرہ دن میں ایک بار آ کر اپنا چیک اپ کراتی رہیں۔''

''کیوں، کوئی خاص بیماری ہے کیا؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''آں! ڈاکٹر عظمی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولیں۔ ''آپ کوئی بچی تو ہیں نہیں۔ کیا آپ کو اس کا احساس نہیں ہوا کہ آپ کے اندر ایک اور وجود پل رہا ہے۔''

ڈاکٹر عظمی کے انداز نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ واقعی میں ننھی بچی نہیں تھی۔ ایک پختہ عمر کی عورت تھی۔ دیکھنے والے تو کئی بچوں کی ماں سمجھتے تھے مگر میرے لیے تو یہ بالکل نئی بات تھی۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا ممکن ہے۔ خود کو ٹنڈ درخت سمجھنے والے کے لیے شادابی کی نوید حیرت کا ہی باعث ہے۔ میں گنگ رہ گئی تھی۔

''آپ اس طرح حیرت زدہ کیوں ہیں، کیا آپ کی خواہش کے خلاف ہوا ہے؟'' ڈاکٹر عظمی نے کہا۔

''جی..... جی نہیں۔ دراصل میری یہ دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی صرف اس لیے ٹوٹ گئی کہ میں بانجھ تھی۔''

''بانجھ تھی؟ اس کا کیا مطلب؟ اگر یہ سچ ہے تو آپ کے اندر یہ علامات کہاں سے آ گئیں۔ دراصل ہمارے معاشرے میں جہالت عروج پر ہے۔ لوگ بغیر سوچے سمجھے الزام عورت پر ڈال دیتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر کا چیک اپ کرا لیتیں تو یقیناً معاملہ الٹا نکلتا۔ پھر بھی آپ یہ ٹیسٹ کرا لیں۔'' کہہ کر ڈاکٹر نے سلپ بڑھا دی۔

عقیل نجیبی کی تو خوشی دیدنی تھی۔ وہ کھلے پڑ رہے تھے۔ بجائے گھرانے کے وہ مجھے

ریسٹورنٹ میں لے گئے۔

''میں بتا نہیں سکتا کہ اس خبر سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میری خواہش تھی کہ میرے کم سے کم چار بچے ہوں لیکن ایسا ہوا نہیں۔ میں صبر کر کے بیٹھ گیا تھا''۔ انہیں نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔

ریسٹورنٹ کے کھلے لان میں ایسی حرکت۔ میں تو کٹ کر رہ گئی۔ شرم کا بوجھ گردن پر اتنا بڑھ گیا کہ میں جھکتی چلی گئی۔

''بھئی مجھ سے کیسی شرم! ابھی تو میں گھر جا کر ایک ایک سے چیخ چیخ کر کہوں گا کہ میں باپ بننے والا ہوں۔''

ہم گھر لوٹ آئے۔ میں تو اپنے کمرے میں آ گئی لیکن وہ اپنی امی کے پاس چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں ان کی امی خوشی سے سرشار چہرہ لیے میرے پاس آ گئیں۔ انہوں نے بھی تصدیق چاہی تو میں نے شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس دن سے میری آؤ بھگت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ ٹیسٹ کی رپوٹ نے بھی تصدیق کر دی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزرتا چلا گیا اور میں ایک پیارے سے گول مٹول بچے کی ماں بن گئی۔ عقیل نجیبی نے اس بچے کا نام کفیل نجیبی رکھا۔

کفیل کے پیدا ہونے کی خبر میری پرانی ساس اماں یعنی اصغر کی ماں تک بھی پہنچ گئی۔ اور وہ مبارک باد دینے کے بہانے آ گئیں۔

''بیٹی! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔۔ تم میری عزت کرتی تھیں۔ پوتے کی چاہت میں، میں ایک بدذات کو لے آئی۔ وہ ایسی زبان دراز ہے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ بیٹی میں تو برباد ہو گئی''۔ وہ بین کر کر کے بولتی رہیں۔ ''اگر اصغر نے کبھی دو چار روپے میرے ہاتھ میں تھما دیے تو وہ کم ذات گھر کو سر پر اٹھا لیتی ہے۔ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اس کی زبان اتنی تیز ہے کہ وہ اصغر کو بھی منہ پر جواب دیتی ہے۔ کہتی ہے کہ تم نامرد ہو''

''قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ اب کیا کیجئے گا۔ صبر کیجئے۔'' میں نے دلاسہ دیا۔

''اے بیٹی صبر کیا کروں؟ یہ سوچ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ اس میں سارا قصور میرا ہے۔ اگر میں اصغر پر زور نہ دیتی تو وہ کبھی دوسری شادی نہ کرتا۔ میری عقل پر تو پردہ پڑ گیا تھا جو میں دوسروں کی باتوں میں آ گئی۔ کہا گیا تھا لڑکی گائے ہے گائے اور اب وہی لڑکی مجھے گھر سے باہر کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اصغر ٹوکتا ہے تو صاف کہتی ہے ''پہلے مرد بن کر آؤ پھر مردانگی دکھانا''۔ بیٹی! میں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں''۔

''اگر آپ کو وہاں زیادہ تکلیف ہے تو یہاں آ جائیں۔ عقیل نجیبی دل کے بہت اچھے ہیں۔ وہ اعتراض نہیں کریں گے''۔

''نہیں بیٹی! تم خوش رہو یہی بہت ہے۔ اگر میں یہاں آ گئی تو ضمیر کی آگ میں جل مروں گی۔ مجھ سے تو ایسا نہیں ہو گا''۔

ان کے منہ پر تو میں نے کچھ نہیں کہا مگر ان کے جاتے ہی میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔ میرے ساتھ برائی کرنے کے والے کا انجام بھی تو نے برا کیا''۔

ان کی برائی میرے حق میں نعمت ثابت ہوئی تھی۔ میری زندگی بالکل بدل گئی تھی۔ دولت، عزت ہر چیز میں اب میں اصغر سے بہت آگے تھی۔ عقیل نجیبی بھی مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگے تھے۔ زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی کہ وہ بھیانک رات آ گئی۔

اس رات میں بے خبر سو رہی تھی کہ یکا یک میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کفیل کو بھوک لگی ہے اور وہ رویا ہے تبھی میری آنکھ کھل گئی ہے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ کفیل بے خبر سو رہا ہے۔ پھر میں نے شک رفع کرنے کے لیے اسے دودھ پلانے کی کوشش کی تو اس نے کروٹ بدل لی۔ میں نے بھی پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی تبھی مجھے احساس ہوا کہ کیوں میری آنکھ کھلی ہے۔ وہ بہت ہلکی مگر واضح آواز تھی۔ کہیں نزدیک ہی کوئی بچہ سسک رہا تھا۔ میں نے پھر کفیل کی طرف دیکھا لیکن وہ تو نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں سی ہونے لگی۔ میں جس بنگلے میں رہ رہی تھی، وہ ہزار گز پر محیط تھا۔ میرا کمرا مین گیٹ سے کافی فاصلے پر تھا۔ پچھلی کھڑکی ان میں کھلتی تھی اور لان کی دیوار کھڑکی سے بہت دور تھی دیوار کے پار اگر کوئی بچہ روتا تو بھی اتنی واضح آواز یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کھڑکی سے بالکل قریب کوئی بچہ بیحد سسک رہا ہے۔ سسکیاں کبھی تیز ہو جاتیں کبھی ہلکی۔ اس آواز میں ایسا کرب تھا کہ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ میں بری طرح پریشان ہو اٹھی تھی۔ دل زور زور سے

دھڑکنے لگا تھا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تبھی عقیل کسمسائے۔ میں نے خوف سے لرزتا ہوا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا۔

مرد کا لمس حوصلے کا ضامن ہے۔ مجھے بھی رگ رگ میں حوصلہ محسوس ہوا اور میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ سسکیوں کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً کوئی بچہ لان میں کھڑکی کے نزدیک بیٹھا ہے۔ اس یقین کے ساتھ میں نے عقیل نجیبی کے بازو کو پکڑ کر ہلایا۔ ''اے سنئے!'' انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچی نیند سے جاگے ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''باہر دیکھئے۔ کوئی بچہ رو رہا ہے''۔

''بچہ رو رہا ہے؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا پھر بولے۔ ''کہاں؟''

''باہر..... کھڑکی کے نیچے''۔

''تمہارا وہم ہوگا۔ مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی''۔

اب میں نے غور کیا تو وہ آواز تھم چکی تھی۔ ہر جانب سکوت طاری تھا۔ صرف جھینگروں کی جھائیں جھائیں سنائی دے رہی تھی۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہم کیسے کہہ دوں۔ آنکھ کھلے کے بعد بھی کافی دیر تک میں نے وہ آواز سنی تھی۔ یہ سماعت کا دھوکا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اب اسے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اس لیے میں لیٹ گئی۔ لیکن نیند تھی کہ آنکھوں سے بری طرح روٹھی ہوئی تھی۔ میں نے تنگ آ کر لحاف کو سر تک کھینچا اور منہ ڈھک کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ پراسرار سسکیاں پھر سنائی دینے لگیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس سرد برفیلے موسم میں بھی مجھے پسینا آنے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان سسکیوں سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ آخر یہ ہے کون اور رہ رہ کر کیوں رہ رہا ہے۔ تبھی میرے دماغ نے تاویل دی۔ میرے بنگلے سے کچھ دوری پر ایک میدان ہے۔ اس میدان میں خانہ بدوشوں نے خیمے لگا رکھے ہیں شاید انہیں کا بچہ بھٹک کر ادھر آ گیا ہو۔ اس سوچ نے تقویت دی۔ خوف کا سایہ ذہن سے چھٹ گیا اور میں بستر سے اتر کر کھڑکی کے نزدیک پہنچی۔ شیشے جڑے پلڑے بند تھے۔ میں نے چٹخنی گرائی اور پلڑے کو سرکا دیا۔ رولر لگے کھڑکیوں کے پلڑے ہٹتے ہی برفیلی ہوا کا سرد جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔

''اس سردی میں تو وہ بچہ اکڑ کر مر جائے گا''۔ میں نے سوچا۔ ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا تھا۔ میں نے متلاشی نظروں سے نیچے جھانکا۔ لان میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ ڈیکوریشن لائٹ کی روشنی پورے لان کو منور کر رہی تھی۔ اتنی روشنی میں تو بلی بھی نظر آ جاتی مگر وہ بچہ نظر نہ آیا۔ اس کی سسکیاں بھی بند ہو گئی تھیں۔ خوف اور حیرت نے ایک بار پھر مجھ پر دھاوا بول دیا۔ میں جلدی سے کھڑکی بند کی اور واپس آ کر لیٹ گئی۔ اب میرا ذہن واقعی بری طرح چکرا گیا تھا۔ میں کافی دیر تک اسی بات پر غور کرتی رہی پھر پتا نہیں کب نیند نے تھپکیاں دے کر سلا دیا۔

صبح جب اٹھی تو رات کی بات پھر سے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ کفیل میری گود میں تھا۔ میں اسے ہولے ہولے ہاتھوں پر جھلاتی ہوئی کھڑکی کے نیچے پہنچی اور بغور وہاں کی زمین کا معائنہ کیا۔ گھاس کی وجہ سے کسی قسم کا نشان نظر نہیں آیا اور میں واپس ہو گئی۔ ''رات کے سناٹے دور کی آواز بھی بہت قریب محسوس ہوتی ہے''۔ یہ سوچ کر میں نے خود کو مطمئن کر لیا۔

اس دن بچے کو ٹیکا لگوانے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اس لیے میں رات والے واقعے پر زیادہ دھیان نہ دے سکی اور ساس اماں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ وہاں سے آئی تو کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ تھکن شب بیداری کا نتیجہ تھی۔ اتنی دیر تک جاگتی رہی تھی ناں! میں سیدھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

ابھی لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ عقیل کی اماں آ گئیں۔ انہوں نے مجھے لیٹے ہوئے دیکھا تو بولیں۔ ''بیٹی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''تھکن محسوس ہوئی تو لیٹ گئی''۔ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلنا نہیں ہے کیا؟''

''کہاں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے یاد نہیں ہے۔ عقیل کے دوست کی شادی ہے۔ عقیل آتا ہی ہوگا فوراً تیار ہو جاؤ۔ اب وہ ہر کام میں دلچسپی لینے لگا ہے تو تم سستی دکھانے لگیں۔ خدا کے لیے ایسی غلطی نہ کرنا کہ وہ پھر سے پرانی ڈگر پر لوٹ جائے۔ اتنی مشکلوں سے تو وہ زندگی کی طرف لوٹا ہے۔ تمہاری کوششوں اور کفیل کی محبت نے اسے سنبھال دیا ہے اسے پھر سے اندھیرے میں مت دھکیلنا''۔ اماں نے یاد دہانی کرائی۔

اماں کی بات صحیح تھی۔ میں اپنی تھکن بھول گئی اور کپڑے نکال کر استری کرنے لگی۔

میں پہلی بار بڑے لوگوں کی پارٹی میں آئی تھی۔ عقیل کی زندگی میں آنے سے پہلے میں اس طبقے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آج جب ان لوگوں کے درمیان آئی تو عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فلموں کا منظر حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہو۔ بالکل ویسا ہی تو منظر تھا۔ ہر طرف رزق برق لباس' کھنکی ہوئی ہنسی' زندگی سے بھرپور ماحول' شاہی خاندان کے لوگ بھی تھے۔ میں اس ماحول میں کھوسی گئی تھی۔ عورتوں سے عقیل کے دوست کرامی نے تعارف کرایا تھا جو ''ہائی'' ''ہیلو'' کر کے الگ جا بیٹھی تھیں۔ میں اتنی بھیڑ میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اکیلے پن کا احساس دھیرے دھیرے شدید ہوتا جا رہا تھا۔ میں ذہن کو اس احساس سے نجات دلانے کے لیے کبھی اس ٹیبل کی طرف دیکھتی اور کبھی اس ٹیبل کی طرف۔ ہر طرف قہقہے تھے' صرف میرے ٹیبل پر خاموشی تھی۔ عقیل بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنے دوستوں کے پاس چلے گئے تھے۔ میری بوریت آہستہ آہستہ عروج پر پہنچ رہی تھی کہ میں بری طرح چونک گئی۔ نزدیک ہی کوئی بچہ سسک رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں بچے کی سسکی مجھے خوف میں مبتلا کرنے لگی۔ میں بری طرح چونک گئی اور حیرت بھری نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ تہران کے عام گھروں کی طرح اس بنگلے میں بھی لان تھا اور لان کی طرف کروٹے کی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں کی باڑ کے پاس ایک چھوٹا بچہ کھڑا سسک رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ادھر کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ میں حیرت اور خوف سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس جانب روشنی قدرے ہلکی تھی اس لیے اس بچے کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ تبھی وہ بچہ کچھ آگے بڑھا تو میں خوف سے سکڑ گئی۔ سردی کے موسم میں بھی پسینے کی دھار ابل پڑی۔ بات تھی ہی ایسی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا' اس کی یہی حالت ہوتی۔ میری ہی طرح اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ میں نے آنکھوں کو مل مل کر دیکھا مگر یہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ میں چیخ کر وہاں سے بھاگنے ہی والی تھی کہ عقیل آ گئے۔ انہیں دیکھ کر مجھے قدرے حوصلہ ملا۔

''کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے؟'' ''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں میں..... میں ٹھیک ہوں۔ چلو..... یہاں سے۔ میری طبیعت ٹھک نہیں ہے''۔

''یہ کیا الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی ہو؟'' میرے انداز پر وہ چونک گئے۔

''ہاں میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے کسی ڈاکٹر پاس لے چلو''۔ میں نے کہہ کر کروٹے کی جھاڑیوں پر نظر ڈالی۔ اب بچہ وہاں نہیں تھا۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔

عقیل نے جا کر صاحب خانہ سے معذرت کی اور مجھے لے کر چل پڑے۔

ہم لان سے باہر آئے۔ عقیل نے کار اسٹارٹ۔ ہم سوار ہو کر اپنے گھر پہنچے۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس معصوم کی روح مجھ سے انتقام لینے کی کوشش میں ہے۔ میں نے جو گناہ کیا ہے' اس کی سزا مجھے ملنے ہی والی ہے۔ میں بری طرح خوف زدہ ہو چکی تھی۔''

زریں کچھ ایسے انداز میں اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی کہ سلمان ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں گڑائے اس کی باتیں بغور سن رہا تھا۔

زریں اپنی دھن میں خود بیتی سنائے جا رہی تھی۔ ''عقیل لوٹتے وقت ایک ڈاکٹر کے پاس رکے تھے۔ میں نے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے ٹرخا دیا تھا۔ اس نے جو دوائیں دی تھیں انہیں میں نے رکھ تو لیا تھا مگر انہیں استعمال کرنے کے مطلق ارادہ نہیں تھا۔ گھر آ کر بھی میں کافی دیر تک الجھی رہی۔

اس رات پھر وہی کل جیسا واقعہ ہوا۔ میں بے خبر سو رہی تھی کہ یکا یک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ آج پھر وہی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں لیکن ایک فرق بھی تھا۔ آج وہ سسکیاں کھڑکی سے نہیں دروازے سے آ رہی تھیں۔ میں خوف زدہ نظروں سے ادھر دیکھ رہی تھی کہ دروازے کی چٹخنی گری اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ وہی بچہ کھڑا تھا۔ جسے میں نے قتل کیا تھا۔ اس کے بدن پر وہی لباس تھا جو اس نے مرتے وقت پہن رکھا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ پھر بند ہو گیا۔

''تو..... تم..... تم کیوں آئے ہو؟'' میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

''میں تمہارے بچے کو ساتھ لے جاؤں گا''۔ اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہے۔

''نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے''۔ میں نے کفیل کو سینے سے چمٹا کر کہا۔

''مجھے کون روکے گا۔ تم یا تمہارا یہ بے بس شوہر''۔ اس نے عقیل کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے مڑ کر عقیل کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ میں نے لاچاری کے عالم میں چیخ کر کہا۔ ''بھاگ جاؤ''۔

میری چیخ اتنی زوردار تھی کہ عقیل کے ابو اور امی دوڑے آئے۔ بند دروازے پر دستک شروع ہوگئی۔ اماں بلند آواز میں پوچھ رہی تھیں۔ ''کیا ہوا عقیل؟ عقیل بیٹے! دروازہ کھولو''۔

دروازہ دھڑ دھڑانے پر عقیل بھی اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ شاید میرے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں باقی تھیں۔ کیوں کہ ان کی آنکھوں میں اضطراب ابھر آیا تھا لیکن انہوں نے کچھ پوچھا نہیں جلدی سے اٹھ کر دروازے پر پہنچے اور چٹخنی کھول کر کھڑے ہوگئے۔

''کیا ہوا؟ دلہن چیخی کیوں تھی؟'' اماں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''پتا نہیں میں تو بے خبر سو رہا تھا۔ شاید نیند میں ڈر گئی تھی۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا!'' اماں نے مجھ سے پوچھا۔

میں جواب میں پوری بات بتانا چاہتی تھی مگر خوف نے مجھے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ زبان بھی ساتھ نہیں دے رہی تھی اور دل تھا کہ زور زور سے دھڑکے ہی جا رہا تھا۔ اب تک ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ٹھنڈی لہر دوڑ رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل ہاتھ اٹھا کر صرف اتنا کہا۔

''وہ..... بچہ..... ادھر''۔

اس چھوٹے سے جملے کو سن کر عقیل کے ابو کھڑکی کی طرف بڑھے اور بغور زمین پر کچھ دیکھنے لگے۔

اتنی دیر میں میری حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی ہو۔ ابو جھک کر فرش پر کیا دیکھ رہے ہیں یہ دیکھنے کے لیے میں بھی کفیل کو لٹا کر ان کے پاس چلی آئی۔ فرش پر واضح نشان ثبت تھا۔ اس نشان کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن پھر بڑھ گئی۔ صاف ستھرے فرش پر کیچڑ میں سنے ہوئے پیروں کے نشان تھے۔ کسی چھوٹے بچے کے پیروں کے نشان۔

''اس نشان سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ کوئی بچہ آیا تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ نشان کسی تین چار سال کے بچے کے ہیں، وہ اتنی اونچی کھڑکی پر چڑھا کیسے؟'' عقیل کے ابو نے کہا۔

''پتا نہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔ کل میں نے بچن سے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ لان میں کھڑا رو رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ گیٹ سے اندر کیسے آیا۔ میں اسے بھگانے کے

لیے لان میں نکلی تو وہ بچہ نظر نہیں آیا۔ پتا نہیں وہ کس کا بچہ ہے جو اس طرح گھس آتا ہے''۔ اماں بولیں۔

''بچہ!..... ایک بچے کو کل میں نے بھی دیکھا تھا۔ میں کپڑے بدل رہا تھا کہ کھڑکی سے باہر نظر چلی گئی۔ لان میں ایک ڈھائی تین سال کا بچہ کھڑا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سسک بھی رہا تھا۔ وہ کون ہے اور ہمارے احاطے میں کیسے داخل ہوا۔ یہ جاننے کے لیے میں فوراً ہی باہر نکل آیا تھا مگر وہ نظر نہ آیا''، عقیل نجیبی نے کہا۔

اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ مقتول میرے گھر آنے لگا ہے۔ اس سے آزادی کیسے نصیب ہوگی، اس بات نے میرے ذہن کو الجھا رکھا تھا۔ خاص طور پر اس بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا کہ وہ میرے کفیل کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ ''میں اپنے لختِ جگر کو کیسے اس سے محفوظ رکھوں، کیا اپنے گناہ کا اقرار اپنے شوہر کے سامنے کرلوں؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

''بے وقوف عورت! اگر تیرے کالے کرتوت سے پردہ اٹھ گیا تو لوگ تجھ پر تھوکیں گے۔ یہ آرام و آسائش، محبت و شفقت قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ جتنی جلدی ممکن ہو کسی اچھے عامل سے رابطہ کرلے لیکن اسے بھی حقیقت مت بتانا کیوں کہ کسی کی پیشانی پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیسا ہے۔ تُو تو عامل کامل سمجھے اور وہ اشتہاری عامل نکل آئے اس لیے پوری دنیا سے اپنا پاپ چھپائے رکھ''۔ میرے دماغ نے مشورہ دیا۔

میں نے کافی دیر غور کرنے کے بعد شوہر کو ہمراز بنانا مناسب سمجھا۔

''سنتے ہیں جی!'' میں نے برسرِ مطلب آنے کے لیے تمہید باندھی۔

''کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مجھے تو یہ کسی روح کی کارستانی لگتی ہے''۔

''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو''۔ انہوں نے کہا۔ ''دنیا اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہی ہے اور تم روحوں کا رونا لے بیٹھی ہو''۔

''نہیں جی! وہ روح تھی۔ کسی بچے کی روح۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے بچے کو لینے آئی ہوں۔ آپ کسی عامل سے رابطہ کریں۔ وہی کچھ کرسکتا ہے''۔ میں نے حقیقت بتا کر بھی اصل بات پوشیدہ رکھی۔

''خدا کے لیے کان نہ کھاؤ۔ میں روح ووح پر یقین نہیں کرتا''۔

''اچھا تمہیں روح پر یقین نہیں ہے''۔ایک کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی اور میں چونک گئی۔آواز کے مخرج کی جانب دیکھا تو میرے رونگٹے پھر کھڑے ہو گئے۔وہی بچہ کمر پر ہاتھ رکھے سینہ تانے کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔عقیل بھی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ اس نے کہا۔''اچھی طرح سے مجھے دیکھ لو۔میں ایک عرصے سے بھٹک رہا ہوں۔مجھے کسی پل قرار نہیں ہے اور مجھے بھٹکنے پر مجبور کیا ہے اس عورت نے۔یہ خونی عورت۔میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یہ تا زندگی یاد رکھے گی''۔

خوف نے میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔میں چیخنا چاہتی تھی مگر حلق خشک ہو چکا تھا۔حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔زبان اینٹھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔سرد موسم میں بھی پسینے سے کپڑے جسم سے چپکتے ہوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔لاؤ کفیل کو مجھے دے دو ورنہ میں تم پر بھی زندگی عذاب کر دوں گا''۔اس بچے نے عقیل سے کہا۔

''تم.....تم کون ہو؟''عقیل نے پوچھا۔

تبھی میرے سخت الشعور میں چھپی ایک بات مجھے یاد آ گئی۔لوگ کہتے ہیں کہ آیت الکرسی کا ورد ایسے موقع پر کرنا چاہیے اور میں نے نسبتاً بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔شاید وہ بچہ ابھی کچھ دیر رکتا اور اس کا رکنا میرے حق میں بہت برا تھا،میرا گناہ کھل کر سامنے آ جاتا لیکن آیت الکرسی کا پڑھنا تھا کہ وہ بچہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

بچے کا نظروں سے اوجھل ہونا میرے حوصلے کو قوی کر گیا۔میں نے فوراً ہی عقیل سے کہا۔''خدا کے لیے آپ ابو سے کہیں وہ کسی عامل سے بات کریں۔اب تو آپ کو یقین آ گیا ہو گا کہ یہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے۔اگر میں آیت الکرسی نہ پڑھتی تو آج غضب ہو جاتا۔وہ میرے لال کو چھین کر لے جاتی''۔

میں نے جوش و جذبات میں عنایت کو سینے سے بھینچ لیا۔وہ معصوم ننھی سی جان پیار کو افتاد سمجھ کر زور زور سے رونے لگا۔اس کی آواز بند دروازے کو پار کرتی ہوئی اماں کے کمرے تک پہنچ گئی۔پوتے کا رونا وہ کیسے برداشت کرتیں؟وہ تیر کی طرح پہنچیں اور دروازہ دھڑ دھڑا کر بولیں۔''کیا ہوا؟کفیل کیوں رو رہا ہے؟''

میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور انہیں اندر بلایا۔

''کیا ہوا؟تمہارے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی کیوں ہے؟کیا عقیل نے کچھ کہا ہے؟اماں نے بیٹے کی طرف خشمناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

وہ بچہ ابھی ابھی پھر آیا تھا۔وہ روح ہے ایک بھٹکی ہوئی روح''۔یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

''جی اماں!وہ بچہ نہیں کسی بچے کی روح ہے اور میرے لاڈلے کو مجھ سے چھیننے کے لیے آتی ہے۔خدا کے لیے کچھ کریں ورنہ ہم مر جائیں اماں!''میں نے اپنے لہجے کو غمناک بنا کر کہا۔

''پوری بات بتاؤ''۔کہہ کر وہ وہیں بیٹھ گئیں۔

میں نے بچے کی سسکیوں سے لے کر اس کے آنے تک کا قصہ سنا دیا۔اماں کے چہرے پر بھی پریشانی ابھر آئی۔کافی دیر تک وہ سر جھکائے سوچتی رہیں۔پھر اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ہم لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ابا اندر آ گئے انہوں نے بچے کے بارے میں دو چار سوال کیے پھر ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی عقیل بولے۔''ابو ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ان کے ایک دوست ہیں عیسیٰ دوجدانی!وہ عملیات وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔شاید ابھی وہ انہیں ہی فون کر رہے ہوں گے''۔

عقیل کا اندازہ درست تھا۔ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باہر گیٹ پر کسی گاڑی کا ہارن بجا۔میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔چوکیدار کے ساتھ ایک صاحب پورچ کی جانب بڑھتے آ رہے تھے۔شاید انہوں نے گاڑی باہر ہی کھڑی کر دی تھی۔وہ پچاس پچپن سال کے ہوں گے۔ان کے چہرے پر مٹھی سے بڑی داڑھی تھی جس پر حنا لگی تھی۔بالوں پر بھی مہندی کا رنگ تھا کچھ لمحوں بعد وہ ابو کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔انہوں نے اندر آتے ہی مجھ سے کہا۔''بیٹی بلا خوف مجھے تمام باتیں بتا دو''۔

''اس سے کیا پوچھتے ہو مجھ سے سنو۔میں تمہیں خود ہی ساری بات بتا دیتا ہوں''۔وہ بچہ پھر آ گیا تھا اور سینہ تانے کھڑا تھا۔بالشت بھر کے لڑکے نے جس انداز میں کہا تھا،اسے سن کر میں سکتے میں رہ گئی تھی۔

وہ بچہ جس کے سر کہ پتھر مار کر بھرتا بنا دیا تھا وہ مرنے کے بعد اتنا تیز طرار ہو جائے گا' یہ بات یقین سے باہر تھی۔میں اسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی کہ اس نے پھر کہا۔''مولوی

صاحب اپنی عزت پیاری ہے تو واپس چلے جاؤ ورنہ خواہ مخواہ کی بنی بنائی عزت بگڑ جائے گی"۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس بچے کہ آجانے سے کمرا یخ ہو جاتا تھا۔ عجیب سی سردی جو ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' پورے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ میں اپنے بدن میں لرزہ سا محسوس کر رہی تھی کہ ابو کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر اس سحر زدہ کیفیت سے ابھر آئی۔ ابو نے کہا۔ "عیسیٰ صاحب آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ اپنی اوقات سے بڑھ رہا ہے کچھ کیجئے"۔

"تم فکر نہ کرو اس کا انتظام میں کروں گا۔ پہلے میں اس کی گہرائی ناپ لوں"۔ کہہ کر عیسیٰ صاحب نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس میں لگے پھندنے کو کھینچ کر بٹوے کو کھولا۔ پھر اس میں سے کسی چیز کے برادے کو چٹکی سے نکالا اور اسے اس بچے کی جانب اچھال دیا۔

وہ بچہ اس طرح سے اچھلا جیسے اس کے جسم میں اسپرنگ فٹ ہو۔ وہ ہوا میں قلا بازیاں کھا کر کئی فٹ دور جا کر گرا لیکن فوراً ہی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مولوی! ہوش کے ناخن لو۔ تمہارے اندر اتنا علم نہیں ہے کہ مجھے قابو میں کر لو۔ مجھے جس شخص نے اپنے ساتھ رکھا ہے' وہ بہت بڑا عامل ہے۔ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے۔ وہ جب چاہے' جسے چاہے شکست دے سکتا ہے۔ مجھ سے ٹکرانے کی غلطی نہ کرنا ورنہ نقصان میں رہو گے"۔

"اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ وہ مالک کل ہے مگر مجھے یقین ہے' فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ شر کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو شکست اس کا مقدر ہوتی ہے"۔ عیسیٰ صاحب نے کہا۔

"لو خود دیکھ لو قوی کون ہے"۔ کہہ کر بچے نے ہوا میں قلا بازی کھائی' پرندے کی طرح اڑتا ہوا آیا اور عیسیٰ صاحب کے سینے پر اپنے سر سے اس زور کی ٹکر ماری کہ عیسیٰ صاحب اچھل کر دور جا گرے۔ ان کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اور تیز چیخ سے کمرا گونج اٹھا تھا۔ وہ تڑپ سے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے اور بچہ شان سے سر اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

ہم حیرت سے بت بنے اسے باہر نکلتا دیکھتے رہ گئے۔

سب سے پہلے ابو کو ہوش آیا تھا۔ وہ عیسیٰ صاحب کی طرف لپکے اور انہیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں کوشش کرتے دیکھ کر عقیل آگے بڑھے اور عیسیٰ صاحب کو ڈنڈا ڈولی کر کے بستر پر لے آئے۔ ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر انہیں ہوش میں لایا گیا۔

"بھائی! یہ بچہ میرے بس کا نہیں ہے۔ تم ایسا کرو کہ عروس کو لے کر اصفہان چلے جاؤ۔ وہاں میرے استاد محترم ہیں۔ ان کے نام میں خط لکھ دیتا ہوں۔ وہی اسے ٹھیک کریں گے۔ اس بدبخت کو اس کی اوقات بتائیں گے"۔ عیسیٰ صاحب نے کہا۔

"آخر وہ کون ہے؟" امی نے پوچھا۔

"وہ کوئی ایسا بچہ ہے جو غیر طبعی موت مرا ہے۔ جو غیر طبعی موت مرتا ہے اس کی روح بھٹکتی رہتی ہے۔ کچھ ایسے ناہنجار بھی اس دنیا میں رہتے ہیں جو گندے علم کے ذریعے گندے مقاصد حاصل کرنے میں زندگی کے قیمتی مہ و سال گنواتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت کو ٹھکراتے رہتے ہیں اور خدمت خلق کے بجائے زحمت خلق کا موجب بنتے ہیں۔ کسی ایسے ہی بدبخت نے اس معصوم کی روح کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اب اسے اپنے کسی غلط مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے"۔

"اس کا حل؟" میں نے پوچھا۔ دراصل مجھے اس خوف نے گھیر لیا تھا کہ کہیں انہیں میرے گناہ کا علم تو نہیں ہو گیا۔ میں نے ایک جعلی عامل کے پھندے میں پھنس کر جو گناہ کر ڈالا تھا' اس کی سزا تو مجھے ضرور ملے گی مگر میں بے عزتی برداشت کرنے پر تیار نہ تھی۔ اسی لیے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"اس کا حل میں بتا چکا ہوں۔ تم اصفہان چلی جاؤ وہاں میرے حضرت ہیں۔ ان کے پاس علم کا خزانہ ہے وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ تمہاری مشکلات کا حل انہی کے پاس ہے وہی تمہاری مدد کریں گے"۔

"ہم کب تک وہاں پہنچ جائیں"۔ عقیل نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے صبح ہوتے ہی تم دلہن کو لے کر چلے جاؤ"۔ عیسیٰ صاحب نے کہا۔

ہم اس رات ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکے۔ فجر کی اذان ہوتے ہی تیاری شروع کر دی۔ تیاری کے نام پر میں نے اپنے اور عقیل کے دو چار جوڑے رکھ لیے اور گھر سے نکل پڑی۔

اسٹیشن تک پہنچنے تک میرا دل ہولتا رہا۔ خوف تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں وہ بچہ میرا راستہ نہ روک لے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر عقیل نے ٹکٹ خریدا ٹرین تیار کھڑی تھی۔ مجھے لے کر وہ ایک ڈبے سوار ہو گئے۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی مگر مجھے قرار نہ تھا۔ میں عالم بے قراری میں کبھی ادھر دیکھتی تو کبھی ادھر۔ کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی اور کبھی خواہ مخواہ عقیل سے الجھتی۔ اسی طرح خود سے لڑتی جھگڑتی اصفہان تک پہنچ گئی۔

اصفہان اسٹیشن پر اترنے کے بعد عقیل نے کہا۔ ''بھئی ہم تو آ گئے ہیں لیکن حضرت جی کا پتا کس سے پوچھیں۔ یہ شہر تو میرے لیے بالکل نیا ہے''۔

پہلے باہر تو نکلیں۔ عیسیٰ چچا نے جو پتا لکھ دیا ہے وہ ٹیکسی والے کو دکھا دیجئے گا''۔ میں نے کہا۔

ہم پلیٹ فارم سے باہر نکلے۔ ابھی عقیل سٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے راستہ روک لیا۔

''سنئے! کیا آپ کا نام عقیل نجیبی ہے اور آپ تہران سے آئے ہیں''۔

''جی..... جی ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے حضرت جی نے بھیجا ہے انہوں نے آپ کا حلیہ بتایا ہے۔ چلئے کار لایا ہوں''۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور مڑ گیا۔

اس کی بات پر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ جس کی شکل ہم نے دیکھی نہیں تھی اس نے ہمارا حلیہ کیسے بتا دیا۔ یقیناً وہ سچا عالم ہے اس خیال نے مجھے ایک نیا حوصلہ دیا تبھی ایک خیال نے میری خوشیوں پر اوس ڈال دی۔ میں سہم گئی تھی۔ جو شخص بغیر دیکھے ہمارا حلیہ بتا سکتا ہے' وہ میرے گناہ سے بھی واقف ہو گیا۔ میں اس سے نظریں کیسے ملاؤں گی۔

جتنی تیزی سے کار بھاگ رہی تھی اس سے زیادہ تیز میرا دماغ سوچ رہا تھا۔ میں اپنے آپ سے برسرِ پیکار تھی۔ تبھی ایک بڑے سے دو منزلہ مکان کے آگے کار رک گئی۔

''آیئے! حضرت جی منتظر ہوں''۔ اس شخص نے نیچے اتر کر کہا۔

ہم کار سے نیچے اتر آئے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی ایک بڑا سا کمرا تھا۔ جس میں سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور آخری سرے پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک بزرگ صورت صورت ہستی بیٹھی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ ''آؤ..... مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم لوگ آ رہے ہو اسی لیے میں نے حبیب کو بھیج دیا تھا۔ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''جی..... جی نہیں''۔ عقیل نے کہا۔

''بیٹی تم میرے قریب آ کر بیٹھو''۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے میرے سر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا پھر بولے۔ ''عیسیٰ نے جوں ہی میرا نام لیا۔ مجھے یاد کیا میں تمہارا انتظار کرنے لگا۔ جب تک تم لوگ یہاں تک پہنچے میں یہاں سے حصار کھینچتا رہا تبھی تو تم لوگ بخیریت یہاں تک پہنچ گئے ورنہ وہ بد بخت تمہیں کبھی یہاں تک پہنچنے نہیں دیتا''۔ وہ کچھ دیر کے لیے رکے اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولے۔ ''بیٹی! یہ دنیا فانی ہے زندگی ایک ایسی ڈھلان ہے جس پر صرف پھسلن ہی پھسلن ہے۔ اس پر خطر راہ سے جو بہ عافیت گزر گیا' وہی مسلمان ہے' سچا انسان ہے۔ تم نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر جو گناہ عظیم کر ڈالا ہے' اس کی معافی تو میں دلا نہیں سکتا مگر تمہاری حفاظت ضرور کروں گا کیونکہ تمہارا دشمن بدی کا ہرکارا ہے اور بدی سے لڑنا میرا فرض ہے''۔

''وہ..... وہ کون ہے۔ میرا دشمن کون ہے؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا۔

''دیکھو گی؟ لو دیکھو''۔ کہہ کر انہوں نے کچھ پڑھا پھر مجھ پر پھونک مار کر بولے۔

''اب آنکھیں بند کر لو''۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تبھی مجھے ایسا لگا کہ میری نگاہوں کے سامنے ایک لق و دق میدان ہے۔ دور دور تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پھیلی ہیں۔ میں ان جھاڑیوں کہ ہٹاتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہوں۔ تبھی میرے پیروں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ انسانی کھوپڑی تھی۔ اب جو میں نے غور کیا تو یہاں سے وہاں تک کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں بکھری ہیں۔ ان کھوپڑیوں بھرے میدان کے درمیان میں ایک خوب تندرست سا آدمی بیٹھا ہے۔ اس شخص کے سر پر ایک بھی بال نہیں ہے اور نہ جسم پر کپڑے۔ وہ صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگتا ہے۔ اس کی ہنسی بھی وہاں کے ماحول کی طرح بھیانک تھی۔ اس کے سفید چمکدار دانت بلکل بھیڑیوں کی طرح تیز اور نوکیلے تھے۔ وہ مجھے ساکت کھڑا دیکھ کر اٹھا اور میری جانب بڑھنے لگا۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم دیکھ کر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ میرے سینے پر وقدم رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''بچہ..... مجھے ایک اور بچہ چاہیے۔ اپنا بیٹا بھی مجھے دے دو۔ اسی طرح اس کا خون بھی کر دو''۔

میں گھبرا کر چیخ پڑی اور آنکھیں کھول دیں۔

''ڈرو نہیں بیٹی! وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ میں تو صرف اس کی جھلک دیکھ رہا تھا''۔ حضرت جی بولے۔

میرا دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔

''بیٹی! سب سے پہلے مجھے تو اس معصوم کی روح کو آزاد کرانا ہے۔ تم بھی گھر جا کر اس کی مغفرت کے لیے قرآن شریف پڑھ دینا''۔ حضرت جی نے مشورہ دیا۔ پھر زیر لب کچھ پڑھنے لگے کافی دیر کے بعد انہوں نے ایک کاغذ پر لکھا پھر اسے بتی بنا کر گھی کی کٹوری میں ڈبو دیا۔ اس بتی کو کٹوری سے نکالنے کے بعد انہوں نے ماچس کی تیلی دکھا دی۔ بتی نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ بتی کے جلتے ہی پورا کمرا بھیانک قسم کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہزاروں عفریت ایک ساتھ چلا رہے ہوں۔ ان میں ایک آواز زیادہ واضح تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ بند کرو اپنا عمل۔ میں توبہ کرنے پر تیار ہوں۔ مجھے جانے دو۔ میں اس عورت کو کبھی کچھ نہیں کہوں گا بالکل نہیں ستاؤں گا''۔

''اس عورت کو نہ سہی کسی دوسرے کو تو آزاد میں مبتلا کرے گا۔ میں تجھے کیسے آزاد چھوڑ دوں۔ میں تو کب سے تجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ مجھے انتظار تھا کہ کوئی آ کر مجھ سے مدد کے لیے استدعا کرے۔ اپنی جانب سے پہل کرنے کی اجازت ہوتی تو میں کب کا تجھے خاک میں ملا چکا ہوتا''۔ یہ کہہ کر انہوں نے کچھ پڑھا۔ اسی طرح انہوں نے کاغذ کی پرچی پر کچھ لکھ کر کئی پرچیاں بنائیں اور جلانے والے تھے کہ ایسا لگا کہ انہیں کسی نے زور سے ہوا میں اچھالا۔ وہ سیدھا چھت سے جا کر ٹکرائے تھے پھر نیچے گرے تھے۔ ان کا سر فرش سے ٹکرایا تھا اور تیز چیخ گونجی تھی۔ میں ہی نہیں عقیل بھی خوف سے کانپ اٹھے تھے۔ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کے ارادت مند دوڑ پڑے تھے۔ گویا اس نے وہاں بھی ہمیں شکست دے دی۔ ہم بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ تب سے ہر روز وہ لڑکا آ کر دھمکاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔'' بولتے بولتے وہ رو پڑی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ فاکیہ ساتھ ہے۔ میں نے اس سے بڑبڑانے کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں تم بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟''

''وہ عامل قوی ہے لیکن اسے شکست دیا جا سکتا ہے۔'' اس نے کہا ''لیکن اس کے لیے تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔''

''تو میں ان لوگوں کو کہہ دوں کہ وہ مطمئن ہو جائیں؟''

''اور کیا..... کہہ دو کہ ان کو اس روح کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔'' فاکیہ نے ہنس کر کہا۔ ''فکر نہ کرو کمائی کا ایک نیا راستہ مل رہا ہے۔ پورے تہران میں تمہارا خوب نام ہو جائے گا۔ لوگ دور دور سے جھاڑ پھونک کرانے آئیں گے۔ خوب کمائی ہو گی۔ ایک سے ایک لڑکیاں بھی آئیں گی۔''

''آ گئیں نا اپنی اوقات پر۔'' میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ پھر میں نے نسبتاً اونچی آواز میں زریں سے کہا ''آپ بے فکر ہو جائیں اس بدروح سے نمٹنا اب ہمارا کام ہے۔'' پھر میں اٹھ کر باہر آ گیا۔

''آغائی سلمان! کیا رہا۔ کوئی حل تلاش کیا؟'' باہر آتے ہی خاتون خانہ نے دریافت کیا۔

''جی ہاں... اس پوری کارروائی میں جو بھی ملوث ہے میں اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ نہ صرف اس کا منحوس سایہ دور ہو جائے گا بلکہ اسے سزا بھی دوں گا۔''

''اللہ آپ کو جزا دے..... ہم تا زندگی آپ کے احسانمند رہیں گے۔'' وہ مدبانہ انداز میں بولیں۔

''ہمیں اجازت دیجیے..... دو چار دن میں ہی آپ خوش خبری سن لیں گی۔''

❁

اس گھر سے نکلتے ہوئے میں نے فاکیہ سے کہا۔ ''اب کرنا کیا ہے یہ بتاؤ؟''

''اس بچے کی روح کو جس بدبخت نے اپنے قبضہ میں کیا ہوا ہے اس سے بچے کی روح کو آزاد کرانا ہے۔''

''وہ ملے گا کہاں؟''

''اس بات کا پتا لگانا میرا کام ہے۔ تم گھر جا کر لمبی تان کر سو جاؤ۔ تمام کام سے فرصت پا کر میں تمہیں گھر سے لے لوں گی۔ میں اسی تلاش میں نکل رہی ہوں۔ وہ جہاں کہیں ہو گا میں اسے تلاش کر لوں گی۔''

''گویا شام تک کی چھٹی؟'' میں نے کہا۔

''نہیں بس کچھ ہی دیر میں میں لوٹ آؤں گی۔''

"ٹھیک ہے جاؤ۔" کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچ کر کچھ دیر سو لینا چاہتا تھا۔ اسی خیال سے میں تیز تیز چل رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں مجھے ننگا کر دیا ہو۔ اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے کہ سوق کی طرف سے وہ آتا ہوا نظر آ گیا تھا۔ آج کے ایران میں اور اس وقت کے ایران میں بہت فرق ہے۔ اس وقت جتنی آزادی تھی اس کا ایک فیصد بھی اب نہیں۔ ہر دوسری عورت منی اسکارٹ میں نظر آتی تھی۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنا ایک عام سی بات تھی۔ وہ بھی ایک لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے چلا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں خون کی روانی بڑھ گئی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑانے کے لیے میرے سامنے آیا ہے کہ دیکھ لو میں اب بھی تمہارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے زندہ ہوں، تم میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ واقعی اس کا زندہ نظر آنا میرے لیے گالی سے کم نہیں تھا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا کہ رفعی اپنی کار میں جا بیٹھا اور لڑکی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔

رفعی جا چکا تھا مگر میرے اندر کا ابال کم نہیں ہوا تھا۔ میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ قدم بڑھا دیے۔ میں نے سوچ لیا تھا۔ زریں جائے بھاڑ میں پہلے میں اپنا بدلا لوں گا۔ پھر اس کے مسئلے پر غور کروں گا۔ فاکیہ کو آتے ہی حکم دوں گا کہ وہ جا کر رفعی کی بہنوں کو کسی بھی طرح اٹھا لائے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، انتقام کی آگ اب کچھ زیادہ ہی تپش دینے لگی ہے۔ سوزش نا قابل برداشت ہو چکی ہے۔

میں خود سے الجھتا ہوا بالآخر گھر تک پہنچ گیا۔ دروازہ رخسار نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"تم نے تو مجھے پھنسا ہی دیا تھا۔ میں کوئی عامل کامل ہوں جو تم انہیں پکڑ لائی تھیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم بہت کچھ جانتے ہو۔ ان کو اس پریشانی سے تم ہی نجات دلا سکتے ہو۔ بابا بھی عملیات کرتے ہیں۔ ان کے حلقہ احباب میں ایک سے بڑھ کر ایک عامل کامل ہے مگر بابا نے بتایا ہے کہ تم سب سے بلند مقام رکھتے ہو۔"

"اچھا عمو نے میرے متعلق ایسا کہا ہے؟" سلمان نے دلچسپی لے کر کہا۔

"اور کیا..... اگر یہ کام تم نے کر لیا تو یوں سمجھو کہ وہ لوگ میرے غلام ہو جائیں گے۔" اس نے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔

سلمان کی اس کامیابی پر رخسار حیران بھی تھی اور خوش بھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی مگر سلمان نے اسے موقع نہیں دیا اور اسے باہر بھیج کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ مگر وہ تو سر پر سوار ہو جانے والی تھی۔ کچھ ہی دیر میں تشت میں قہوہ سے لبالب بھرے فنجان لیے حاضر ہو گئی۔ سلمان نے فنجان اٹھا کر کہا "ایک کام کرو۔"

"کیا؟"

"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"کیوں، کیا میری ہمرہی ناگوار لگ رہی ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میں تمہاری زریں کے لیے کوئی راہ تلاش کرنا چاہتا ہوں۔" کہہ کر سلمان نے کروٹ بدل لی۔ اس نے بھی اعتراض نہیں کیا اور کمرے سے چلی گئی۔

ابھی اسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ فاکیہ آ گئی۔ آتے ہی اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں بتایا کہ اس نے وہ مقام ڈھونڈ لیا ہے جہاں وہ بدبخت چھپا بیٹھا ہے۔ وہی جس نے اس معصوم بچے کو اپنی قید میں لے رکھا ہے۔

"اسے تو سزا دینا ہی ہے مگر اس سے پہلے ایک اور کام کرنا ہے، میرا نجی کام۔ یعنی رفعی کو سزا دینا۔ تمہارے کہنے سے میں چلا تو آیا ہوں مگر میرے دل میں جو انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے وہ یوں بجھنے والی نہیں۔" سلمان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو یوں اس لہجے میں مجھ سے بات نہ کرو۔ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ رفعی سے نمٹنا کوئی مسئلہ ہی نہیں مگر تم نے اس کی بہنوں کے بارے میں جو سوچا ہے اس سے تائب ہو جاؤ۔ خواہ مخواہ جنات سے ٹکرانا مناسب نہیں۔ ان کی اپنی الگ قوت ہے۔"

"یوں کہو کہ تم بن فاتح کے قبضے میں جا کر بزدل ہو گئی ہو۔" سلمان کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"یہ دوسری بار تم نے مجھے تعنہ دیا ہے۔ اگر پھر ایسا تعنہ دیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ تم بدلہ لینا چاہتے ہو نا۔ چلو ابھی جا کر اس بدبخت سے دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔" فاکیہ کا انداز جارحانہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے .. غصے میں بھر اٹھی ہو۔ "مگر ایک بات یاد رکھو کہ عشق کی قوت بہت زیادہ ہے۔ عشق میں کوئی بھی کسی کی جان لے سکتا ہے۔ وہ جن بھی اس کی ایک بہن سے پیار کرتا ہے۔ وہ عشق میں اپنی جان بھی دے سکتا ہے کیوں کہ عشق بہت بری شے ہے۔ کہیں کا نہیں چھوڑتی۔"

''اچھا تو موصوف عشق میں مبتلا ہیں اسی لیے اتنی تیزی دیکھا رہے تھے۔'' سلمان نے ہنس کر کہا۔

''جی ہاں اگر حضور اسی طرح مسکراتے رہیں تو میں ہر مسئلے کو چٹکیوں میں حل کر دوں۔ یہ جن بھی نوروز والے جن کی طرح حفاظت کرتا ہے اس گھر کی۔'' فاکیہ نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

سلمان سمجھ رہا تھا کہ فاکیہ کو ناراض کر کے وہ کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ رفعی کو شکست دینے کے لیے اسے فاکیہ کی ضرورت ہے۔ اسی لیے وہ نرم پڑ گیا تھا۔

''جانتے ہو عشق میں تم انسان کتنا آگے بڑھ جاتے ہو خدا کو بھی بھلا دیتے ہو۔ یا پھر خدا کو پا لیتے ہو۔ جیسے حافظ پیاری نے پایا تھا۔''

''حافظ شیرازی کا تو نام سنا تھا مگر حافظ پیاری کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔'' سلمان نے جواب میں کہا۔

''تم تو جانتے ہو ارواح کے لیے کوئی سرحد نہیں۔ وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ ایک دور میں میں ہند چلی گئی تھی۔ صرف یہ دیکھنے کے وہاں سفلی کس نہج پر ہے۔ اس لیے کہ سنا تھا کہ وہاں ارواح خبیثہ بڑی تعداد میں رہتی ہیں۔ لیکن وہاں جا کر پایا کہ اللہ والے بھی اسی قدر ہیں۔ ایسے ہی ایک اللہ والے حضرت وارث علی شاہ کی زیارت کر لی تھی۔ ان کے یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ عشق کی قوت کیا ہوتی ہے۔ اگر وہ جن زادہ عشق کا اسیر ہے تو کیا حیرت ہے۔''

''تم بھی تو میرے عشق کی سودائی ہو؟'' سلمان نے ہنس کر کہا۔

''نہیں جناب ہم نے کبھی کسی سے عشق نہیں کیا۔'' فاکیہ نے دکھے دل سے کہا۔ ''جس سے کیا اسے پا نہ سکی..... خیر ان باتوں کو چھوڑو جو میں بتا رہی ہوں وہ سنو عشق کسے کہتے ہیں میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' کہہ کر اس نے سلمان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ''غور سے سنو کارخانہ قدرت میں کشش اور گریز کا ایک عجیب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ کسی بھی حرکت کی گہرائی میں جائیے تو کشش کی قوت یا گریز کا عمل کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے گریز کہتے ہیں وہ بھی کشش کے ساتھ پیوستہ ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، کے اندر کام کرنے والے تمام معاملات کشش کی اندیکھی قوت پر قائم ہیں۔ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے۔ بکری گھاس کی طرف دوڑتی ہے۔ کبوتر کبوتر کے غول میں پرواز کرتا ہے اور باز باز کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ ہر نوع کا نر مادہ

کی جانب ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر کھنچتا چلا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مادے کے سب سے چھوٹے جزو ایٹم میں بھی ذرات کشش کے ایک نظام کے تحت آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔

کشش کی یہ عجیب و غریب قوت دراصل خالق کائنات کی ایک صفت ہے جو تمام مخلوقات کے اندر کارفرما ہے۔ یہ قوت بندے اور خالق کے درمیان ایک ربط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر جب یہ قوت رونما ہوتی ہے تو ان کا شعور عالم اقدس کی طرف صعود کر کے اللہ تعالیٰ صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

خاصان خدا کی نظر میں کشش کے تمام کرشمے مجاز ہیں۔ مجاز میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ مجاز فنا ہے لیکن مجاز جس حقیقت پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو لافانی ہے اور اسی صفت سے تمام مجازی کرشمے متحرک رہتے ہیں، عشق حقیقی اس خدائی صفت کا دیوانہ ہوتا ہے اور اس کی نظر مجاز سے ہٹ کر حقیقت پر ہوتی ہے۔

انسانی زندگی خیالات پر رواں دواں ہے۔ زندگی کی تمام حرکات خیالات سے شروع ہوتی ہیں جس نقطے پر خیال مرکوز ہو جاتا ہے وہ مظہر بن جاتا ہے۔ اولیاء اللہ علم خیال کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں خیالات کو پڑھنے، خیالات کو منتقل کرنے اور خیالات کو تبدیل کرنے میں یدطولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اہل اللہ جب اپنے شاگردوں کی روحانی تربیت فرماتے ہیں تو انسانی طبیعت اور بشری خصائل ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد کو جو کشش مجازی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے اس طرح کشش حقیقی کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی میں بدل جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہم جس واقعے کو بیان کرنے جا رہے ہیں اس کی کئی باتیں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ اس واقعے کی تفصیلات بھی زیادہ ہیں اس میں دلچسپ مسائل بھی آتے ہیں۔ سادگی اور جذبات بھی اس میں موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ ہمارے ایران کا نہیں ہے۔ پڑوسی ملک ہند کا ہے۔'' کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی جیسے جاندار ہو۔ دراصل وہ اس وقت بشری قالب میں جو تھی۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ''یہ واقعہ ملک ہند کے صوبہ یوپی کے شہر بارہ بنکی کا ہے جو لکھنو نامی شہر کے قریب ہے۔ وہاں ایک بہت بڑے اللہ والے رہتے تھے جن کا نام حاجی وارث علی شاہ ہے۔ انؒ کے ایک شاگرد سے اس واقعہ کا تعلق ہے۔ حاجی وارث علیؒ اولیاء اللہ میں بڑے صاحب حال و مقام بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی پیدائش کی خبر

پہلے سے کئی بزرگوں نے دے دی تھی۔ شروع ہی سے طبیعت میں استغنا و توکل حد درجہ غالب تھا دس برس کی عمر میں سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی اور اپنے پیر و مرشد کے حکم پر مختلف ممالک کی سیر کی۔ نسبتِ اویسیہ کے تحت بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے اوپر نسبت عشق کا غلبہ رہتا تھا۔ حج پر تشریف لے گئے تو احرام پہننے کے بعد کوئی اور کپڑا نہیں پہنا۔ ہمیشہ احرام زیب تن رکھتے تھے۔ لوگ بطور خدمت آپ کو احرام پیش کرتے تھے اور آپ کے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کے مزاج و عادات میں حضرت عیسیٰ کی جھلک ملتی تھی۔ آپ کا قیام زیادہ تر یوپی کے شہر دیوہ ضلع بارہ بنکی میں رہتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں وصال فرمایا۔ آپ سے تعلق رکھنے والے لوگ وارثی کہلاتے ہیں۔"

سلمان بغور اس کی باتیں سن رہا تھا جیسے وہ ایک ایک لفظ کو ذہن نشین کرنا چاہتا ہو۔

"ہاں تو میں بتا رہی تھی۔" اس نے گفتگو آگے بڑھائی "ایک مرتبہ حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا حاضر ہوا۔ اس لڑکے کا نام عبدالکریم تھا اور لکھنو کے کسی مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ لوگ اسے حافظ عبدالکریم کہتے تھے۔ حاجی صاحب نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور فرمایا۔ "عاشق آیا، عاشق آیا۔" حافظ عبدالکریم نے بیعت کی درخواست کی جسے حاجی صاحبؒ نے فوراً قبول فرمایا۔

کچھ عرصہ بعد حافظ عبدالکریم حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے حافظ کو ایک کتاب دی اور فرمایا "اس کتاب کو روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔" انہوں نے حافظ کو شیرینی بھی دی۔ حافظ اس التفات سے بہت خوش ہوا۔ اس کتاب میں ایک کہانی تھی جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا کہ ایک امیر کو ایک رئیس کی لڑکی سے عشق ہو گیا اس معاملے میں اسے بہت سے مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور وہ رات دن لڑکی کے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ برسوں اس کی یہی حالت رہی۔ اچانک اس کی ملاقات کسی درویش سے ہوئی اور وہ سکون اور فقیرانہ حالت میں ایک جگہ بیٹھ گیا پھر فقیرانہ حالت اختیار کر لی۔ لڑکی کو اس تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اپنے مکان سے اس شخص کے پاس آئی تاکہ وجہ دریافت کرے۔ جواب میں عاشق امیر نے نہ جانے کیا کہا کہ وہ بھی گوشہ نشین ہو کر فقیر مشرب ہو گئی۔

دیوہ میں حافظ کے رشتے کے چچا رہتے تھے۔ حافظ عبدالکریم خوشی خوشی یہ کتاب لے کر چچا کے مکان پر پہنچا اور سب کو بتایا کہ آج حاجی صاحبؒ نے مجھے شیرینی کے ساتھ یہ کتاب

مرحمت فرمائی ہے اور کہا ہے کہ روزانہ اسے دو مرتبہ پڑھا کرو۔ تمام اہل خانہ کو اشتیاق ہوا اور انہوں نے کتاب سننے کی فرمائش کی۔ حافظ نے کتاب سنائی اور پھر روزانہ اسے پڑھنے لگا۔

حافظ عبدالکریم کی چچی نے ایک روز کہا، بچیاں بڑی ہو گئی ہیں اور باہر کے کسی شخص سے قرآن شریف پڑھوانا مناسب نہیں ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، انہیں قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔ چچا کی لڑکیوں میں ایک لڑکی تیسرا سپارہ پڑھتی تھی اور اسے سب پیاری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حافظ کی بے شعوری کا زمانہ تھا۔ لیکن اسے قرآن پڑھانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ پیاری قرآن شریف پڑھتی رہے اور وہ سنتا رہے۔ پیاری یہ چاہتی تھی کہ حافظ وہ کتاب جو اسے حاجی صاحبؒ نے عطا کی تھی پڑھتا رہے اور وہ سنتی رہے۔

حافظ عبدالکریم نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور پھر اپنے موضع بڑا گاؤں چلا گیا۔ چند روز بعد حافظ کی بہن کی شادی طے ہوئی اور سب اعزا و اقارب جمع ہو گئے۔ چچا صاحب بھی مع اہل خانہ تشریف لائے۔ تقریب کے خاتمے پر سب نے جانے کا قصد کیا تو چچی صاحبہ اور اہل خانہ کو حافظ کے والدین نے روکنا چاہا۔ چچی صاحبہ نے کہا کہ میرا رکنا تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن لڑکیوں کو اس شرط پر چھوڑ سکتی ہوں کہ حافظ عبدالکریم قرآن شریف پڑھایا کریں۔ حافظ کی والدہ نے فوراً کہا، وہ تمہارا ہی لڑکا ہے بسر و چشم کلام پاک پڑھائے گا۔

حافظ نے نہایت جانفشانی سے کلام مجید پڑھانا شروع کیا اور بہت جلد ختم کرا دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حافظ عبدالکریم کی وارفتگی و شیفتگی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت پیاری کی صورت اس کے سامنے رہے اور وہ قرآن شریف پڑھاتا رہے۔ حافظ کے یہ جذبات چھپے نہ رہ سکے۔ لوگوں نے سامنے تو کچھ نہ کہا لیکن مخفی طریقے سے پیاری کے والدین کو اس بات کی خبر کر دی۔ ایک روز اچانک کہار سواری لے کر آ پہنچے۔ یہ وقت حافظ پر قیامت سے کم نہ تھا۔ پیاری سے جدائی کا خیال اس کے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ پیاری کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ تمام خواتین دونوں کی حالت دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئیں۔ پیاری نے حافظ عبدالکریم سے کہا آپ دیوہ شریف کب آئیں گے۔ حافظ نے بے قرار ہو کر کہا تمہارے جانے کے بعد میں بھی پہنچوں گا۔

حافظ عبدالکریم اگلے ہی روز دیوہ شریف پہنچ گیا۔ حافظ اور پیاری کے درمیان پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ قرآن مجید ختم ہونے کا تذکرہ اپنی والدہ سے نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ ابھی کچھ

پارے باقی ہیں۔ پیاری نے یہ بات حافظ کے پہنچنے پر اپنی والدہ کو بتائی تو حافظ نے کہا، میں روز آ کر پڑھا دیا کروں گا۔ چچی نے حیرانی سے کہا، اپنے گاؤں سے یہاں اتنی دور آ کر تم کیسے پڑھاؤ گے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ حافظ نے کہا، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اور لوگوں سے کیا مطلب۔ خدا تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کا دیکھنے والا ہے۔

حافظ عبدالکریم روزانہ بعد نماز مغرب اپنے گھر سے چلتا اور نو بجے تک دیوہ شریف پہنچ جاتا۔ پھر قرآن مجید پڑھاتا۔ جب رات کچھ باقی رہتی تو وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑتا اور نماز فجر گھر پر ادا کرتا۔ دو ڈھائی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اب دیوہ شریف کے لوگوں میں اس بات پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پیاری کے والد عبدالرؤف ریاست جہانگیر آباد میں ملازم تھے۔ وہاں سے گھر آئے اور سخت تاکید کی کہ حافظ عبدالکریم ہمارے گھر میں نہ آئے۔ اس رات حافظ قرآن پڑھانے پہنچا تو اسے منع کر دیا گیا۔ پیاری کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آئی اور چپکے سے کہا، سب کا خیال ہے کہ اس مکان کے بالا خانے پر جن رہتے ہیں۔ اگر تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو رات کو جن کا بھیس بدل کر آیا کرو۔ لیکن کسی کو خبر ہوگئی تو جان پر آ بنے گی۔ حافظ نے کہا، ان کی پروا نہیں۔ میں دو تین دنوں میں انتظام کر کے آتا ہوں۔ حافظ عبدالکریم نہایت پریشانی کے ساتھ دل پر بوجھ لیے واپس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں پیاری کی ذہانت کی داد دیتا رہا تھا جس نے یہ ترکیب سوچ کر ملاقات کی راہ سجھائی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ضرور جن بن کر جائے گا اصل جنات اسے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔

حافظ عبدالکریم چپکے سے لکھنؤ پہنچا اور مختلف قسم کے عطر، اگربتی، شیرینی، کوئلے اور دیا سلائیاں خریدیں۔ دو ہاتھ لمبی موٹی موٹی سات آٹھ سلاخیں لوہے کی بنوائیں جس کے ذریعے بالا خانے پر چڑھ سکے۔ رات کے وقت وہ تمام سامان لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بالا خانے پر چڑھا۔ بالا خانے پر کسی جگہ اگربتی سلگائی، کسی جگہ لوبان جلایا اور کہیں عطر و گلاب چھڑکا۔ پورا بالا خانہ خوشبویات سے مہک اٹھا۔ اچانک حافظ کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ زینے کے راستے نیچے اترے گا تو جن بننے کا ڈرامے میں اصلیت کا رنگ نہیں آئے گا۔ چنانچہ وہ کوٹھے پر سے صحن میں کود گیا۔ آواز سنتے ہی گھر والوں کی آگ کھل گئی۔ خواتین حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ پیاری کی والدہ نے چراغ گل کر دیا تاکہ جن کی صورت دیکھ کر بچے نہ ڈر جائیں۔ حافظ نے دالان میں پہنچ کر کہا۔

''تم روز کہتی تھی کہ جن کی صورت نہیں دیکھی۔ چراغ جلاؤ اور ہماری شکل دیکھو۔''

پیاری کی والدہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''خدارا! رحم کیجئے ہم آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔''

حافظ نے آواز بدل کر تیز لہجے میں کہا۔ ''ہمارے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہاری لڑکی قرآن پاک پڑھتی تھی تو ہم بھی سنا کرتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ تین دن سے وہ لڑکا حافظ پڑھانے نہیں آ رہا اور ہمیں تلاوت قرآن سننے کو نہیں مل رہی۔''

پیاری کی والدہ نے ہمت کر کے جواب دیا حافظ کو ہم نے اپنی بدنامی کی وجہ سے منع کر دیا ہے اگر آپ قرآن شریف سننا چاہتے ہیں تو جس وقت آپ حکم کریں لڑکی اسی وقت تلاوت کر دیا کرے گی۔

حافظ نے جن کی آواز میں کہا، ہمیں قرآن شریف سننے سے مطلب ہے حافظ کے آنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور تلاوت سنیں گے۔

حافظ روزانہ رات کو بالا خانے پر چڑھ کر خوشبو جلاتا اور پھر نیچے کود پڑتا تھا۔ قرآن شریف سننے کے بعد زینے کے راستے بالا خانے پر چڑھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ جن کے واقعے کی شہرت تمام بستی میں ہوگئی۔ کسی نے حاجی ورث علیؒ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''ہاں ہاں پڑھا لکھا جن ہے، پڑھا لکھا جن ہے۔''

ان الفاظ سے سب نے یہی مطلب اخذ کیا کہ کوئی عالم فاضل جن ہے۔ اصل بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

ایک روز حافظ عبدالکریم نے تلاوت قرآن شریف کے بعد پیاری سے کہا۔ ''میں چند روز کے لیے لکھنو جا رہا ہوں تاکہ جن بننے کا سامان لاؤں اگر تمہیں کچھ منگانا ہو تو بتاؤ۔''

پیاری نے عتیق البحر کی تسبیح کی فرمائش کی۔ حافظ کا خیال تھا کہ سب گھر والے سو رہے ہیں لیکن پیاری کی والدہ جاگ رہی تھیں اور انہوں نے یہ گفتگو سن لی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ بالا خانے کے جنات کو حافظ عبدالکریم نے عملیات کے ذریعے قابو کیا ہوا ہے اور ان کی مدد سے روزانہ یہاں پیاری سے ملنے آ جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنے تک محدود رکھی اور حافظ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ حافظ کئی ماہ تک جن کی شکل میں پیاری کے گھر جاتا رہا۔ تین ماہ بعد مہمان بن کر چچا کے گھر پہنچا تو خلاف معمول پیاری کی والدہ نے اسے حافظ کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔

حافظ کچھ دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن پیاری سامنے نہیں آئی۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اچانک وہ کمرے سے نکل کر حافظ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

اس کی بڑی بہن نے کہا۔ ''تم کیوں باہر آئیں۔ اماں جان نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔''

پیاری نے کہا۔ ''اماں جان کی بات خلافِ عقل ہے حافظ عبدالکریم رشتے میں میرے بھائی ہیں اور مجھے قرآن شریف پڑھایا ہے۔ اگر اب ان سے پردہ کروں گی تو اس میں میری بدنامی ہے۔ اچانک پردہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟''

پیاری کی یہ منطق سن کر تمام خواتین دم بخود رہ گئیں۔

یہ صورتحال دیکھ کر حافظ کی طبعیت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر جانے لگا۔

پیاری کی والدہ نے بہت روکا لیکن حافظ نہیں رُکا تمام راستے اس واقعے کا خیال اسے پریشان کرتا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب جن کی شکل میں آکر ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لے گا۔ راستہ میں بے اختیار ہو کر واپس پیاری کے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ حافظ کے جانے کے بعد پیاری کی والدہ نے اس کی خوب پٹائی کی ہے۔ یہ سن کر وہ مزید بدحواس ہوگیا۔

منصوبے کے مطابق حافظ اسی رات بالا خانے پر چڑھ کر صحن میں کودا۔ اس نے گزشتہ دن اہلِ خانہ سے جن کی آواز میں کہہ دیا تھا کہ چند روز کے لیے ہم اجمیر شریف جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مہمان بن کر اگلے روز چچا کے گھر جانا چاہتا تھا۔ اہلِ خانہ اس خلاف اطلاع آمد پر حیران ہوئے۔ حافظ نے جن کی آواز میں غصے کا تمام تر تاثر پیدا کر کے کہا ''تم نے لڑکی کا پردہ حافظ سے کیوں کرایا اور حافظ کے جانے کے بعد اس کو کیوں مارا۔ ہمیں اس واقعے کی خبر ہوگئی ہے اس لیے ہم اجمیر شریف سے فوراً واپس آئے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ ہم حافظ کے قبضے میں ہیں اور جو کچھ وہ حکم دے گا ہم اس کو بجالائیں گے ہمیں تمہاری اس حرکت سے بہت رنج ہوا ہے۔ اب حافظ تمہارے گھر نہیں آئے گا۔''

سارے گھر والوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ طرح طرح سے خوشامد کرنے لگے تاکہ خطا بخش دی جائے لیکن حافظ (بشکلِ جن) نہ مانا۔ اگلے دن حافظ عبدالکریم مہمان بن کر پیاری کے مکان کے برابر میں ایک اور عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ پیاری کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ حافظ آیا ہے اور کسی دوسرے عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے تو جنات کے ڈر سے انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ کئی بار خادماؤں کو بھیجا کہ حافظ کو بلائیں لیکن حافظ نے آنے سے انکار کر دیا۔ رمضان کا مہینہ تھا چنانچہ

جب افطار کا وقت ہوا تو انہوں نے افطار بھی بھیجا۔ حافظ نے افطاری میں سے روزہ کھولا اس خیال سے کہ افطاری کی تیاری میں پیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے پھر اس افطاری میں کہیں اور سے آئی ہوئی افطاری ملا کر چچی صاحبہ کے گھر واپس کر دی۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ حافظ نے ان کے گھر کی افطاری نہیں کھائی تو ناراضگی دور کرنے کے لیے رات کو خود گئیں اور زبردستی ساتھ لے کر آئیں۔ کھانے کے لیے بٹھایا اور پیاری سے کہا کہ وہ حافظ کے لیے کھانا لائے۔

حافظ عبدالکریم نے پیاری کے خیال میں کھانا شروع کیا تھا کہ اچانک چچی صاحبہ کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ وہ سب گھر والوں کو مارنے لگیں لیکن حافظ اور پیاری کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مارتے مارتے وہ کنوئیں کی طرف دوڑیں لوگوں نے فوراً پکڑ لیا۔ نصف شب تک چچی صاحبہ کا دماغی توازن اسی طرح خراب رہا۔

پیاری نے گھبرا کر حافظ سے پوچھا، کہیں آپ نے تو کچھ نہیں کروایا۔

حافظ عبدالکریم نے جواب دیا، یقین جانو میں نے کچھ نہیں کیا۔ شاید حرارتِ قلب زیادہ ہونے سے حواس پر اثر پڑا ہے۔

پیاری کی بڑی بہن نے حافظ سے کہا۔ آپ ایک خط والد صاحب کے نام لکھ دیں تاکہ ملازم کے ہاتھوں بھیج کر جہانگیر آباد سے انہیں بلا لیا جائے۔ کیوں کہ والدہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حافظ نے خط لکھ دیا لیکن اس بات کا اندیشہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا کہ پیاری کے والد جہانگیر آباد سے آگئے تو نہ جانے کیا حالات پیش آجائیں۔ اس نے عظمت نامی ملازم کو الگ لے جا کر پوچھا، عظمت تم جانتے ہو یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

عظمت نے کہا، مجھے سب معلوم ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے آپ کو ناراض کر دیا ہے اور آپ کے قبضے میں جو جنات ہیں وہ انہیں پریشان کر رہے ہیں جب تک یہ لوگ آپ کو راضی نہیں کریں گے اسی حالت میں رہیں گے۔

حافظ دل میں خوش ہوا کہ عظمت بھی جنات کی کارروائی کا قائل ہے۔ اس نے کہا، میں جنات کو بہت سمجھا رہا ہوں لیکن وہ مانتے نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم خط لے کر جاؤ اور وہ تمہارے خلاف بھی کارروائی کریں۔

عظمت خوف کے مارے کانپنے لگا۔ حافظ نے کہا، ایسا کرو کہ جب تمہیں خط ملے تو تم باہر جاتے ہی زمین پر گر کر لوٹنے لگنا گویا کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہوگئے ہیں۔ اس

طرح تم خط لے جانے سے بچ جاؤ گے اور لوگ سمجھیں گے کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہو گئے ہیں۔

عظمت نے ایسا ہی کیا۔ خط لے کر کچھ دور چلا اور زمین پر گر کر لوٹنے اور چیخنے پکارنے لگا۔ جو قریب گیا اس کو زوردار طمانچہ رسید کیا۔

پیاری کے ایک عزیز آئے ہوئے تھے اور پیاری کی والدہ کی طبعیت بحال کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، شور سن کر باہر آئے اور یہ منظر دیکھ کر کہا، مستورات کی حالت پہلے خراب ہے ایک مرد تھا اس کا بھی یہ حال ہو گیا ہے۔ حافظ نے تو حد کر دی ہے تمام گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ حافظ کے پاس آئے اور کہا، بھائی! ان کی غلطی کو معاف کرو۔ کیا کسی کا خون کر کے خوش ہو گے۔ مستورات بے پردہ ہو جائیں گی تب تمہیں چین آئے گا۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ عظمت اٹھ کر گھر میں آیا اور کہا، اگر کسی نے حافظ عبدالکریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہو گا۔

پیاری کی والدہ نے جنگی طبیعت اس وقت کسی قدر بہتر ہو گئی تھی کہا، میں ان کے خلاف کچھ نہیں کروں گی بلکہ جو وہ کہیں گے کیا جائے گا۔

حافظ عبدالکریم صبح کے وقت اپنے گھر روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ پیاری کے ایک قریبی عزیز بھی تھے۔ ان سے حافظ کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا، میں جہانگیر آباد پیاری کے والد کے پاس جا رہا ہوں تم بھی چلو۔ میں رات کے واقعے کا ذکر کروں گا اور ان پر زور دوں گا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو سوائے رسوائی کے علاوہ کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا۔

حافظ عبدالکریم ان کے ساتھ جہانگیر آباد چلا گیا۔ پیاری کے عزیز نے تمام واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ حافظ کے قبضے میں دو جن بھی ہیں۔

پیاری کے والد تمام واقعہ اور جنات کا تذکرہ سن کر طیش میں آ گئے، کہا "چاہے کچھ ہو جائے۔ ہرگز شادی نہیں ہو گی۔"

پھر حافظ سے نہایت برہمی میں انہوں نے کہا "جنات کیا تم نے قابو میں کر لیے ہیں سمجھتے ہو کہ خدائی قبضے میں کر لئے ہیں۔ سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہم اسی وقت گھر جا رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ جنات ہمارا کیا کر لیتے ہیں۔"

حافظ عبدالکریم نے نہایت اطمینان اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنات تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ چاہیں تو ابھی اور یہیں تماشہ دیکھ لیجئے۔"

غیر متوقع جواب سن کر پیاری کے والد کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھبرا کر کہنے لگے، کیا یہاں بھی تم اپنے گھرانے کو بے آبرو کرو گے۔

حافظ نے کہا، آپ لوگ خود ہی جنات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو انہیں روک رکھا ہے۔ اس وقت تو جنات میرے ساتھ موجود ہیں اور اجازت طلب کر رہے ہیں۔

پیاری کے والد نے کہا، خدا کے لیے معاف کرو۔ تین دن بعد مجھ سے ملنا میں سوچ کر تمہیں جواب دوں گا۔

حافظ عبدالکریم تیسرے روز جہانگیر آباد پہنچا اور پیاری کے والد کے پاس بہت سے لوگ مہمان تھے جو ان کے رشتے دار بھی تھے۔ کسی نے حافظ سے بات نہیں کی۔ حافظ واپس اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوا تو پیاری کے ایک رشتہ دار ساتھ ہو لیے۔ دورانِ سفر انہوں نے کہا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری وجہ سے ایک خون ہونے والا ہے۔ حافظ کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا "لڑکی کے والد اور چچا کو تم دونوں کے جزبات کا علم ہو گیا ہے۔ شرفاء میں اس قسم کے واقعات سے بڑھ کر کوئی بات باعثِ شرم نہیں ہوتی اس لیے تمام رشتہ داروں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ لڑکی کو مار دیا جائے تا کہ مزید بدنامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام کے لیے ابھی ابھی دونوں بھائی دیوہ شریف گئے ہیں۔"

حافظ عبدالکریم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پیاری کے عزیز نے حافظ کو مشورہ دیا۔

"میاں! اب تو تمہارا زندہ رہنا لاحاصل ہے تمہیں بھی اپنی جان کا نذرانہ دینا چاہئے۔"

حافظ عبدالکریم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اسی وقت دیوہ شریف کو چلا جہاں پیاری کا گھر تھا۔ راستے بھر طرح طرح کے خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ بار بار اس کے دل سے یہی آواز آتی کہ پیاری کے بعد زندہ رہنا بیکار ہے۔ تم کو بھی جان دے دینی چاہئے اور اسی کے گھر میں جو کنواں ہے اس میں کود کر چراغِ زندگی گل کر دینا چاہئے۔

حافظ عبدالکریم سہ پہر کو دیوہ شریف میں پیاری کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل

خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دروازہ بند تھا۔ یہ خاموشی اسے موت کا سناٹا محسوس ہوئی اور یہ خیال بن گیا کہ پیاری اس دنیا میں نہیں رہی۔ حافظ نے کئی چکر مکان کے لگائے لیکن کھڑکی کھلی دکھائی دی اور نہ کوئی دروازہ، رمضان شریف کے دن تھے۔ بوقتِ افطار حافظ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حافظ عبدالکریم نے الا اللہ کا نعرہ لگایا اور مکان کے اندر داخل ہو کر سیدھا کنوئیں تک جا پہنچا اور سر کے بل کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے ہی ایک عجیب معاملہ ہوا۔ حافظ کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کے جسم کو سنبھال لیا ہے اور جب وہ نیچے پہنچا تو اس کا سر اوپر اور پیر نیچے تھے۔ پھر بھی اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹ آئی، ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور دوسرے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ کر باہر نکل آئی۔ اتفاقاً پیاری کی والدہ نے حافظ کو کنوئیں میں چھلانگ لگاتے دیکھ لیا۔ انہوں نے شور مچا کر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جمع کر لیا۔ رشتہ داروں نے پیاری کو ایک کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنوئیں میں اینٹیں اور پتھر برسانے شروع کر دیے۔ شور وغل اتنا زیادہ ہوا کہ ہر طرف اطلاع پھیل گئی۔ سید معروف شاہ وارثی دیگر معززین شہر کو لے کر حافظ کی اعانت کے لیے پہنچے۔ پیاری کی والدہ پر اظہار ناراضی کیا اور کنوئیں کے قریب پہنچ کر آوازیں دیں۔ کنوئیں کے اندر حافظ گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہوا تھا ادھر پیاری کمرے میں چیخ رہی تھی کہ آج تم لوگوں نے حافظ بھائی کی جان لے لی۔ اب تو خدارا دروازہ کھول دو۔ یہ آواز حافظ کے کانوں میں پہنچی تو اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پوری قوت سے آواز لگائی، میں زندہ ہوں، جلدی سے نکالو۔

حافظ کو باہر نکالا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ ''مزا ہے پیاری کا''

سید معروف شاہ حافظ کو اپنے مکان پر لائے، دودھ پھٹکری پلائی اور کہا، میں کہاروں کو بلاتا ہوں وہ تمہیں پالکی میں بٹھا کر گھر چھوڑ دیں گے۔ لڑکی کے والد جہانگیر آباد سے آنے والے ہیں۔ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے لڑکی کا معاملہ ہے اس لیے تمام بستی والے بھی اُن کا ساتھ دیں گے۔

حافظ نے کہا مجھے جان کی پروا نہیں ہے میں نے تو جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جان جانے سے رہ گئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

حافظ کے ایک رشتہ دار اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسی رات پیاری کے والد بھی جہانگیر

آباد سے آ گئے۔ حافظ کی حالت عجیب تھی۔ اسے نہ چوٹ کا احساس تھا۔ اور نہ تکلیف کا خیال۔ وہ پوری رات جاگتا رہا۔

صبح کو یہ اطلاع زبان زدِ عام ہوئی کہ حاجی وارث علی شاہؒ دیوہ تشریف لا رہے ہیں۔ اس زمانے میں عبدالکریم کا حاجی صاحب کے بارے میں صرف یہ خیال تھا کہ حاجی صاحب ایک پیر ہیں جن کا سب لوگ حکم مانتے ہیں۔ حافظ، حاجی صاحب سے بیعت ہو گیا تھا لیکن مرتبہ ولایت کا ادراک واحساس اسے نہ تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ لوگ جب اس معاملے کی اطلاع انہیں دیں گے تو ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دیوہ شریف سے باہر نکلوا دیں۔ حافظ نے ان تمام لوگوں سے جو حاجی صاحب سے قربت رکھتے تھے، طرح طرح کی خوشامد کی اور بڑی منت سماجت سے کہا۔ خدارا سفارش کر کے مجھے دیوہ شریف سے نہ نکلنے دینا۔ لیکن جو بھی یہ بات سنتا کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔

صبح آٹھ بجے سید معروف شاہ وارثی اور دیگر معززین شہر حاجی صاحب کے استقبال کے لیے پہنچے۔ حاجی صاحب ان لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:۔

''کیوں کیوں! حافظ کنوئیں میں کود پڑا۔ کیوں ایسا کہا جو وہ کود پڑا۔'' پھر سید معروف شاہ سے مخاطب ہوئے۔ ''سنا سنا محبت ایسی تو ہو جیسی حافظ کو ہے'' سید معروف شاہ نے تمام روئداد عشق بیان کی حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔ ''پاک محبت ہے پاک محبت ہے مگر دنیا کے لوگ نہیں مانیں گے اور ان کی بدنامی ہوگی۔ حافظ عاشق ہے، حافظ عاشق ہے۔''

جب لوگوں نے حاجی صاحب کی یہ باتیں سنیں حافظ کی طرفداری میں بولنا شروع کر دیا۔ حافظ کو جب اس بات کا علم ہوا تو ہمت کر کے حاجی صاحب کے پاس پہنچا اقامت گاہ کا دروازہ بند تھا۔ خادم نور محمد شاہ نے حافظ کے آنے کی اطلاع دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا ''حافظ مستان حافظ مستان'' حافظ اندر داخل ہوا تو حال یہ تھا کہ وہی خون آلود کپڑے جسم پر تھے جو کنوئیں میں گرتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا:

''حافظ حافظ ضبط نہیں ہوا، کنوئیں میں کود پڑے۔ کون سا ہاتھ ٹوٹا، کون سا ہاتھ ٹوٹا؟''

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب نے حافظ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو ہڈی اپنی جگہ بیٹھ کر بالکل جڑ گئی چوٹ کا اثر ختم ہو گیا۔ حاجی صاحب نے کہا ''حافظ حافظ! وہ لوگ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اب ان کے گھر نہیں جانا۔''

حافظ نے یہ حکم سن تو لیا لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ محبوب کے در کو چھوڑ دے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دوہرایا، میں ضرور جاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ حاجی صاحبؒ نے کئی مرتبہ زور دے کر کہا۔

''تم نے نہیں جانا، وہ لوگ مار ڈالیں گے۔''

حاجی صاحبؒ سے رخصت ہو کر حافظ باہر نکلا تو دیوانگیٔ شوق نے اس قدر شدت اختیار کی کہ بے تابانہ پیاری کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے اُس کی خوب پٹائی کی اور دھکے دے کر نکال دیا۔ بعد ازاں پیاری کے گھر والوں نے کئی چوکیدار مقرر کر دیئے تا کہ حافظ مکان کی طرف نہ آئے۔ نیز کئی عورتیں بھی ہمہ وقت پیاری کے ساتھ رہتی تھیں۔

ایک روز حافظ بے تابی کے عالم میں صدا لگاتا ہوا پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ اسی وقت پیاری بھی دوڑتی ہوئی چھت پر چڑھ گئی۔ عورتوں نے اسے پکڑا اور کھینچتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ مکان کے زینے کو توڑ کر گرا دیا گیا۔

حافظ عبدالکریم کی حالت دیوانگی یہ ہو گئی کہ اُس کا نام حافظ پیاری رکھ دیا گیا۔ لوگ اُس سے مذاقاً کہتے۔ ''حافظ! پیاری نے کہا ہے کہ میرے نام سے سو جوتے مارو۔'' پیاری کا نام سن کر حافظ بسر و چشم سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور لوگ اُسے جوتے مارتے۔

حاجی صاحبؒ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو حافظ کو بلا کر کہا۔ ''حافظ تم کسی کے کہنے سننے میں نہ آیا کرو اور نہ کسی کا اعتبار کرو۔ جب وہ خود آ کر کہے تو یقین کیا کرو۔''

حافظ عبدالکریم پیاری کے مکان کے گرد طواف کرتا اور مختلف صدائیں لگاتا رہتا۔ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ارشاد فرماتے۔ ''جاؤ! شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر صدا لگاؤ۔'' چنانچہ حافظ اکثر شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہو کر صدائیں لگاتا اور دیوانِ حافظ کے اشعار پڑھتا۔ ایک روز اُس نے پیاری کے مکان کا طواف کیا اور صدا لگائی تو پیاری کی والدہ دیگر عورتوں کے ساتھ لے کر حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچیں اور کہا۔ ''حضرت! حافظ ہمیں بدنام کرتا ہے اور ہماری لڑکی کا نام سب کے سامنے لیتا ہے۔''

حاجی صاحبؒ نے کہا۔ ''اگر وہ ایسا ہے تو ہم اُسے ابھی دیوہ سے نکلوا دیتے ہیں۔'' خادم نور محمد شاہ کو حکم دیا۔ ''حافظ کو ابھی پکڑ کر لاؤ۔''

نور محمد شاہ نے یہ واقعہ حافظ کو بتایا تو حافظ ایک چاقو اپنے ساتھ لے کر گیا اور پختہ ارادہ

کر لیا کہ اگر حاجی صاحبؒ نے اُسے دیوہ شریف سے نکلنے کا حکم دیا تو وہ اسی چاقو سے خود کو ہلاک کر لے گا۔

حافظ حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا لیکن اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے حافظ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ اسی زمانے میں حافظ اکثر پتنگ اُڑاتا اور جان بوجھ کر پتنگ پیاری کے گھر میں گرا دیتا۔ پھر یہ کہتے ہوئے مکان پر جا پہنچتا کہ ہماری پتنگ آ گری ہے۔ کئی بار وہاں سے خوب زدوکوب کر کے باہر نکالا گیا۔ حاجی صاحب نے حافظ کو بلا کر کہا۔ ''حافظ! تم ہمارے کوٹھے پر پتنگ اُڑایا کرو۔''

راہِ عشق میں آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ گذر گیا۔ طرح طرح کے واقعات و معاملات پیش آتے رہے۔ ایک روز حاجی وارث علیؒ نے حافظ عبدالکریم سے کہا۔ ''حافظ حافظ! تم ہماری صورت دیکھا کرو۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ترجمہ:۔ ''ہم تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہیں۔''

حافظ نے کہا۔ ''حضور! دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ کس کو دیکھوں؟ اگر آپ اُس سے زیادہ حسین ہوتے تو آپ کو دیکھتا۔''

یہ جواب سن کر حاجی صاحب مسکرائے اور حافظ کو گلے لگا کر فرمایا۔ ''عاشق کے سوا کسی کی جرأت نہیں کہ ایسی بات کہہ سکے۔''

ایک عرصے بعد حاجی وارث علیؒ نے حافظ سے کہا۔ ''حافظ حافظ! خدا اور رسول ﷺ تم کو ملیں۔ وہ لڑکی ملے یا نہ ملے۔''

حافظ نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں حضورؒ مجھے کچھ نہ ملے، وہ لڑکی مل جائے۔ اگر خدا اور رسول کو بھی اسی صورت میں دیکھوں گا تو مانوں گا ورنہ میں سب سے باز آیا۔''

یہ سن کر حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''عاشق کے سوا کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔''

حافظ عبدالکریم پر عشق کی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلتا۔ ''مزا ہے پیاری کا۔'' دیوانِ حافظ کے اشعار اکثر اُس کی زبان پر ہوتے تھے۔ ایک روز حافظ کو معلوم ہوا کہ پیاری اور اُس کی والدہ حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچ گئی ہیں۔ حافظ مکان کے زنانہ حصے کے پاس پہنچ گیا اور صدا لگائی۔ حاجی صاحبؒ نے ماں بیٹی کو رخصت کر دیا۔ لیکن حافظ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پیاری کی والدہ نے مرزا منعم بیگ وارثی کو بلا کر کہا کہ حافظ کو دروازے

سے ہٹایا جائے۔

مرزا صاحب نے حافظ سے کہا۔ ''یہ زنانہ دروازہ ہے۔ اگر صدا لگانی ہے تو مردانہ حصے کی طرف جاؤ۔'' مرزا صاحب نے حافظ کو خوب برا بھلا کہا۔ ''میں حاجی صاحب سے تمہاری شکایت کر کے تمہیں نکلواتا ہوں۔''

حافظ نے کہا۔ ''جاؤ! تم خدا سے کہہ دو، میں نہیں جاؤں گا۔''

مرزا صاحب کی عجیب حالت ہوگئی۔ کبھی اندر کی طرف جاتے اور کبھی باہر آجاتے۔ اُسی وقت پیاری حافظ کے پاس آئی اور کہا۔ ''حافظ بھائی! کسی سے کچھ کہتے تھوڑا ہی ہیں۔''

پیاری کو سامنے دیکھ کر حافظ کی حالت ناقابل بیان ہوگئی اور اُس نے سر تسلیم جھکا دیا۔

پیاری اور اُس کی والدہ رخصت ہوگئیں۔ مرزا منعم بیگ صاحب نے حاجی وارث علیؒ سے حافظ کی شکایت کی۔ حاجی صاحبؒ نے حافظ کی طرف ایک نگاہ کی اور مسکرا کر کہا۔ ''عبدالرؤف (پیاری کے والد) کے گھر میں کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے ہاں نہ آیا کریں۔ حافظ عاشق ہیں، کسی روز پکڑ لیا تو قیامت تک چھوٹنا مشکل ہے۔''

حافظ عبدالکریم عشق کی سرمستی میں اُس حد تک پہنچ گیا کہ ہوش و خرد رخصت ہوگئے۔ لوگ اُن کی اِس حالت کا نہ صرف مذاق اُڑاتے بلکہ طرح طرح سے فائدہ اُٹھاتے..... نائن پیاری کے ناخن اور بال لے کر آتی اور حافظ کثیر رقم دے کر خرید لیتا تھا۔ دھوبن اس کے کپڑے لاتی۔ حافظ اُسے پیسے دیتا اور پیاری کے کپڑوں کو دیکھتا اور اُس کی خوشبو سونگھتا۔ اس طرح اُس نے ایک بڑی رقم صرف کر دی۔

حافظ اکثر حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور تحائف پیش کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ حاجی صاحبؒ اِن چیزوں کو تقسیم کریں گے تو کچھ نہ کچھ پیاری کے گھر بھی جائیگا۔ یہ خیال اُس کی قلبی تسکین کا باعث بنتا۔ حافظ جو تحفہ پیش کرتا حاجی صاحبؒ اُسے تقسیم کرنے کے بجائے پورے کا پورا پیاری کے گھر بھجوا دیتے تھے۔

ایک روز کسی شخص نے حافظ سے کہا۔ ''حافظ! اگر تم پانچ سو روپے مجھے دو تو تمہیں پیاری سے ملوا دوں گا۔''

حافظ کے پاس رقم نہیں تھی اس لیے خاموش ہوگیا۔ اُن صاحب نے متبادل راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ کہ فلاں رئیس حاجی صاحب کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اُن کی جیب میں

سونے کی انتہائی قیمتی گھڑی ہے۔ کسی طرح وہ گھڑی تم ہمیں لا دو تو ہم تمہارا کام کر دیں گے۔

حافظ دن کے دس گیارہ بجے کوٹھے پر چڑھا، سیدھے کمرے میں داخل ہو کر جیب سے گھڑی نکالی اور تیزی کی تیزی سے واپس ہو کر کوٹھے پر سے کود پڑا۔ وہ رئیس چلائے کہ حافظ! گھڑی لے کر کہاں جا رہے ہو؟ شور سن کر لوگوں نے حافظ کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت حاجی صاحبؒ کے سامنے پیش کیا۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔ ''حافظ کو نکال دو۔ یہاں نہ آنے پائے اور جہاں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں اُن سے بھی کہو کہ اپنے مکان پر ٹھہرنے نہ دیں۔ یہ ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ ہم لوگوں سے چوری کراتے ہیں اور ہماری بھی شراکت ہوگی۔''

چنانچہ حافظ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد حافظ کو معلوم ہوا کہ حاجی وارث علیؒ رودولی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پیاری کے گھر والوں نے یہ منت مانی ہے کہ اگر حافظ کو نکال دیا جائے تو وہ حاجی صاحبؒ کی دعوت کریں گے اور اُن کو نیا احرام پیش کریں گے اور جلد ہی وہ اس تقریب کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سن کر حافظ کے دل کی حالت بُری ہوگئی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھی حاجی صاحب کی دعوت کرے گا اور خاص دیوہ میں، جہاں سے وہ نکالا جا چکا ہے۔ حافظ رودلی پہنچ کر حاجی صاحبؒ کے خادموں سے ملا اور اُنہیں تحائف وغیرہ دیئے تاکہ وہ حاجی صاحب کو مناسب وقت اطلاع کریں۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔ ''وہ ہماری دعوت دیوہ میں کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ چوری سے بدنام ہوگئے ہیں اور ہمیں بھی بدنام کیا ہے۔ رات کو پھر لوگوں نے حافظ کا مدعا پیش کیا تو فرمایا۔ ''اچھا بلاؤ!'' حافظ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ حاجی صاحب نے تمام حال پوچھا اور کہا۔ ''اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ ہماری گردن مار دو تو ہم اُس لڑکی (پیاری) سے ملا دیں گے۔ تو تم کیا کرو گے؟''

حافظ نے نہایت بے باکی سے کہا۔ ''حضور! میرے بس میں ہوتا تو ضرور ایسا کر گذرتا۔''

حاجی وارث علیؒ مسکراتے ہوئے اُٹھے اور حافظ کو گلے لگا کر کہا۔ ''جاؤ دیوہ میں تمہاری دعوت ہمیں منظور ہے۔''

حاجی وارث علیؒ دیوہ تشریف لے گئے تو پیاری کے گھر والوں نے دعوت کی اور احرام پیش کیا۔ حاجی صاحب کے سامنے شیرینی پیش ہوئی تو حافظ یہ سوچ رہا تھا کہ اس شیرینی میں

پیاری کے ہاتھ بھی لگے ہوں گے۔ خدا کرے مجھے بھی نصیب ہو۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ سب کو شیرینی تقسیم ہوئی لیکن حافظ کو نہیں ملی۔ اچانک حاجی صاحبؒ نے کہا۔ ''حافظ حافظ! تم کو حصہ نہیں ملا۔'' پھر اپنے ہاتھ سے مٹھائی دی۔ پیاری کے گھر سے کھانا آیا تو کھانے میں سے بھی عطا کیا اور فیرینی کی رکابیاں بھی حافظ کو دیں۔ حافظ فیرینی کھانے کے بعد رکابیاں بھی توڑ توڑ کر کھا گیا۔ بعد ازاں حافظ نے حاجی وارث علیؒ کی دعوت کی اور احرام تبدیل کرایا۔

کچھ عرصہ بعد پھر حافظ کی شکایتیں حاجی وارث علیؒ تک پہنچی تو آپ نے حافظ کو دیوہ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ حافظ دیوہ سے باہر خستہ حال و پریشان پھرتا رہا۔ ایک روز حلوہ لے کر حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا۔ خادموں نے اندر اطلاع کرنے سے معذوری ظاہر کردی۔ ایک نووارد شخص نے اندر جا کر حاجی صاحبؒ سے کہا۔ ''ایک عاشق آیا ہے۔'' فرمایا۔ ''عاشق کو کون روک سکتا ہے؟ اندر آنے دو۔''

حافظ حاجی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ مسکرائے۔ حلوہ پیش کیا تو اُسی وقت سارا حلوہ پیاری کے گھر بھجوا دیا۔ اُن دنوں پیاری کے چچا اپنے بھائی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے حافظ کو بلوایا۔ حافظ خوشی خوشی پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ چچا صاحب نے پہلے تو حافظ کو سمجھایا کہ وہ پیاری کا نام لینا ترک کردے اور دیوہ سے چلا جائے لیکن حافظ نہ مانا۔ اُنہوں نے دست پناہ گرم کر کے حافظ کو داغنا شروع کردیا۔ کسی شخص نے حاجی صاحبؒ تک اطلاع پہنچائی کہ حضور! آج فیصلہ ہوگیا۔ حافظ اُن کے گھر میں بند ہے۔ ضرور مار ڈالیں گے۔ حاجی صاحبؒ اُٹھ کر دروازے تک آئے اور فرمایا۔ ''عاشق کو مار ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔''

خدام نے گھبرا کر کہا۔ ''حضور! عاشق ہیں، گھر میں گھس گئے ہوں گے۔'' پھر خدام پیاری کے گھر پہنچے اور حافظ کو نکال کر حاجی صاحبؒ کے پاس لائے۔

حافظ نے اُس وقت پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پہنا ہوا تھا۔ کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور جسم زخموں سے داغدار تھا لیکن حافظ کو صرف اس بات کا ملال تھا کہ پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پھٹ گیا۔ اُسے زخموں کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ حاجی صاحبؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ ''ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ حافظ کو مارنے سے کیا حاصل؟''

حافظ اسی مجذوبانہ حالت میں زندگی گزارتا رہا۔ اک روز حاجی وارث علیؒ نے حافظ کو بلایا اور کہا۔ ''تم بہرائچ جاؤ اور کل آ کر ہم سے پیتے پور میں ملو۔''

حافظ اُسی وقت پیدل بہرائچ پہنچا اور حضرت سیّد سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کی لہر آئی اور اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے گاؤں میں مکان پر بیٹھا ہے۔ اتنے میں حاجی وارث علیؒ تشریف لائے اور فرمایا۔ ''حافظ! تم ہماری دعوت کرو تو پیاری تمہیں مل جائے گی۔ گیارہ تاریخ اور دن دو شنبے کا ہونا چاہئے۔ اب ہم دیوہ جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

غنودگی کی اسی کیفیت میں حافظ دیوہ پہنچا اور شاہ منعم صاحبؒ کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ مزار کا تعویذ غائب ہے اور شاہ منعم صاحبؒ بیٹھے ہوئے قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حافظ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''یہ تو فرمایئے پیاری مجھے کب ملے گی؟''

شاہ منعم صاحبؒ نے جواب دیا۔ ''چادر چڑھاؤ گے تو ملے گی۔'' یہ کہہ کر اُنہوں نے حافظ کو واپسی کا اشارہ کیا۔ حافظ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ حضرت سیّد سالار کے مزار پر بیٹھا ہوا ہے۔

حافظ مزار سے باہر نکلا تو ایک اجنبی شخص آیا اور تین سو روپے حافظ کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ حافظ دوسرے دن پیتے پور پہنچا۔ حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ آنے والی تھی۔ چنانچہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ کر کہا۔ گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔''

حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''پیر کے بجائے جمعہ کو کر دینا۔''

حافظ نے کہا۔ ''حضور ہی نے پہلے پیر کا دن مقرر فرمایا تھا۔''

مسکرا کر جواب دیا۔ ''اچھا یہی سہی۔''

حافظ عبدالکریم دیوہ پہنچا اور شاہ منعم صاحبؒ کے سجادہ نشین سے ملا۔ اُن سے عالم رویا، کا تمام واقعہ بتایا۔ حافظ نے جو شکل و شباہت شاہ منعم صاحب کی دیکھی تھی۔ سجادہ نشین نے اُس کی پوری تصدیق کردی۔

گیارہ تاریخ کو صبح دس بجے حافظ نے حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حاجی صاحبؒ نے پوچھا۔ شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر چادر کب چڑھاؤ گے؟''

حافظ نے کہا۔ ''حضور کی دعوت کے بعد وہاں جاؤں گا۔''

دعوت کے بعد حافظ شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور چادر چڑھائی۔ حاجی

صاحبؒ کی دعوت کرنے اور شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد حافظ کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی شخص پیاری کو اُس سے نہیں چھین سکتا۔ اُس چکے دل کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اُس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اب وقت کا انتظار کرنا فضول ہے۔ گھر میں جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آنا چاہیے۔ یہ خیال اُس کے دل میں راسخ ہو گیا۔ وہ کشاں کشاں پیاری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ راستے میں حاجی وارث علیؒ کا آستانہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ خیال آیا کہ چلو پہلے قدم بوسی کر لیتے ہیں پھر پیاری کے گھر چلتے ہیں۔ دیکھا کہ آستانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ حافظ اندر داخل ہو کر حاجی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔

حاجی وارث علی تو نہ دکھائی دیئے البتہ ایک ایسا منظر جو اُس کا منتظر تھا جو بجلی بن کر اُس کے ہوش وحواس پر گرا۔ حافظ پتھر کا بت بن کر رہ گیا اور پلکیں جھکانے کی طاقت تک باقی نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی معصوم روپ ہے، وہی دلکش انداز ہے، وہی رنگ و رعنائی ہے۔ وہی پیاری ہے جس نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ پیاری کانوں میں بجلیاں اور گلے میں چندن ہار پہنے گلابی دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ پیاری نے نظریں اُٹھا کر حافظ کی طرف دیکھا۔ ایک برق سی حافظ کی نگاہوں کے سامنے کوند گئی۔ حافظ ہوش وحواس کھو بیٹھا اور بے اختیار سربسجود ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد ہوش وحواس بحال ہوئے تو دل چاہا کہ دوبارہ اس مجسمۂ حسن کو دیکھے۔ سر جو اُٹھایا تو عالمِ حیرت وتحیر میں ڈوب گیا۔ وہاں نہ پیاری موجود تھی اور نہ اُس کے حسن و جمال کی روشنی۔ بلکہ حاجی وارث علی شاہؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے اختیار اُسکی زبان سے نکلا۔ ''حضور! یہ کیا؟''

فرمایا۔ ''یہی صورت ہے، اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہے اور جہاں کہیں دیکھو گے اسی صورت کو دیکھو گے۔''

اِس مشاہدے اور اِن الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ حافظ عبدالکریم کے دل کی دنیا زیر وزبر ہو گئی۔ ماضی کے تمام جذبات و خیالات اِس طرح ختم ہو گئے جیسے پانی ریت پر بنے نقوش کو مٹا دیتا ہے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھتا رہا ہے اور اب تک کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُس کی نگاہوں نے حاجی وارث علیؒ کے اندر ایک ایسا نظارہ دیکھا تھا جس کی حقیقت و معنویت اُس

کے قلب پر ظاہر ہو گئی تھی۔

اس منظر کو دیکھنے کے بعد حافظ عبدالکریم عرف حافظ پیاری صاحب نے کبھی پیاری کے گھر کا رخ نہیں کیا اور نہ کبھی اُن کی زبان سے پیاری کا نام سنا گیا۔ البتہ کبھی کبھی وہ کہتے۔ ''مزا ہے پیاری کا اور سب جھول ہے۔'' (یعنی بے معانی ہے)۔ جن لوگوں نے راہِ عشق میں حافظ پیاری صاحب کی وارفتگی وشیفتگی اور جذب وجنون کو دیکھا تھا۔ یہ امر اُن کے لیے ہمیشہ باعث صد حیرت واستعجاب بنا رہا کہ آخر وہ کیا قوت تھی؟ وہ کیا راز تھا جس نے ہفتوں، مہینوں، سالوں نہیں بلکہ چشم زدن میں اُن کو یکسر بدل دیا تھا۔

حافظ عبدالکریم ہمیشہ حاجی وارث علی شاہؒ کے والہ وشیدا رہے اور جب حاجی صاحبؒ نے اِس دنیا سے انتقال فرمایا تو سال میں دو مرتبہ خصوصی طور پر حاجی صاحبؒ کے مزار پر چادر چڑھانے جاتے تھے۔ جب چادر لے کر چلتے تو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ دو آدمی اُن کو سنبھالے ہوئے چلتے تھے۔ بے خودی کے عالم میں ایک بار ایسی حالت طاری ہوئی کہ منہ سے خون جاری ہو گیا اور تمام راستے بہتا رہا لیکن اُن کو احساس تک نہیں ہوا۔ چادر چڑھانے کے بعد اُن کی حالت مردے کی سی ہو جاتی۔ گھنٹوں ہوا دی جاتی، گلاب سنگھایا جاتا تب کہیں جا کر ہوش وحواس میں آتے تھے۔ واقف اسرار عشق حاجی وارث علی شاہؒ نے حافظ پیاری صاحب کو حسنِ اَزلی و جمالِ لافانی کا جو جلوہ مثلِ تجلیٔ طور دکھایا تھا اُس نے حافظ پیاری صاحب کو کششِ مجازی سے آزاد اور فانی رنگ وروپ سے بیگانہ کر دیا تھا۔'' فاکیہ بولتے بولتے خود بھی آبدیدہ ہو گئی تھی۔

''اتنی لمبی چوڑی تقریر کا مقصد کیا تھا میں سمجھ نہیں سکا؟'' سلمان نے پوچھا۔

''میں نے پیاری کی کہانی اس لیے سنائی کہ تم سمجھ سکو کہ عشق خدا تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے کسی عاشق سے ٹکر لینا مناسب نہیں۔ رفعی سے بدلہ لو اور اس کی بہن کی طرف نظر نہ ڈالو ورنہ مسئلہ الجھ سکتا ہے۔ تمہارے خاطر میں اس سے الجھ تو پڑوں گی مگر اس کا نتیجہ الٹ بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ میں ایک روح ہو، ایک لطیف شے، زندگی سے محروم اور وہ زندہ۔ مجھ سے زیادہ قوی۔ علم والا اس لیے کہ میں اکیلی اور اس کے ساتھ اس کا پورا خاندان، پورا قبیلہ۔ ان جنات میں بعض بہت پہنچے ہوئے ہیں وہ جہاں رہتے ہیں وہاں کے مکینوں کے محافظ بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے آفتِ جاں بھی۔ یہ جن رفعی کی بہنوں سے شدید وابستگی رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ہر طاقت بروئے کار لاتا۔ ایک معمولی کام کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینا عقلمندی نہیں ہے۔''

''مگر میں کیا کروں میرا دل نہیں مانتا۔ رفعی کو میں سبق سکھائے بغیر چھوڑ نہیں سکتا' میں ہر حالت میں اپنے عہد کی تکمیل چاہتا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم صرف اپنا بدلہ لو۔''

''گویا تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ میں رفعی کی بہنوں کو بھول جاؤں؟''

''ہاں' وہ بیچاریاں تو خود اس سے نالاں ہیں۔ جس طرح نوروز وجدانی والے واقعہ میں چچی سادھ لی ویسے ہی اسے بھی بھول جاؤ۔ بالکل ویسا ہی تو وقعہ ہے۔ رفعی کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ اسے سبق دے کر ہم نکل پڑتے ہیں اس دوسرے مسلہ کے حل کے لیے۔ یہ جو تم نے نیا مسئلہ اپنے سر لے لیا ہے۔ یعنی اس بچے کو قید کرنے والے عامل کو سزا دینے والا مسئلہ۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' سلمان نے گویا ہتھیار ڈال دیا۔

''تو آؤ ہم ایک چکر رفعی کے یہاں کا لگا آتے ہیں۔'' فاکیہ نے کہا۔

''چلو!'' کہہ کر سلمان کھڑا ہو گیا۔ اس نے رخسار کو آواز دی۔ آواز سنتے ہی وہ آ گئی۔

''میں کچھ دیر کے لیے جا رہا ہوں۔'' اور گھر سے نکل پڑا۔

''کیسے چلنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنا ہاتھ دو میں ابھی پہنچا دیتی ہوں'' فاکیہ نے کہا اور چند منٹ میں ہم رفعی کے دفتر کے سامنے کھڑے تھے۔

''تم اندر جاؤ۔'' فاکیہ نے اندر جانے کا اشارہ دیا۔ میں نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے کہا ''اندر جا کر کہو کہ اصفہان سے ملک التجار کا بھائی آیا ہے۔''

ملک التجار کوئی چھوٹا موٹا نام نہیں تھا۔ سلمان کو یقین تھا کہ نام سنتے ہی وہ خود دوڑا آئے گا۔ چوکیدار نے اندر خبر بھجوا دی۔ فوراً ہی اندر سے بلاوا آ گیا۔ سلمان شان سے سر اٹھائے اندر داخل ہوا۔ برآمدہ کو پار کر کے جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ اندر سے نکلتے ہوئے رفعی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ ''تم..تم پھر آ گئے؟ لگتا ہے تمہیں زندگی پیاری نہیں۔''

''اگر میری زندگی چھین سکتے ہو تو چھین لو لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ میں آیا کیوں ہوں؟''

''تمہاری موت تمہیں کھینچ کر لائی ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو چلو مجھے مار دو لیکن یہ بھی سوچ لو کہ جو شخص تمہارے بندوں کو دھوکا دے کر اندر آیا ہے وہ کسی خاص مقصد سے ہی آیا ہو گا۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمہیں خود

تمہارے ہاتھوں سے بے عزت کرانا تا کہ تم تہران بھر کے لوگوں میں تا عمر ذلیل ہوتے رہو۔''

''مجھے تو ذلیل کرے گا؟ تیری اوقات کیا ہے؟'' رفعی نے بڑے زعم سے کہتے ہوئے ہاتھ چلایا۔ اس کا نشانہ سلمان کا گال تھا۔ لیکن اس کے ساتھ فاکیہ تھی۔ اس کا ہاتھ گھوم کر اسی کے گال پر پڑا اسے لگا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کے ہاتھ کو گھما دیا ہے۔ وہ گالیاں بکتا ہوا مڑا مگر وہاں کوئی رہتا تو نظر آتا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سلمان نے اس کی چندیا پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ وہ غصے میں گھوما تھا کہ سلمان نے ایک اور تمانچہ جڑ دیا۔ وہ پوری قوت سے چیختے ہوئے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ اس کی آواز پر نوکروں کی ایک فوج جمع ہو گئی تھی۔ مگر وہ سب دور دور کھڑے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے کیوں کہ وہ ہوا سے لڑ رہا تھا۔ سلمان تو نوکروں کے قدموں کی آواز سنتے ہی دور ہٹ کر دیوار سے جا لگا تھا۔

''برادرم کیا ہوا؟'' دروازے کے پیچھے سے ایک نقرئی گھنٹیوں جیسی مدھور آواز آئی۔

رفعی نے ادھر توجہ ہی نہیں دی اور ہوا میں ہاتھ چلاتا رہا۔ سلمان نے محسوس کر لیا تھا کہ فاکیہ انگلی سے اس کے سر پر اور کبھی پیٹھ پر ہلکی سی ضرب لگا رہی ہے تا کہ آواز بھی نہ نکلے اور رفعی چونک بھی جائے۔ اس کی عقلمندی کام کر رہی تھی۔ دوسرے تو کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے مگر رفعی پاگل ہوا اٹھا تھا۔

''اسے پکڑو۔ سر پر پانی ڈالو.....تم سب منہ کیا دیکھ رہے ہو۔'' وہی آواز پھر سنائی دی۔ ''سر پر گرمی چڑھ آئی ہے۔''

''آپ اسے یہاں کچھ نہ کہیں کیونکہ یہاں میں بھی ہوں۔۔۔۔اسے جو بھی سزا دینا ہے گھر سے باہر لے جا کر دیں۔'' ایک تیز سرگوشی سی سنائی دی اور سلمان سمجھ گیا کہ یہ وہی جن کا بچہ ہے۔ پھر دخل دینے آ گیا۔

''برادرم! ہمارا آپ کا کوئی جھگڑا نہیں۔ آپ دخل نہ دیں تو بہتر ہے۔ آپ نے استدعا کی کہ اس کی بہنوں کو کچھ نہ کہا جائے، میں نے مان لیا۔ اب ہر بات تو ماننے سے رہا'' سلمان نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''یہاں اس کی خواہر بھی ہے۔ اسے کچھ ہو گا تو اسے تکلیف ہو گی اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔''

''باہر لے جا کر اسے ماروں گا تو کیا لاش ہوا میں اڑ جائے گی؟'' سلمان نے طنزیہ

انداز میں جواب دیا۔

''مرنا سب کا مقدر ہے۔اس وقت بات کچھ اور ہوگی۔نظروں کے سامنے مرتے دیکھنا اور بات ہے۔اسے باہر لے جاؤ۔'' وہی سرگوشی پھر سنائی دی۔

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔اسے باہر نکلنے کا موقع دیتے ہیں۔'' اس بار فاکیہ کی سرگوشی گونجی۔

''چل بھائی تُو بھی کیا یاد کرے گا۔تیری شہ رگ پر رکھا خنجر اٹھا لیتے ہیں۔۔'' کہہ کر سلمان باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

اسے باہر نکلتے دیکھ رفعی نے چیخ کر کہا۔''بھاگتا کہاں ہے۔تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''لگتا ہے ان کا دماغ پھر گیا ہے۔'' کسی نوکر کی آواز تھی مگر سلمان رکا نہیں۔وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اسے باہر آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ رفعی بھی باہر نکل آیا۔وہ سرخ رنگ کی مشین (کار) میں بیٹھا تھا۔اس نے رفتار بھی تیز رکھی تھی۔اندر سے شور شرابہ کی آوازیں باہر تک آئی تھیں۔

''آغائی!'' ایک شخص نے سلمان کو روک لیا۔

''چی می گوئی؟'' (کیا کہہ رہے ہو؟) سلمان نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مشین تند از ہوا پیمائی'' (کار ہوائی جہاز سے بھی تیز ہے) اس نے حیرت بھری نظروں سے جاتی ہوئی کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔''دیوانہ است'' (پاگل ہے)

''ببخشید متند بار دیگر توازہ بیدید'' (سوری' کیا آپ پھر سے فرمائیں گے) سلمان نے کہا۔

''دیوانہ است'' (پاگل ہے) کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

سلمان بھی مسکراتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔اسے یقین تھا کہ فاکیہ رفعی کو باہر لائی ہے اور وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔راستے میں ہی اس نے اسے روک لیا ہوگا اور رفعی نہ چاہتے ہوئے بھی بریک پر دباؤ بڑھا چکا ہوگا۔

سلمان کا اندازہ درست تھا۔کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اسے سرخ کار کھڑی نظر آ گئی۔وہ تیزی سے ادھر بڑھا۔نزدیک پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ رفعی اندر اسٹرنگ پر سر رکھے بیٹھا ہے۔سلمان نے کھڑکی پر جھک کر کہا''رفعی مجھ سے بدلہ نہیں لوگے؟''

رفعی نے چونک کر سر اٹھایا۔سلمان پر نظر پڑتے ہی اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔سلمان اگر ہوشیار نہ رہتا تو دروازے کی چوٹ سے وہ الٹ کر گر گیا ہوتا۔وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

کار سے باہر آتے ہی اس نے گالیوں کی بوچھار کر دی۔اس کی تیز آواز پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔اسی وقت ایک سرباز (سپاہی) تیزی سے نزدیک آیا اور چیخ کر بولا''گروہ ازمردم تُو خیابان جام شدند'' (لوگوں نے سڑک جام کر دی ہے) پھر نزدیک پہنچتے ہی بولا''چی است'' (کیا ہے)

سرباز کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر ہونے لگے کہ خواہ مخواہ قراول خانہ (تھانہ) جانا پڑ جائے گا۔سلمان بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔وہ اس سپاہی کو گواہ بنانے کی سوچ رہا تھا۔اس نے سرگوشی میں فاکیہ کو مخاطب کیا۔''فاکیہ! جوتا بازی ضروری ہے۔''

اس کا حکم پاتے ہی فاکیہ نے کام دکھا دیا۔چٹاخ کی آواز ابھری تھی اور رفعی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔آواز پر سپاہی نے بھی مڑ کر دیکھا تھا مگر طمانچہ مارا کس نے ہے یہ وہ بھی دیکھ نہ سکا۔طمانچہ کھا کر رفعی نے کلانتری (سنتری) کی طرف غصے سے دیکھا۔شاید اس نے سمجھا تھا کہ یہ طمانچہ سپاہی نے مارا ہے۔

اسے اپنی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے پا کر سپاہی کو بھی شاید غصہ آ گیا تھا۔وہ اس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ سپاہی کی گال پر طمانچہ پڑا۔سپاہی غصے سے پاگل ہوا تھا۔اس نے بھی ہاتھ گھما دیا۔سپاہی کے برابر میں ایک شریف آدمی کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔طمانچہ اس کی گال پر پڑا۔اسے بھی غصہ آ گیا،اس نے بھی طمانچہ گھما دیا مگر یہ طمانچہ ایک دوسرے آدمی کی گال پر پڑا۔اس نے بھی پیچھے رہنا منظور نہ کیا اور طمانچے کے جواب میں طمانچہ گھما دیا۔اب ایک عجیب وغریب لڑائی چھڑ گئی تھی۔سپاہی برابر والے سے بھڑا ہوا تھا۔برابر والے پر ایک دوسرا آدمی گھونسے برسا رہا تھا اور رفعی پر ایک تیسرا آدمی۔سب ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور ان کو الجھا رہی تھی فاکیہ۔رک رک کر وہ کسی نہ کسی ایک کے طمانچہ رکھ دیتی۔

ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ کلانتری مشین (پولیس موبائل) پہنچ گئی۔اس میں سے ایک سپاہی اترا ہی تھا کہ فاکیہ نے ایک طمانچہ اسے جڑ دیا۔وہ بھی مزاج کا تیز تھا۔اس نے بغیر دیکھے برابر والے پر گھونسا جما دیا۔افسر اترا ہی تھا کہ اس کی چندیا پر فاکیہ نے چٹاخ سے ہاتھ مارا۔

پولیس والے کسی بھی ملک کے ہوں مزاجاً برابر ہوتے ہیں۔انہوں نے ڈنڈا برسانا شروع کر دیا۔تبھی رفعی کے دماغ میں نہ جانے کیا آیا اس نے پوری قوت سے افسر کی ناک پر گھونسہ جما دیا۔افسر کی ناک سے خون پھوٹ پڑا۔وہ گالیاں بکتا ہوا اس کی طرف لپکا تھا کہ فاکیہ نے نعرہ لگا دیا ''رضا شاہ پہلوی بداست'' (رضا شاہ پہلوی بدمعاش ہے)

شہنشاہ کے خلاف عوامی غصہ تو پرورش پا ہی رہا تھا۔وہ ابل پڑا۔کسی نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہاں آس پاس کوئی عورت ہے نہیں پھر یہ زنانی آواز میں نعرہ کس نے لگایا۔

سپاہیوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان کی موجودگی میں کوئی شاہ کو برا کہے۔انہوں نے ڈنڈے سے توضع شروع کر دی۔کھینچ کھینچ کر ڈنڈے برسا رہے تھے۔پتا نہیں یہ ان کی غلطی تھی یا ناداستگی میں ڈنڈا رفعی کے سر پر لگا۔کئی چیخوں کے درمیان اس کی چیخ دب گئی،وہ تیورا کر گرا تھا مگر ڈنڈے بازی کم نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ کئی نوجوان پولیس والوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔وہ وقت تھا ہی ایسا۔لوگ شہنشاہ کے خلاف ہو چکے تھے اور پولیس والوں سے نفرت کا کھل کر اظہار کرنے لگے تھے۔

''سلمان بھاگ لو،یہ خبر دور دور تک پھیل گئی ہوگی۔پولیس کی نفری آتی ہی ہو گی۔'' فاکیہ نے کہا۔

سلمان خود بھی اب رکنا نہیں چاہتا تھا۔کیوں کہ رفعی کا سر جس انداز میں پھٹا تھا اور وہ جس طرح پڑا تھا۔اس کا بچنا محال تھا۔وہ اس کی جان لینا چاہتا تھا۔لے چکا تھا۔اسی خیال سے میں اب یہاں سے فرار کا سنتے ہی مجمع سے دور ہٹتا چلا گیا۔

اگلے روز کے اخبار میں خبر دیکھ کر سلمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔اخبار نے لکھا تھا کہ شاہ کے مخالفین کی ایک جماعت نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا۔جواب میں پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑی۔شہر کا مشہور رئیس رفعی بھی حملہ کرنے والوں میں شامل تھا۔شدید چوٹ آنے کی وجہ سے وہ مارا گیا۔

اس قضیہ سے نمٹ کر اب وہ ہلکا ہو گیا تھا۔رفعی جہنم واصل ہو چکا تھا۔اب زریں سے

کیا وعدہ پورا کرنا تھا۔فاکیہ سے کہنے ہی والا تھا کہ فاکیہ نے خود ہی یہ بات نکال لی۔''سلمان اب زریں کا بھی مسئلہ نمٹا ہی دو۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔جب کہو میں نکل چلنے پر تیار ہوں۔''

''وقت گنوانا انسانوں کا کام ہے،ہم تو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔جب کہو چل دوں گی۔''

''یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟''

''زرگوز کے جنگل میں۔''

''کوہ زرگوز؟'' سلمان نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں جناب۔اسی خطرناک جنگل میں جس کا نام سن کر ہر ایرانی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔وہیں ایک پرانا آتش کدہ ہے۔اسی آتش کدہ میں اس بدبخت نے پناہ لے رکھی ہے۔''

''تو آج ہی نکل چلتے ہیں تاکہ جلد یہ کام پورا ہو جائے۔''

❁

سلمان ریل کے ذریعہ خرم آباد کے لیے چلا تھا۔وہاں سے وہ ''آتو بوس'' (بس) کے ذریعہ جنگل تک بہ آسانی پہنچ جاتا۔پورے دو دن کا سفر طے کر کے وہ اس جنگل تک پہنچا تھا۔اونچی اونچی پہاڑیوں پر پھیلے اس جنگل میں ہر قسم کے درندے بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔مگر اسے درندوں سے کوئی خوف نہیں تھا۔وہ جانتا تھا کہ جب تک فاکیہ اس کے ساتھ ہے کوئی درندہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

جنگل کے اندر آخری آبادی تک بس جاتی تھی۔وہ وہاں سے پیدل چل پڑا تھا اور اب جنگل کے وسط میں تھا۔کافی دور جانے کے بعد فاکیہ نے کہا۔''بس اب ہم اس علاقے میں پہنچنے ہی والے ہیں۔کبھی یہاں آبادی ہوا کرتی تھی۔اسی لیے یہاں ایک آتش کدہ بھی بنایا گیا تھا۔اب وہ آتش کدہ ویران ہو گیا ہے۔درندوں کا مسکن ہے وہ۔اسی لیے اس بدبخت نے اس آتش کدہ کو اپنے تصرف میں لیا ہے تاکہ یہاں بیٹھ کر وہ شیطانی عملیات کرتا رہے۔''

''وہ کھاتا پیتا بھی تو ہوگا؟ یہ سب کہاں سے آتا ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''اس نے شیطانی عمل سے بہت قوت حاصل کر لی ہے۔اسی عمل کے زور پر وہ اپنے موکلوں سے سامان خورونوش منگوا لیتا ہے۔'' فاکیہ نے بتایا۔

''وہ آتش کدہ ہے کتنی دور؟''

''بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہی وادی میں وہ آتش کدہ ہے۔برسوں پہلے یہاں خوب رونق رہتی تھی۔لوگ دور دور سے یہاں آتے تھے۔''

سلمان فاکیہ سے باتوں میں مشغول تھا کہ اسے یکا یک فاکیہ نے روک لیا تب اسے وہ لوگ نظر آئے۔

پچاسوں کی تعداد میں ننگ دھڑنگ' لباس سے عاری پہاڑ کے دامن سے چوٹی تک وہ پھیلے ہوئے تھے۔ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کھوپڑی اور ایک ہڈی تھی۔وہ اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے نعرے لگا رہے تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔صرف وہ نظر آ رہے تھے۔

''ان سے نمٹو فاکیہ جلدی کرو۔ان کے تیور صحیح نہیں ہیں۔''

''یہ سب اس بد بخت کے موکل ہیں۔ڈرو نہیں میں انہیں سنبھال لوں گی۔'' فاکیہ نے حوصلہ دیا۔

ان کے چہرے اور انداز خوفناک تھے۔اس کا اثر تو پڑنا ہی تھا۔سلمان پر بھی خوف طاری ہونے لگا۔وحشی اس کے قریب آتے جا رہے تھے کہ ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔''رک جاؤ سلمان' تم ہماری قوت سے آگاہ نہیں ہو۔فاکیہ کی قوت میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔میں اسے مسل کر رکھ دوں گا۔میں اس کی اولاد ہوں جس نے زندگی دریافت کی۔میں اس کی اولاد ہوں جس کے ہاتھ میں موت کھیلتی تھی۔جس نے سمندروں کے سینے پر سفر کیا۔میں اس کی اولاد ہوں جس نے اناج دریافت کیا۔آگ دریافت کی۔تم لوگ میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔''

''ہم کیا ہیں یہ ابھی تمہیں معلوم نہیں ہے۔'' سلمان نے فاکیہ کا جملہ دہرا دیا۔

''ذرا غور سے دیکھو تمہارے گرد سانپ بچھوؤں نے رقص شروع کر دیا ہے۔''

سلمان نے دیکھا واقعی سانپوں کا جتھا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔پھر ایک بادل کا سرخ ٹکڑا بھی تیرتا ہوا اپنی طرف آتا ہوا اسے نظر آیا۔اسی کے ساتھ ایک چیخ بھی سنائی دی اور پھر اس پہاڑ کی طرف سے چیخوں کا شور بلند ہونے لگا۔وہ ننگ دھڑنگ لوگ اپنی جگہ رک گئے تھے۔اب ان کا رخ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔وہ سب مڑ کر پہاڑی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ان کی تقلید میں سلمان بھی ادھر ہی دوڑنے لگا۔سانپوں کے جتھے نے بھی رخ بدل لیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ سب کے سب واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں۔صرف سلمان سیدھ کے سفر میں تھا۔تبھی اندھیرے کا

سینا چیرتے ہوئے ایک روشنی بلند ہوئی اور پوری پہاڑی پر محیط ہو گئی۔اب سلمان پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔روشنی کی وجہ سے اسے وادی کا ایک ایک ذرہ صاف نظر آ رہا تھا۔وہ بخوبی ان دو ہیولوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک دوسرے کے سامنے ایستادہ تھے اور دور ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔

سلمان نے اتنی دور سے بھی پہچان لیا تھا کہ ان میں سے ایک ہیولا فاکیہ کا ہے اور دوسرا کسی مرد کا۔دونوں ایک دوسرے پر رہ رہ کر کچھ پھینک رہے ہیں۔رہ رہ کر چنگھاڑ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ جب کسی کو ضرب لگتی تھی تو وہ چیخ پڑتے تھے۔

یہ جنگ کافی دیر تک چلی۔سلمان کو لگا کہ اس جنگ کا خاتمہ کسی ایک کی موت کے بعد ہی ہو سکے گا۔تبھی مردانہ آواز سنائی دی۔اس آواز میں کرب شامل تھا۔اس نے چیخ کر کہا تھا۔''یگ یگ سے مردوں کی دشمن' ہر دور میں مردوں کو دھوکا دینے والی۔طاقت کو سلب کر لینے والی بدذات تُو نے پھر سے مکاری کے وار سے ایک مرد کو زخمی کر دیا۔آہ میں مر رہا ہوں مگر میں اپنے پُرکھوں کی طرح' اپنے پیش رو کی طرح تجھے آزاد نہیں چھوڑوں گا۔تجھے کئی یگ کے لیے قید کر جاؤں گا۔''

اس آواز کی طرح ایک اور سسکتی ہوئی آواز آئی۔''سلمان بھاگو میں مقید ہو رہی ہوں مگر اس بدذات کو بھی اپنے ساتھ یگوں کے سفر پر لیے جا رہی ہوں تاکہ وہ معصوم بچہ آزاد ہو جائے جس کی وجہ سے ہم یہاں آئے تھے۔اس طرح زریں بھی آزاد ہو جائے گی۔اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔یوں بھی اس کے قیدی عفریت آزاد ہیں کہیں وہ تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں اس لیے بھاگو۔آگے تمہاری قسمت۔''

سلمان نے پہچان لیا تھا کہ وہ آواز فاکیہ کی تھی اس لیے وہ واپس مڑا تھا اور سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔اس نے عقب کی وادی میں دھماکا سا سنا تھا۔جیسے کوئی بہت بڑی عمارت زمیں بوس ہوئی ہو۔مگر وہ رکا نہیں تھا۔دوڑتا رہا تھا۔وہ کہاں جائے گا۔اسے خود پتا نہیں تھا۔بس دوڑے جا رہا تھا۔وہ سمجھ چکا تھا کہ فاکیہ اس کی دسترس سے نکل چکی ہے۔وہ ہمیشہ کے لیے اسے کھو چکا ہے۔اب ایک بار پھر سے وہ تنہا ہو گیا ہے۔اور قسمت اسے دوبارہ زک پہنچانے کا سامان کرے گی۔اسے گرداب حوادث پھر سے اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

وہ بھاگتے بھاگتے ایک ایسی جگہ آ گیا تھا جہاں پہاڑیوں کے درمیان جا بجا کھائیاں

بھی تھیں۔ ہر پہاڑی کے بعد ایک کھائی تھی۔ اور کھائی بھی ایسی کے اس میں گرنے والا جھاڑیوں میں گم ہو کر رہ جائے۔ اوپر سے نیچے کی زمین نظر نہیں آتی تھی۔ کہیں وہ بھی انجانے میں کسی کھائی میں نہ جا گرے اس لیے اب وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے دوڑنا بھی موقوف کر دیا تھا۔ تبھی اسے ایک بڑا سا غار نظر آیا۔ یوں بھی اس پر تھکن بری طرح طاری ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ستانا چاہتا تھا تاکہ اپنی سانس کو درست کر لے۔ اسی خیال سے وہ اس غار میں داخل ہو گیا۔

وہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ اور حبس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ صاف ستھرا بھی تھا۔ وہ اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

وہ کافی اندر پہنچ چکا تھا کہ اسے ایک تاریک گوشے سے کسی کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے آواز کے مخرج کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ حیرت کا ایک اور جھٹکا اسے لگا۔ کسی نے اس کا نام لیا تھا۔ وہ حیرت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔

''آغائی سلمان' کچھ دیر کے لیے میرے پاس آجاؤ۔'' کونے سے آواز آئی۔

سلمان نے چونک کر ادھر دیکھا۔ گھانس پھونس کے بستر پر ایک لاغر سا بوڑھا لیٹا ہوا تھا۔

''سلمان' میرے پاس آ کر کچھ دیر بیٹھ لو' سب سمجھ آجائے گی۔'' اس بوڑھے نے کہا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ جیسا لاغر دیکھائی دے رہا تھا اسکی آواز اتنی ہی تیز تھی۔

سلمان اس بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''ایسا کرو اور نزدیک آؤ۔ آج میں تمہیں ایک راز بتانا چاہتا ہوں۔ یہ راز تمہاری تمام پریشانیوں کو دور کر دے گا۔ میں اپنے گناہوں کا اقرار کرنا چاہتا ہوں۔ بس کچھ دیر میرے قریب بیٹھ جاؤ۔''

اس کی خواہش پر سلمان اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تمہارے سامنے جو کچھ کہوں گا' سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا پھر مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے کیونکہ آج میں عمر کے جس مقام پر کھڑا ہوں' وہاں پہنچ کر لوگ جھوٹ سے توبہ کر لیتے ہیں۔ میں بھی جوانی کی منزل سے گزر کر بڑھاپے کی

آخری حد پر پہنچ چکا ہوں۔ اب تو صرف قبر کا خیال اور عاقبت کی فکر ہے اور جسے عاقبت کی فکر ہو وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟ میں بھی جو کچھ بتانے والا ہوں' اس میں رتی بھر بھی جھوٹ نہیں ہے۔

کبھی میں خوب جھوٹ بولا کرتا تھا پر اب نہیں' جوانی میں۔ یہ قصہ بھی میری جوانی کا ہے۔ ان دنوں میں ہرمیزگان میں رہا کرتا تھا۔ یہ تو جانتے ہی ہو کہ وہ بندر عباس کے قریب ہے۔ ہمارے علاقے پر آتش پرست زمینداروں کی اجارہ داری تھی جبکہ مزارعے مسلمان تھے۔ مسلمانوں میں غربت زیادہ تھی۔ ان کے پاس زمینیں بھی نہیں تھیں اس لیے وہ ان مجوسیوں کی زمین بٹوارے پر لیتے تھے۔ سال بھر محنت کرتے اور فصل کے وقت زمیندار کو آدھی فصل دے دیتے تھے۔ میرے دادا بھی اردون فرجامی کی زمین پر کاشت کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ کام پسند نہیں تھا۔ انہی دنوں میرے ایک عزیز کی شادی میں آئے شوکت فرہانیش سے ملاقات ہوئی۔ شوکت ہمارا رشتے دار تھا۔ وہ شہر میں رہتا تھا اور ایک عزیز کی شادی میں آیا ہوا تھا۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اگر کاشتکاری نہیں کرنا چاہتے تو میرے ساتھ چلے چلو۔ میں تو پہلے ہی اکتایا ہوا تھا۔ شادی کی تقریب ختم ہوتے ہی اس کے ساتھ چل پڑا۔

اس وقت تک مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کرتا کیا ہے۔ اس پر بھروسہ تھا اس لیے گھر سے نکل پڑا تھا۔ گاؤں سے ہم بندر عباس آئے۔ وہاں تین دن تک اس کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ پھر چوتھے دن ہم ریل پر سوار ہو گئے۔ راستے میں مجھے اس نے بتایا تھا کہ وہ خرم آباد میں نوکری کرتا ہے۔ وہاں افرادی قوت کی بہت ضرورت ہے اسی لیے وہ مجھے وہاں لے جا رہا ہے۔ اس وقت تک مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ خرم آباد ہے کہاں؟ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ خرم آباد اس کوہ زرگوز میں ہے اور زرگوز بندر عباس سے بہت دور ہے۔

اس وقت تک زرگوز بھی شاہ کی کمزوری کی وجہ سے روسیوں کی عملداری میں تھا اس لیے وہاں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ ہم بھی بڑی آسانی سے خرم آباد پہنچ گئے۔ خرم آباد کی تجارت پر پوری طرح شیرازی لوگ قابض تھے۔ بازار کی تمام دکانیں شیرازیوں کی تھیں۔ ان میں زرتشی دکان دار بھی تھے اور مسلمان بھی۔ شوکت بھی ایک مسلمان دکان دار کے ہاں ملازم تھا۔ اس نے دوڑ دھوپ کر کے مجھے بھی ایک دکان میں نوکری دلوا دی۔ میری تنخواہ پچیس تومان ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی' آج کے ہزار تومان کے برابر۔ میں نے تخمینہ لگا لیا تھا کہ صرف پانچ تومان خرچ کروں گا اور باقی رقم بچا لیا کروں گا۔ چھ مہینے میں

اتنی رقم جمع ہو جائیں گی کہ میں جب گھر جاؤں گا تو لوگ حیران رہ جائیں گے اور میری مثالیں دیں گے۔

انسان کچھ سوچتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہے۔ میری قسمت میں بھی خوشیاں نہیں تھیں۔ خرم آباد آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جنگ کے امنڈتے ہوئے بادلوں نے خرم آباد کا رخ کر لیا۔ گو کہ وطن پرست ابھی دور تھے لیکن وہ جس طوفانی رفتار سے بڑھ رہے تھے اس نے ہر ایک کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسی خوف نے افواہوں کو جنم دینا شروع کیا۔ ہر روز ایک نئی خبر سننے کو ملتی۔ کبھی یہ افوہ گردش کرتی کہ ایرانی وطن پرست بڑھ رہے ہیں اور کبھی یہ سنائی دیتا کہ روسی شہر کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ فاتح فوج جب شہر میں داخل ہوتی ہے تو شہر والوں سے کیسا سلوک کرتی ہے' اسی خوف نے سب کو دہلا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ شہر خالی ہو رہا تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا اس لیے کہ ابھی میرے پاس بہت کم رقم جمع ہوئی تھی۔ لیکن میرا خواب ادھورا رہ گیا اور یکا یک شہر میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ افواہ پھیلی تھی کہ روسی فوج کے سپاہی عام لباس میں شہر کے آس پاس جمع ہو رہے ہیں۔ جیسے ہی زار کے دربار سے اشارہ ملے گا' وہ سب شہر میں گھس آئیں گے۔ ان کی مدد کے لیے مزید فوج ہوا پیمائی سے کودنے والی ہے۔

اس افواہ کے پھیلتے ہی میں بھی اب ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جنگ کی وجہ سے تمام راستے پہلے ہی بند تھے لیکن بھاگنے والے پھر بھی شہر خالی کر رہے تھے۔ قافلوں کی صورت میں خرم آباد سے پیدل ہی بھاگ رہے تھے۔ ان قافلوں کی منزل بندر عباس تھی کیونکہ وہاں سے ایران یا عرب کے کسی بھی شہر میں بہ آسانی جایا جا سکتا تھا۔ میرا قافلہ بھی خرم آباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بندر عباس اور خرم آباد کے درمیان ایک بہت بڑا جنگل تھا۔ یہی زرگوز کا جنگل۔ اس گھنے جنگل میں جنگلی درندے بھی تھے اور خونخوار قبیلہ بھی جو انسانوں کا شکار کرنے میں ماہر مانے جاتے تھے۔ اسی لیے لوگ قافلے کی صورت میں سفر طے کر رہے تھے۔ تین روز کا سفر طے ہو چکا تھا لیکن ابھی تک جنگل ختم نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کے پیر ورم آلود تھے مگر زندگی کی چاہت انہیں کھینچے لیے جا رہی تھی۔ میں بھی انہیں لوگوں میں تھا۔ جسم میں چلنے کی طاقت بلکل نہیں تھی۔ کئی بار سوچا کہ بہت سارے دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی آرام کے لیے ٹھہر جاؤں پھر پیچھے سے جب

کوئی دوسرا قافلہ آئے گا تو اس کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر کوئی قافلہ ادھر سے نہ گزرا تو؟ یہ کوئی شاہراہ تو تھی نہیں۔ گھنے جنگل میں قافلے والے خود ہی راستہ بناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ بھی صرف سمت کے اندازے سے۔ رات کو ستارے رہنما تھے تو دن کو دھوپ میں کھڑے پیڑوں کے سائے لیکن آخر کب تک؟ یوں بھی اب قافلے میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ آدھے سے زیادہ لوگ تھک کر راستے ہی میں ہمت ہار گئے تھے۔ بلآخر میری ہمت بھی جواب دے گئی اور میں تھک کر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ کسی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ قافلے والے اپنی دھن میں آگے بڑھ گئے۔

چار دن کے مسلسل سفر اور فاقے نے مجھ پر غشی سی طاری کر دی تھی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں نہ جانے کتنی دیر تک پڑا رہا۔ تبھی مجھے ایسا لگا کہ کوئی مجھے گدگدی کر رہا ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ان دنوں بڑے بڑے پوش (لباس) پہننے کا فیشن تھا۔ میری بے ہوشی کے دوران میں ایک خرگوش کسی طرح میرے پوش میں گھس گیا تھا۔ میں نے بمشکل تمام خرگوش کو پکڑ کر باہر نکالا اور اسے ہاتھ میں تھام کر دیکھنے لگا۔ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے چھٹپٹا رہا تھا اور میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اسے بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن ایک بہت بڑی مجبوری آڑے آ رہی تھی۔ وہ جانور تھا اسے بغیر ذبح کیے میں کھا نہیں سکتا تھا اور ذبح کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر اسے چھوڑنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے قلم تراش کی یاد آ گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ کو جیب میں ڈالا اور ٹٹول کر باہر نکالا۔ پھر پیر سے خرگوش کو دبا کر اس کے نازک سے گلے پر قلم تراش چلا دیا۔ اسے ذبح کرنے کے بعد میں نے سوکھی لکڑیاں جمع کیں اور پتھر رگڑ کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد آگ جل اٹھی۔ میں نے جلدی جلدی خرگوش کے قتلے کاٹ کر سینکے اور مر بھوکوں کی طرح کھانے لگا۔ بھوک کے عالم میں بغیر نمک مرچ کے بھی وہ من وسلویٰ لگ رہا تھا۔ پورا خرگوش چٹ کرنے کے بعد جسم میں نئی توانائی آ گئی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں اکیلا تھا اس لیے اپنی مرضی کے مطابق بڑھ رہا تھا۔ اب درندوں کا بھی خوف نہ تھا اور نہ قبائل کا۔ اس لیے ہر جانب سے ہوشیار ہو کر قدم بڑھا رہا تھا۔

مجھے قبائل کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا۔ اگر وہ پکڑ لیتے تو میرے خون سے وہ اپنی دیوی کو غسل دے چکے ہوتے۔ میں ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا اور مسلسل سفر کر رہا

تھا۔ چلتے چلتے شام ہوگئی۔ قافلے کے ساتھ تھا تو رات میں بھی سفر جاری رہتا تھا مگر اب میں اکیلا تھا۔ رات جنگل مزید خطرناک ہو جاتا ہے اس لیے ایک بڑے سے پیڑ پر چڑھ کر اس کے موٹے دو شاخے کے درمیان اس طرح بیٹھ گیا کہ اگر نیند میں جسم اپنا توازن کھو بھی دے تو میں نیچے نہ گروں۔

وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزاری اور صبح ہوتے ہی پھر چل پڑا۔ چلتے ہوئے بھی میری نظریں پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان تلاش کر رہی تھیں۔ جنگلی پھلوں سے کسی حد تک بھوک رفع کر لیا تھا پھر بھی مزید کی ہوس باقی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلنے تک میں ایک پہاڑی سلسلے تک پہنچ گیا۔ اب جنگل کا گھنا پن بھی کم ہو چکا تھا۔ پہاڑی سلسلے پر چڑھتے چڑھتے شام نے رات کا چولا پہن لیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا لیکن میں رکا نہیں اس لیے کہ پہاڑی کے دوسری جانب مجھے ایک چھوٹی سی بستی نظر آ گئی تھی۔ پہاڑی پر چڑھنے سے پہلے ہی میں نے پیٹ بھر جنگلی پھل کھا لیے تھے کہ بھوک مر جائے کیونکہ آگے کچھ ملے گا یا نہیں' اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ اب بستی نظر آئی تھی تو اناج ملنے کی امید بندھ گئی تھی۔ وہاں میں کئی دن تک رہا اور اس بستی کی ایک لڑکی سے تعلق قائم کر لیا۔ ہنسی خوشی دن گزر رہے تھے کہ اس میں ماں بننے کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی تو اس سے میرا دل بھر گیا اور میں اسے چھوڑ کر بھاگ آیا۔ یہ اسی کی سزا ہے کہ میں اسی علاقے میں چکرا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤں مگر نکل نہیں پاتا۔ قسمت نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ تم ایک کام کرو۔ کسی طرح اس بستی تک جاؤ اور وہاں کے سردار رحیم کی بیٹی سے رابطہ کر کے کہو کہ وہ مجھے معاف کر دے۔"

"میں ایسا ضرور کروں گا۔" سلمان نے کہا۔

"مجھے امید ہے تم ایسا ہی کرو گے ورنہ میری طرح تم بھی اسی جنگل میں مقید ہو جاؤ گے۔ میں اس بدقسمت کی بددعا کا اسیر ہوں اور تم میری بددعا کے اسیر بن جاؤ گے۔ یہ جنگل ایسا ہی ہے۔ بددعا کا جنگل۔"

سلمان مسکرا کر رہ گیا۔ ایک دن وہاں ٹھہرنے کے بعد وہ نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ نہایت تیز رفتاری سے بڑھتا جا رہا تھا کہ بستی سے بہت پہلے ایک کھنڈر نظر آ گیا۔ وہ کھنڈر کسی عالیشان حویلی کا تھا۔ اس بیابان میں کھنڈر بہت عجیب سا لگا۔ وہ اس کھنڈر کے پاس سے ہوتا ہوا

آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک نئے خیال نے دہلا دیا۔ بستی نظر آتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ خوشی نے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کر لی تھی۔ "قبائل" کا خوف بھی دل سے محو ہو گیا تھا۔ اب اسے خیال آیا تھا کہ کہیں یہ بستی قبیلے والوں کی نہ ہو۔ اس خوف نے سر اٹھایا تو اس کے قدم تھم کر رہ گئے۔ اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور لوٹ کر کھنڈر میں آ گیا۔ آرام کے لیے یہ جگہ بری نہیں تھی۔ صبح کی روشنی پھیلنے کے بعد ہی گاؤں والوں کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پہاڑی ہیں' قبائل ہیں یا مسلمان۔ بدھ بھی ہو سکتے تھے۔ مذہب کی طرح ان قوموں کی شکلیں بھی جدا تھیں۔ مجوسی' پہاڑی اور قبائل کی شکلیں ملتی جلتی تھیں مگر مسلمان اور زرتشی بالکل ایک نظر آتے تھے۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ مسلمان عربوں کی اولادیں تھیں اور ہندو مشرقی سمت سے آئے تھے۔ یہ بستی ان میں سے کس کی ہے' اس کا پتا تبھی لگ سکتا تھا جب وہ انہیں دن کی روشنی میں دیکھتا۔ ان قوموں کے بارے میں اب تک صرف سنا تھا پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ انہیں دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ اس بات نے اسے تقویت دی تھی اور وہ کھنڈر میں داخل ہو گیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو پھلانگتا ہوا اندر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے وہاں وہ اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اور بھی ہے، اس احساس نے اسے ٹھٹک جانے مجبور کر دیا۔ اس نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف ویرانی تھی صرف جھینگروں کی جھائیں گونج رہی تھی۔ ستاروں کی مٹمیلی روشنی میں کھنڈر کا ماحول عجیب سا احساس جگا رہا تھا مگر وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ خوفزدہ تو وہ ہوتے ہیں جنہیں سہارے کی امید ہو۔ اس کے پاس تو سر چھپانے کا آسرا بھی نہیں تھا۔ تبھی تو وہ اس بے خوفی سے اس کھنڈر میں آ گیا تھا۔

کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر اڑتے ہوئے جگنوؤں کے جھنڈ دلچسپ منظر پیش کر رہے تھے۔ دس بیس جگنو ادھر سے آتے تو دس بیس ادھر سے۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ وہ شاید دروازے کے آثار تھے جنہیں پھلانگ کر سلمان اندر داخل ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں کچھ دور چلتے ہی اسے سردی کا احساس ہوا۔ ایسا لگا تھا جیسے ہر جانب سے سرد ہوائیں اٹھ اٹھ کر اس کے جسم سے ٹکرا رہی ہیں۔ اس نے اسے پہاڑی علاقے کی مرطوب ہوا کی کارستانی سمجھا اور آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دور جاتے ہی اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کھنڈر میں ایسا حصہ بھی ہے۔ وہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال کی منقش دیواروں میں ایسے پتھر جڑے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پتھروں کی روشنی سے ہال خاصا روشن نظر آ رہا تھا۔ اس نے اسی ہال میں ڈیرا ڈال

دینے کا سوچا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔اس ہال میں پہنچتے ہی یہ احساس یکسر ختم ہو گیا تھا کہ یہ کسی کھنڈر کا حصہ ہے۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی محل میں کھڑا ہے۔وہ ہال کے وسط میں کھڑا ادھر ہی بڑھتا چلا گیا تا کہ یہ دیکھ سکے کہ وہاں ہے کیا۔ابھی سیڑھیوں کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ عقب سے ایک دربان نے نیزہ بڑھا کر اس راستہ روک لیا۔اس نے چونک کر اس کا جائزہ لیا۔اس کے جسم پر شاہی لباس تھا۔سر پر بڑی سی زرد پگڑی تھی۔اس نے درشت لہجے میں کہا۔''لوٹ جاؤ جوان' ورنہ میں تمہیں موت کی نیند سلا دوں گا۔''

سلمان نے لوٹ جانا مناسب سمجھا۔ابھی مڑا ہی تھا کہ ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔''انہیں احترام کے ساتھ لے آؤ۔''

سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ایک نہایت خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔وہ زرد پیرہن میں ملبوس تھی۔بالوں میں گیندے کے پھول لگے تھے۔گورے چہرے پر گیندے کا پھول اور اجلی رنگت پر زرد پیرہن اس حسینہ کے حسن کو دو آتشہ بنا رہی تھی۔وہ حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی نے کہا۔''شاہزادی آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔آیئے!''

سلمان کسی کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشارے پر سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔اب اسی چوب دار نے ادب سے سر جھکا کر اسے سلامی دی۔وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔سیڑھیوں کی دیواروں میں ویسے پتھر نہیں تھے جو ہال کی دیواروں میں جڑے ہوئے تھے۔سیڑھیوں پر اندھیرا تھا۔اس اندھیرے کو دور کرنے کے لیے دیوار میں بنے طاقچے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔اس کے آگے آگے وہ حسینہ تھی۔اس نے طاقچے کے نزدیک پہنچ کر دیا اٹھا لیا۔اب اس نے غور کیا۔دیا ایک تشت میں رکھا تھا جو شاید پیتل کا تھا۔لڑکی نے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو پھیلا کر اس پر تھال رکھ دی اور ہاتھ کو قدرے بلند کر لیا پھر سلمان طرف دیکھ کر بولی۔''آیئے بے خوف ہو کر چلتے رہیے۔''

وہ خوفزدہ تو تھا نہیں اس لیے اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔اوپر پہنچ کے اسے ایک بڑا سا گلیارا نظر آیا۔اس گلیارے کی دونوں جانب بہت سارے کمرے بنے ہوئے تھے۔ہر کمرے کے دروازے پر ایک ایک لڑکی کھڑی تھی۔اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ حسینوں کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں تھی جسے قابل تعریف' حسن کا مرقع نہ کہا جائے۔ان سب کی ایک اور بات مشترک تھی۔سب نے زرد پوش پہن رکھی تھیں اور سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی

لیکن ان سب کے سر جھکے ہوئے تھے جیسے سلمان کوئی قابل تعظیم ہستی ہے اور ان کی اٹھی ہوئی نگاہیں اسے گراں گزریں گی۔سلمان ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔کچھ دور جاتے ہی اس کی رہبر نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔''شاہزادی آپ کی منتظر ہیں۔''

سلمان نے اس دروازے کی جانب دیکھا۔دروازہ بند تھا۔وہ دروازہ دوسرے دروازوں سے قدرے بڑا تھا اور اس پر تانبے کی چادر منڈھی ہوئی تھی۔چادر منقش تھی۔ابھرتے ہوئے سورج کو نہایت خوبصورتی سے تانبے کی چادر پر کندہ کیا گیا تھا۔اس کے دروازے پر دو قوی ہیکل خواجہ سرا کھڑے تھے۔ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں لیکن ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔سلمان نے جیسے ہی قدم اٹھایا' ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔لڑکی باہر ہی کھڑی رہ گئی اور سلمان اندر داخل ہو گیا۔

اندر کا منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ایسی سجاوٹ اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔زمین پر ایسا غالیچہ بچھا ہوا تھا جس میں پیر دھنستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کمرے میں ایک بڑا سا چھپر کھٹ بچھا ہوا تھا جسے گلاب کے پھولوں سے اس طرح سجایا گیا تھا جیسے حجلہ عروسی ہو۔اس چھپر کھٹ پر کوئی بیٹھا تھا لیکن سلمان اسے دیکھنے سے قاصر تھا کیونکہ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔سرسری نظروں سے کوئی دیکھتا تو وہ یہی سمجھتا کہ چھپر کھٹ پر سرخ کپڑوں کی بڑی سی گٹھری رکھی ہوئی ہو۔زرتار کپڑوں کے شوخ رنگ اشارہ دے رہے تھے کہ وہ کوئی عورت ہے مگر کون ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے سلمان آگے بڑھا۔تبھی اس گٹھری میں ہلچل سی مچی اور وہ سیدھی ہو گئی۔پھر وہ دھیرے دھیرے نیچے اتری اور اس کے قریب آ کر جھک گئی۔لڑکی نے قدیم طریقے سے سلمان کے پیروں کو چھو کر ہاتھ اپنے سر پر پھیرا تھا۔ایسا کرتے ہوئے اس نے صرف مجوسی عورتوں کو دیکھا تھا۔ان کا عقیدہ ہے کہ شوہر کے پیروں کی دھول سے بیوی کو اپنا سر سجانا چاہیے' یہی سہاگن کی پہچان ہے لیکن وہ تو اس کا شوہر نہیں تھا اس لیے جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

''شہزادے کب تک مجھے تڑپاؤ گے؟ بس کرو! اب اور نہ تڑپاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

اس حسن جہاں سوز کو دیکھ کر سلمان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔اس نے دنیا میں لاکھوں حسین چہرے دیکھے تھے۔خرم آباد' سرموز' اصفہان کی حسیناؤں کا حسن دیکھا تھا لیکن جو حسن اور

معصومیت اس چہرے پر دیکھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ گنگ سارہ گیا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا اور خدا کی صناعی کی داد دیتا رہا۔ وہ کوئی معمولی چہرہ نہیں تھا۔ سلمان اس چہرے کے حسن میں کھو کر خود کو بھی بھول گیا تھا۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے اس کے ذہن پر دھند سی چھا گئی ہے۔ وہ بے خودی کے عالم میں کھڑا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی رہی پھر بولی۔ ''میری جان! اپنے گلے میں بندے کپڑے کو کھول کر رکھ دو۔''

پتا نہیں اس کی آواز میں ایسا کون سا سحر تھا کہ سلمان نے اپنے گلے میں لٹکتے جوشن کبیر کو کھول کر الگ رکھ دیا تبھی گویا اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا اور بے اختیار ہو کر وہ اس سے لپٹ گئی۔ اس نے سلمان کو بھینچ بھینچ کر کہنا شروع کیا۔

''میری جان! تم نے مجھے بھلا دیا۔ اپنی جان کو بھول گئے؟ تم نے تو ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔''

اس وقت سلمان کو کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کن حالات میں یہاں ہے۔ احساس تھا تو صرف اتنا کہ ایک روح افزا لمس اسے نئے جذبوں سے روشناس کرا رہا ہے۔ لڑکی کا جسم سرد تھا مگر سلمان کے اندر گرمی بھرتی جا رہی تھی۔

سلمان کے دماغ میں بس ایک ہی صدا گونج رہی تھی کہ یہ لمحے یوں ہی ساکت ہو جائیں اور اس کی زندگی اپنی آخری حد پر پہنچ جائے۔ اس پر گویا نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں انجانے راستوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا تبھی لڑکی اس سے الگ ہو کر دور کھڑی ہو گئی۔

''یاد آیا میں کون ہوں؟ یہ بات یاد آئی؟'' وہ معصوم انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''تم کون ہو؟ واقعی میں تمہیں پہچان نہیں سکا ہوں۔'' سلمان نے بے چارگی سے کہا۔

''میں..... میں شہنشاہ زعما پرست کی بیٹی شیمی ہوں اور تم زرشتاپ ہو۔ شاعر۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو ایک معمولی استاد مدرسہ کا بیٹا ہوں۔''

''تمہارا اقبال ہمیشہ سے بلند رہا ہے لیکن میں تمہارے اس جنم کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو تمہارے پچھلے جنم کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ اس جنم میں تم شاعری کرتے تھے۔ تمہارے ہاتھوں میں جادو تھا۔ تمہاری کہی ہوئی ہر نظم اپنی مثال آپ ہوتی۔ ہر شعر لاجواب

ہوتا تھا۔ تمہاری اسی فنکاری نے مجھے تم سے پیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تم بھی مجھ سے پیار کرنے لگے تھے۔ مجھے اپنی دلہن بنانا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ہمارا ملن یزداں کو منظور نہ تھا اور وہ دلخراش حادثہ ہو گیا۔ جانتے ہو وہ حادثہ اتفاقی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی سازش تھی اور اس سازش کو رچنے والا نشو تھا۔ پور بندر کا شہزادہ نشو۔ اسی نے افواہ اڑائی کہ کسی نے تمہاری جان لے لی ہے پھر بھی وہ مجھے حاصل نہ کر سکا اور میں نے زہر کھا لیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مان لیا آپ کی بات سچ ہے مگر میں نہیں مانتا اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں دوسرے جنم کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ انسان مر جاتا ہے تو روح اس کا جسم چھوڑ کر برزخ میں چلی جاتی ہے۔ قیامت تک اسے وہیں رہنا ہے۔ اگر دوسرے جنم کی بات صحیح ہے تو آج دنیا میں اتنے سارے لوگ نہ رہتے۔ یہ بڑھتی ہوئی آبادی صاف بتا رہی ہے کہ روح کبھی واپس نہیں آتی۔ یہ آواگون کا فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''یقین کرو میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں تمہاری ہوں۔ صدیوں سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ سوچ کر دیکھو۔ تمہارا یہ جنم بام میں ہوا۔ بام جو یہاں سے سیکڑوں میل دور ہے۔ وہاں سے قسمت نے تمہیں کھینچا اور تم خرم آباد پہنچ گئے۔ ابھی وہاں زیادہ عرصہ گزار نہیں پائے تھے کہ اس شہر کو چھوڑنا پڑا۔ قسمت نے تم سے سواری کا راستہ چھڑوا دیا اور اس جنگل میں لا پھینکا۔ یہ جنگل جہاں تہذیب یافتہ لوگ شاذ و نادر ہی آتے لیکن تم آ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ دراصل تمہیں میری کشش کھینچ لائی ہے۔ یہ دکھی دل کی پکار تھی جس نے تمہیں کھینچ لیا ہے۔ تم میرے ہو اور میرے رہو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ ابھی تم تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔ میں کل تم سے بات کروں گی۔ آؤ یہاں لیٹ جاؤ۔'' کہہ کر اس نے سلمان کا ہاتھ پکڑا اور لے جا کر چھپر کھٹ پر لٹا دیا۔

اس چھپر کھٹ پر لیٹ کر سلمان کو ایسا لگا گویا وہ بادلوں پر لیٹ گیا ہوں۔ ایسا نرم ملائم بستر اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ جسم پر تھکن کا غلبہ تھا اتنا طویل سفر اس نے پیدل طے کیا تھا۔ پیروں پر ورم آ گیا تھا۔ جوتے پھنس رہے تھے۔ شہزادی نے اس کے پوشش (جوتے) اتارے اور اپنی نرم نرم انگلیوں کو پیروں کی انگلیوں میں پھنسا پھنسا کر سہلانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس اور آرام کے احساس نے کچھ ہی دیر میں اس پر غلبہ پا لیا اور وہ دنیا اور مافیہا سے

بے خبر ہو گیا۔

وہ بے خبر سو رہا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے شہزادی کی نرم و نازک انگلیاں اس کے پاؤں کو سہلا رہی ہیں۔ اسے گدگدی سی محسوس ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ گویا اچھل پڑا تھا اس لیے کہ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جس کمرے میں وہ سویا تھا' وہ کمرا تو سجا سجایا تھا۔ زمین پر غالیچہ اور دروازوں کھڑکیوں پر اطلس و کمخواب کے پردے تھے۔ چھت سے فانوس آویزاں تھا اور وہ قیمتی ساگوان کی لکڑی سے بنے چھپر کھٹ پر سویا تھا جبکہ اس وقت وہ کمرہ بالکل خالی تھا اور وہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی پائنتی پر ایک کتا کھڑا تھا جس نے شاید پیر چاٹے تھے جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''یہ کیا ماجرا ہے؟'' وہ کچھ دیر تک یہی سوچتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہی سینے پر رکھی کوئی چیز نیچے گری۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اس کے گلے کا تعویذ تھا جسے اس نے اتار کر دیوار پر لٹکا دیا تھا اس وقت اسے مطلق خیال نہ آیا کہ وہ تعویذ وہاں سے سینے پر کیسے آیا؟ ادھر توجہ دینے کے بجائے اس نے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔

اس وقت وہ اس شکستہ محل کے اس ٹوٹے ہوئے کمرے میں تھا جس کی چھت سے آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے رات کی بات کو ایک حسین خواب سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تبھی یاد آیا کہ اسے بستی والوں کے بارے میں پتا کرنا ہے۔ اگر وہ کسی خونخوار قبیلے کی بستی ہے تو اسے خاموشی سے نکل جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے نہایت ہوشیاری سے کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو پھلانگتا ہوا باہر آیا اور بستی کی جانب نظر ڈالی۔

بستی والے جاگ چکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ عورتیں بھی نظر آئیں۔ اکا دکا مرد بھی دکھائی دیئے۔ نہ تو ان کے چہرے چھوٹے تھے اور نہ وہ ٹھگنے قد کے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ قبائل ٹھگنے اور چوڑے چہرے والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قد آور' گندمی رنگت کے تھے۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لوگ زرتشی' آتش پرست یا مسلمان ہیں۔ اس اندازے نے اسے تقویت دی اور وہ اس بستی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

بستی میں داخل ہوتے ہی اسے لوگوں نے گھیر لیا۔ ہر چہرے پر حیرت تھی۔ وہ آریائی زبان میں سوال کر رہے تھے۔ سلمان نے ٹوٹی پھوٹی یہ قدیم زبان سیکھ لی تھی۔ اس لیے کہ بام میں آریائی اچھے خاصی تعداد میں تھے۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آریائی میں انہیں اپنی کہانی سنا دی کہ

میں خرم آباد سے بھاگ کر آ رہا ہوں۔

جب انہوں نے یہ سنا کہ اس نے رات اس کھنڈر میں گزاری ہے تو وہ سب دنگ رہ گئے۔

''وہ کھنڈر تو آسیب زدہ ہے وہاں ہم دن میں بھی نہیں جاتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ بھی ادھر چلا جائے تو وہ خون تھوک کر مر جاتا ہے۔'' ایک پکی عمر کے شخص نے کہا۔

سلمان کے ذہن میں چھنا کا سا ہوا۔ رات کا ایک ایک منظر اسے یاد آنے لگا۔ شہزادی اور اس کی کنیزیں' وہ پرشکوہ آرام دہ بستر پھر شہزادی کا لمس۔

''کہاں کھو گئے؟ کیا وہاں کچھ دیکھا تھا؟'' ایک دوسرے شخص نے پوچھا۔

''جی..... نہیں..... نہیں، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔'' سلمان نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ کے سوال جواب میں الجھے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں' پیٹ کی آگ بجھانا ضروری تھا۔ اس نے بے دھڑک کھانے کے لیے مانگ لیا۔ پکی عمر والے نے اسے ساتھ لیا اور ایک جھونپڑے میں پہنچا۔ ابھی وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک عورت نے اس کے سامنے ایک چوڑا تختہ بچھا دیا اور پھر واپس چلی گئی۔ دوبارہ آئی تو اس کے ہاتھ میں چلو ماہی تھا۔ سلمان گویا اس پر ٹوٹ سا پڑا۔ کئی دن کے بعد اناج میسر آیا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر کھایا اور پھر ہاتھ دھو کر جو سویا تو دوپہر گزر گئی۔ وہ خود سے نہیں اٹھا تھا۔ اسی پکی عمر والے نے بیدار کیا تھا۔

''لگتا ہے کئی دن سے سوئے نہیں تھے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کل رات سویا ضرور ہوں مگر اناج کی شکل آج دیکھی ہے اسی کا نشہ طاری ہو گیا تھا۔'' سلمان نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر بھوک لگے تو بتا دینا۔''

''ابھی تو بھوک نہیں ہے۔'' سلمان نے جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ تو بتائیں اس بیابان میں یہ محل کس کا ہے؟''

''یہ محل شہنشاہ پرست کا تھا۔ اس علاقے پر اسی کی حکمرانی تھی۔ یہاں ایک شہر بھی تھا جو اب مٹ چکا ہے۔ مغربی پہاڑی کے نیچے اب بھی اس شہر کے آثار باقی ہیں۔ کہتے ہیں پرست ایک خدا ترس شہنشاہ تھا۔ وہ غریبوں پر مہربان اور ظالموں کے لیے قہر تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی

جس کا نام شیمی تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے حسن کا شہرہ سن کر دور دور سے شہزادے آئے تھے۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ اسے منتخب کر لیا جائے گا لیکن شہزادی نے تو پہلے ہی کسی کو منتخب کر لیا تھا۔ اس کے دل میں ایک شاعر بسا ہوا تھا۔ جس کے کلام میں جادو تھا وہ الفاظ کو تراش کر ایسا روپ دے دیتا تھا کہ پڑھنے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ اس کے اسی فن نے شہزادی کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے پیار میں دیوانی ہو گئی تھی۔ شہنشاہ کو اس پیار کا علم نہیں تھا اس نے آس پاس کے تمام شہزادوں کو دعوت دے دی۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادی انہی میں سے کسی ایک کو منتخب کر لے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ دعوت میں شرکت کے لیے شہزادے پہنچ ہی رہے تھے کہ شہزادی نے شہنشاہ کو اپنی پسند بتا دی۔ یہ بات ایک شہزادے کو بہت بری لگی۔ اس نے اپنی ہتک محسوس کی اور اس شاعر کی موت کا سامان کر دیا۔ وہ باغ میں بیٹھا ایک خیال کو نظم کر رہا تھا کہ قریبی پہاڑی کے اوپر سے ایک چٹان اس پر آ گری اور وہ اسی جگہ تڑپ کر مر گیا۔ یہ خبر جب شہزادی تک پہنچی تو اس نے پرانی روایت کو تازہ کر دیا نہایت خفیہ طریقہ پر اس نے رات کے اندھیرے میں پرستش والے الاؤ میں کود گئی۔ دھواں اور آگ دیکھ کر سپاہی باغ میں پہنچے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ ''جوہر'' کی رسم ادا کر دی گئی تھی اور شہزادی اپنے محبوب کے نام پر خودکشی کر چکی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ شہر مٹ گیا۔ خاندان کا خاندان ختم ہو گیا۔ محل ملبے کا ڈھیر بن گیا مگر شیمی کی روح اب بھی اس کھنڈر میں منڈلا رہی ہے۔'' اس شخص نے کہانی ختم کر کے گہری سانس لی۔

سلمان خیالوں میں ڈوب گیا۔ کیا وہ شیمی کی روح تھی۔ اگر وہ شیمی کی روح تھی تو اس کی طرف کیوں جھکی تھی' اسے اس میں ایسی کون سی خوبی نظر آ رہی تھی کہ شہزادوں کو ٹھکرانے والی اس جانب جھک گئی تھی۔ یا پھر واقعی وہ اس کے پچھلے جنم کا پریمی تھا۔ اگر پچھلا جنم ہوتا ہے تو پھر اسلام میں اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا گیا؟ یکا یک اسے یاد آیا اس روز قبرستان میں بھی تو ایسا ہی ایک خواب نظر آیا تھا فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ اس میں فاکیہ شہزادی کے روپ میں نظر آئی تھی۔ کہیں یہ بھی فاکیہ کی ہی تو شرارت نہیں ہے؟ وہ اس خیال پر مسکرا اٹھا کہ فاکیہ ابھی بھی اس کے ساتھ ہے بھلے ہی کسی مجبوری کی وجہ سے سامنے نہیں آ رہی ہے۔

''کیوں بھائی کیا سوچ رہے ہو؟'' بڑے میاں نے پوچھا۔

''یہاں سے بندر عباس کتنی دور ہے؟''

''یہی کوئی پچاس میل۔ اگر چاہو تو کسی سے ٹٹو خرید سکتے ہو لیکن ابھی نہیں۔ تمہیں کم سے کم ایک ہفتے آرام کی ضرورت ہے۔ تمہارے پیر پھٹ چکے ہیں' خود پر ظلم نہ کرو۔''

''آپ نے اب تک اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔'' سلمان نے پوچھا۔

''مجھے علی کہتے ہیں۔ میں یہاں کا سردار ہوں۔ ویسے یہ بھی بتا دوں کہ ہم کسی اجنبی کو اپنے ہاں ٹھہرنے نہیں دیتے صرف تمہارے گلے میں پڑے تعویذ نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمہیں مہمان بنا لوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

اس جنگل میں بھی مسلمان بستے ہیں' سلمان نے اس بارے میں سنا تو ضرور تھا اور اس کی دعا بھی یہی تھی کہ مسلمان قبیلے سے ملاقات ہو۔ خدا نے اس کی سن لی اور ملاقات ہو گئی لیکن حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ان کے انداز و اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ داڑھی تو کوئی بھی رکھ سکتا ہے۔

''برادرم علی! آپ لوگوں کی زبان' پہناوا' انداز و اطوار کچھ بھی تو مسلمانوں جیسا نہیں ہے۔''

''کئی سو برس پہلے جب ملک شام میں بغاوت عروج پر تھی' ہمارے اجداد وہاں سے ترک وطن کر کے محفوظ علاقے میں جانا چاہتے تھے مگر بھٹک کر ادھر آ گئے۔ یہاں امن تھا اس لیے یہیں کے ہو گئے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہمارے اندر تبدیلی آتی رہی۔ ہم نادانستگی میں آس پاس کی معاشرتی زندگی اپناتے چلے گئے پھر ایک میرا ہی گاؤں نہیں' اس جنگل میں اور بھی مسلمانوں کے کئی گاؤں آباد ہے، پورا جنگل مسلمانوں سے بھرا ہے۔ ہمی نے تو قبائل کو پیچھے دھکیلا ہے حالانکہ مسلمانوں میں مقامی بھی ہیں جنہیں صوفیوں نے اسلام کا درس دیا۔''

''اس جنگل میں آپ کو ڈر نہیں لگتا؟''

''جس نے اس کے علاوہ کچھ دیکھا ہی نہ ہو تو اسے یہ سب اپنا پنا ہی لگے گا ناں! میں کئی بار خرم آباد جا چکا ہوں میرے علاوہ میرا بیٹا رحیم بھی باہر کی دنیا میں رہ کر آیا ہے پھر دوسرے لوگ بھی خرم آباد آتے جاتے رہتے ہیں پھر بھی ہمیں جنگل سے پیار ہے اسی پیار نے جنگلی درندوں سے ٹکرانے اور دشواریوں میں آسانیاں تلاش کرنے پر ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ ہم باہر کی دنیا میں زیادہ وقت گزار نہیں سکتے ہیں۔''

''جنگلی درندوں کے علاوہ آپ کو اور کس کس خطرے سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے؟''

سلمان نے اصل بات کی جانب آتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں خطرے تو قدم قدم پر ہیں کس کس کا ذکر کروں؟''

''کبھی بھوت وغیرہ بھی دیکھا ہے؟''

''بھوت تو نہیں' بھٹکتی ہوئی روح کے بارے میں سنا ہے لیکن اس کی حقیقت بھی اب جان گیا ہوں۔ بزرگوں سے سنتا آیا ہوں کہ اس کھنڈر میں آسیب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم سب ادھر جاتے ہوئے کتراتے ہیں مگر آپ نے اس کھنڈر میں رات گزار کر بتا دیا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔''

اب سلمان اس بے چارے کو کیسے بتاتا کہ نہیں میں جھوٹا ہوں' اس کے بزرگ سچے تھے۔ واقعی اس کھنڈر میں روحیں موجود ہیں انہوں نے مجھے بھی گھیرنے کی کوشش کی تھی۔

''اچھا آپ آرام کریں۔'' کہہ کر علی چلا گیا۔

سلمان بستر پر لیٹا شیمی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ شاید یہ تھکن کا نتیجہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ تبھی اسے احساس ہوا جیسے کوئی جھنجوڑ رہا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شیمی کی کنیز سامنے کھڑی تھی۔

''شہزادی نے آپ کو یاد کیا ہے چلیے!'' اس نے ادب سے کہا۔

''چلو!'' سلمان کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔

''پہلے اپنے گلے میں لٹکتے ہوئے کپڑے کے اس ٹکڑے کو اتار دیجیے۔'' کنیز نے کہا۔

سلمان نے فوراً گلے سے تعویز کو اتارا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ علی کے گھر سے کھنڈر کی دوری کافی تھی مگر اسے ایسا لگا کہ قدم اٹھاتے ہی اس کھنڈر میں پہنچ گیا ہو۔ یہ کیسا راز ہے' ایسی انہونی کیسے ہوئی؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا پھر وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک ہی صورت بسی ہوئی تھی۔ وہ شہزادی کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ کچھ دیر میں متلاشی نگاہوں کو قرار مل گیا۔ وہ نظر آ گئی۔

شہزادی کا پروقار چہرہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ اس نے ایک ادا سے سلمان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم آ گئے..... مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ مجھ سے دور رہ ہی نہیں سکتے۔ کیوں یہ سچ ہے ناں؟''

''آں..... ہاں۔'' سلمان نے چونک کر کہا۔ اس کی نگاہیں شہزادی کے چہرے کا احاطہ

کیے ہوئے تھیں۔ فاکیہ اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ بادلوں میں لہراتی بجلی کی طرح گھنیری زلفوں کے درمیان چمک رہا تھا۔ چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھیں۔ ان جھلملاتے ہوئے قطروں نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا اور بہ زبان خموشی اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا رہا۔ اسے بس یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ واقعی اس کے انتظار میں تھا۔ وہی اسکی منزل ہے۔ اس کی پکار پر وہ چونکا ضرور تھا مگر محویت ٹوٹی نہیں تھی۔ وہ اب بھی اسے دیکھے جا رہا تھا کہ شہزادی نے پھر کہا۔

''میرے پیارے کیا سوچنے لگے..... آؤ! آگے بڑھو..... مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔ میں کب سے تڑپ رہی ہوں۔ مجھے اپنا لو۔ میں ہی تمہاری ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ اس کی بانہیں پھیلی ہوئی تھیں۔

پتا نہیں سلمان کے اندر کہاں سے حوصلے کا سمندر امنڈ پڑا۔ وہ جو عورتوں کے قرب سے ناآشنا تھا' یک بارگی اس کی طرف بڑھا اور اس کی بانہوں میں سما گیا۔

وہ جس وارفتگی کے عالم میں سلمان سے ہم آغوش ہوئی تھی' اس نے تفس کی رفتار بڑھا دی تھی۔ سلمان کی رگ رگ میں لاوا سا دوڑنے لگا تھا۔ پورا جسم بھٹی بن چکا تھا۔ ہر موئے تن سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

اس پر جنون سا طاری ہونے لگا تھا کہ اس کے اندر جیسے کسی نے کروٹ لی۔ اسے یاد آ گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں کسی غیر عورت کا قرب حرام ہے، پھر یہ عورت بھی نہیں ہے' ایک بھٹکی ہوئی روح ہے۔ مجھے اس سے دور رہنا چاہیے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ زبان پر خود بخود لاحول ولاقوۃ کا ورد جاری ہو گیا۔ پتا نہیں اس کی وہ کون سی نیکی تھی جو اس وقت کام آ گئی اور نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ وہ کھنڈر ہی میں کھڑا تھا مگر منظر بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ وہ سجا سجایا کمرا تھا اور نہ وہ کنیزوں کا جھرمٹ۔ وہی ٹوٹی پھوٹی دیواریں' مکڑیوں کے جالے' پرندوں کے گھونسلے۔ ایک پل میں تمام مناظر بدل گئے تھے۔ وہ الجھ کر رہ گیا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ شہزادی کیوں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے؟ وہ روح ہے اور میں جیتا جاگتا آدمی۔ ہمارا ملن ناممکن ہے پھر بھی وہ مجھے کیوں اپنانا چاہتی ہے۔ اگر وہ فاکیہ ہے تو پھر ایسا کھیل کیوں کھیل رہی ہے؟ پہلے تو اس نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا۔ وہ بہکانے کی کوشش ضرور کرتی مگر بہکتے قدموں کا رخ بھی موڑ لیتی تھی اور بہکنے کا سامان بھی باعزت

طریقہ سے فراہم کرتی تھی۔ آج تک اس نے بیہودگی کی طرف نہیں دھکیلا تھا جب کہ یہ سیدھے بیہودگی کے سمندر میں ڈوبو رہی ہے۔

اس قسم کے خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے اور وہ تیزی سے بستی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر رحیم پر پڑی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اسی کی طرف آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے رحیم؟'' سلمان نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

''میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔ کیا کھنڈر کی جانب چلے گئے تھے؟''

''ہاں! کوئی خاص کام تھا کیا؟''

''سنا ہے آپ بندر عباس جانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ دراصل مجھے اصفہان جانا ہے اور پھر وہاں سے اپنے گھر۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ خرم آباد تو دیکھ چکا ہوں مگر بندر عباس نہیں دیکھا' وہ بھی دیکھ لوں گا؟''

''اپنے والد سے پوچھ لو۔''

''میں ان سے پوچھ چکا ہوں۔ بس آپ رضامندی ظاہر کر دیں۔ صرف اتنا کہہ دیں مجھے بندر عباس میں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ بھلے ہی وہاں پہنچ کر مجھے چھوڑ دیں۔ میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں۔ ایک دو سال میں لوٹ آؤں گا۔ اور جب لوٹوں گا تو میرے پاس ڈھیر سارے تومان ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے تمہارے ابا سے بات کروں گا۔''

اتنی دیر میں وہ بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ رحیم کے جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی اس کی ملاقات علی سے ہوگئی۔ وہ سلمان ہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ اس نے سلمان کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''رحیم نے آپ سے کچھ کہا؟''

''جی ہاں! وہ میرے ساتھ جانا چاہتا ہے۔''

''جوان بچہ ہے میں اسے روک نہیں سکتا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ساتھ لے لیں۔ دراصل جنگل کا راستہ اکیلے آدمی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ اسی لیے میں اسے اجازت نہیں دے رہا تھا ورنہ وہ تو کب سے ضد کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے اسے میرے ساتھ کر دیں۔ میں اسے بندر عباس تک پہنچا دوں گا۔ مگر

آپ کو ایک کام کرنا پڑے گا۔''

''کیا؟''

''فضل نامی ایک پردیسی برسوں پہلے اس گاؤں میں آیا تھا۔''

''ہاں' وہ ایک مکار اور فریبی تھا۔''

''نہیں وہ ایک اچھا آدمی تھا اور ایک مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔''

''تو سنو۔۔۔ رحیم میرا بیٹا نہیں نواسہ ہے۔ وہ بدبخت اسی کا باپ ہے۔''

''رحیم کی ماں؟''

''وہ بے چاری انتظار کرتے کرتے مر گئی۔''

''جو ہو گیا اسے بھول جائیے اور اسے معاف کر دیجئے۔''

''وہ تمہارا کون تھا؟'' علی نے بکوے تیور سے پوچھا۔

''کوئی نہیں مگر انسانیت کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے، میں اسی رشتے سے معافی کا خواستگار رہوں، آپ معاف کریں گے تبھی اس کا عذاب کم ہوگا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو جاؤ میں نے' میرے خدا نے اسے معاف کیا۔''

''اچھا ہوا کہ میرے جانے سے پہلے آپ نے اسے معاف کر دیا۔''

''ان باتوں کو چھوڑو۔ رحیم کو ساتھ لے جاؤ اگلی فصل کے بعد میں بندر عباس جاؤں گا تو اسے واپس لے آؤں گا۔'' کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

اگلے دن علی نے دو ٹٹوؤں کا انتظام کر لیا۔ قیمت بھی اسی نے ادا کی تھی۔ ٹٹوؤں کی صحت بتا رہی تھی کہ وہ تیز رفتار ہیں۔ سلمان کو بھی پسند آئے تھے۔ علی نے کھانے پینے کا سامان دو بڑی پوٹلیوں میں باندھ دیا۔ ایک داؤ (درانتی کی شکل کا مگر وزن دار ہتھیار) بھی ساتھ دے دیا تھا کہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کر سکے۔ جنگلی درندوں سے مقابلے میں کام آئے۔

وہ رات سلمان نے سوتے جاگتے گزاری اس لیے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزادی پھر نہ بلا لے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ رات پرسکون گزری۔ شہزادی یا اس کی کنیزوں نے اسے تنگ نہیں کیا۔ شاید وہ لاحول سے ڈر گئی تھیں۔ یوں بھی بدروحیں شیطان کے زیر اثر ہوتی ہیں اور شیطان لاحول سے پناہ کا طالب ہے' سلمان خوب گہری نیند سویا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ فاکیہ نہیں ہو سکتی۔ پھر کون ہے یہ سوال اسے الجھائے رہا مگر اس رات وہ جی بھر کر سویا۔

آنکھ کھلی تھی جھنجوڑنے پر۔سورج نکلنے سے پہلے ہی رحیم نے بیدار کر دیا تھا۔توشہ تیار تھا۔تمام سامان پوٹلیوں میں بندھے تھے۔ٹٹوؤں پر کاٹھی باندھی گئی اور وہ دونوں اس بستی سے نکل پڑے۔

دھوپ پھیلنے تک وہ ایسے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔جہاں سے جنگل کا گھنا پن کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔اب بڑے بڑے پیڑوں کی جگہ کٹیلی جھاڑیاں اور کھائیاں تھیں۔یہ علاقہ زیادہ خطرناک تھا۔ذرا سی غفلت موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔اس لیے انہوں نے دانستہ رفتار سست کر لی تھی۔سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔کوئی پگڈنڈی وغیرہ بھی نہ تھی کہ وہ اس کے سہارے چلتے۔بس اندازے سے مغرب کی سمت بڑھت جا رہے تھے کہ ایک چیخ سنائی دی۔ سناٹے میں انسانی آواز! وہ بری طرح چونک گئے اور ٹھٹک کر چیخ کی سمت کا اندازہ کرنے لگے۔ تبھی پھر وہی چیخ کی آواز ابھری۔وہ چیخ نسوانی تھی۔دونوں اسی طرف دوڑ پڑے۔

سلمان جھاڑیوں سے بچتا بچاتا بھاگ رہا تھا کہ پھر ایک بار چیخ کی آواز ابھری۔اس بار وہ آواز بہت نزدیک تھی' ایسا لگا تھا کہ اگلی جھاڑیوں کے پیچھے کوئی ہے۔سلمان کانٹوں کی پروا کیے بغیر جھاڑیوں میں گھس گیا۔لاتعداد خراشیں آئیں لیکن وہ دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ادھر پہنچتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔وہ منظر ہی ایسا تھا۔آج تک اس نے صرف سنا تھا کہ اجگر انسانوں' جانوروں کو جکڑ لیتا ہے مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔کافی لمبا چوڑا اجگر سانپ (اژدھا) ایک لڑکی کے جسم کو اپنی جکڑ میں لیے ہوئے بل کھا رہا تھا۔

''اگر اسے روکا نہیں گیا تو لڑکی کی ہڈیاں کڑکڑا کر ٹوٹ جائیں گی۔''رحیم جو نہ جانے کب آ کر برابر کھڑا ہو گیا تھا' بولا۔

سلمان نے پھرتی سے پیٹھ پر بندھے داؤ کو کھینچا اور اس اژدھے پر پل پڑا۔دو تین وار کرتے ہی اجگر نے اپنی جکڑ ڈھیلی کر دی۔وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور غصے میں اپنے سر کو بار بار پٹک رہا تھا۔وہ مڑ کر وار کرنا چاہتا تھا مگر سلمان نے اسے موقع نہیں دیا۔اس نے مزید دو تین وار کر دیئے۔اجگر کا بھاری جسم کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ہر ٹکڑا الگ الگ تڑپ رہا تھا۔اس نے ادھر سے نظریں ہٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔لباس سے وہ مقامی نظر آ رہی تھی لیکن چہرے کی تراش بہت عمدہ تھی' رنگت بھی عام پہاڑیوں کی طرح زردی مائل نہ تھی بلکہ سرخ مائل تھی۔اگر اچھے کپڑے پہنے ہوتی تو اس کی خوبصورتی مزید نکھر آتی۔

''تمہاری بستی یہاں سے قریب ہے کیا؟''رحیم نے لڑکی سے پوچھا۔

''آں ہاں.....اس پہاڑی کے پیچھے ہماری بستی ہے۔''لڑکی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں۔''سلمان نے کہا۔

''نہیں.....اگر میں وہاں گئی تو وہ مجھے مار دیں گے۔''لڑکی کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔

سلمان نے رحیم کی طرف دیکھا تو اس نے سرگوشی میں کہا۔''اس نے کسی سے تعلق قائم کر لیا ہو گا۔''

''نہیں نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔''لڑکی کی قوت سماعت غضب کی تھی۔اس نے رحیم کی بات سن لی تھی۔''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں کنواری ہوں۔''

''تم زرتشی ہو؟''رحیم نے سوال کیا۔

''نہیں قبائلی ہوں۔''لڑکی نے جواب دیا۔

''لیکن تمہاری شکل تو قبائلی ایسی نہیں ہے۔''

''میں سردار کی بیٹی ہوں۔''

''اوہ!''رحیم نے گہری سانس لے کر کہا پھر سلمان سے بولا۔''قبائلیوں کے اپنے قوانین ہیں۔اپنا اصول زندگی ہے۔اپنے علاقے میں اجنبی کو برداشت نہیں کرتے لیکن طاقتور کے آگے فوراً جھک جاتے ہیں۔انہیں مہمان بنا کر اتنی عزت دیتے ہیں جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔عزت افزائی کا اندازہ اس سے کر لیں کہ مہمان جتنے دن رہے گا سردار کی بیوی اس کی خدمت کرے گی اور سردار آنکھ اٹھا کر بھی بیوی کی طرف نہیں دیکھے گا۔شاید کوئی روسی یا عرب ان کی بستی میں پہنچ گیا ہو گا' یہ اسی کی بیٹی ہے۔''

سلمان نے گہری نظروں سے لڑکی کا جائزہ لیا۔

''تم واپس کیوں نہیں جانا چاہتیں؟''رحیم نے پوچھا۔

''بابا! میری شادی زبردستی رانگا سے کرنا چاہتے ہے اور رانگا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ہمارا قبیلہ دوسرے قبیلے سے الگ ہے۔ہم اجنبیوں سے اتنی نفرت بھی نہیں کرتے۔ ہمارے گاؤں کے کئی افراد نے دھرم بھی بدلا ہے۔کچھ مجوسی بن گئے ہیں تو کئی مسلمان۔آس پاس

کی بستیوں سے بھی ہمارا رابطہ ہے۔ میں تو کسی اچھے آدمی سے شادی کروں گی۔'' پھر وہ یکا یک میری طرف مڑی اور بولی۔ ''آغا' تم مجھ سے شادی کرلو گے؟''

سلمان نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں نہیں میں تم سے کیسے شادی کرلوں۔ کیوں کرلوں؟''

''مجھے تم بہت اچھے لگے ہو' بہادر بھی ہو' کرلو ناں! میں تمہاری خوب خدمت کروں گی۔ جیسے رکھو گے' رہوں گی۔ رکھو گے ناں!''

''یا اللہ! یہ کس مصیبت نے مجھے گھیر لیا۔'' سلمان نے دل ہی دل میں کہا پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''لڑکی! کیا نام ہے تمہارا؟ ہم پردیسی ہیں بہت دور جارہے ہیں کسی اور کو تلاش کرو۔''

''میرا نام منکا ہے اور میں کسی دوسرے کو تلاش نہیں کروں گی۔ یزدان نے جب تم سے ملاقات کرادی ہے تو میں کسی دوسرے کو تلاش کیوں کروں؟'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

سلمان نے اسے لاکھ سمجھایا مگر وہ اس کی بات ماننے پر بالکل تیار نہ تھی' کمبل ہوگئی تھی۔ ایسا کمبل جسے سلمان چھوڑنا چاہتا تھا مگر وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً انہیں اسے بھی ساتھ لینا پڑا۔

رحیم نے مشورہ دیا تھا کہ اسے بندر عباس لے جاکر چھوڑ دیا جائے۔ اسی خیال کے تحت سلمان نے اسے ساتھ لے لیا اور ٹٹوؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں ٹٹو کھلے میدان میں ہری ہری دوب چر رہے تھے۔ آہٹ پاکر انہوں نے سر اٹھایا' انہیں دیکھا اور پھر ایسے بگٹٹ بھاگے کہ سلمان اور رحیم دم بخود رہ گئے۔ یکا یک وہ کیوں بھڑکے اس بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ سلمان بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ رحیم بھی ساتھ دینے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ کٹیلی جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے ان ٹٹوؤں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ شاید ان کی قسمت اچھی تھی کہ رحیم کی عقل مندی کام آگئی۔ اس نے دونوں ٹٹوؤں کو ایک ہی رسی میں باندھا تھا۔ وہ جب تیزی سے بھاگے تو درمیان میں ایک پیڑ آگیا اور دونوں پھنس گئے۔ وہ بھاگتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے اور انہیں کھینچتے ہوئے لے کر چلے لیکن میدان پار کرتے ہی وہ پھر اڑ گئے۔

یہی ٹٹو جو اب تک کسی پالتو کتے کی طرح اشارے پر چل رہے تھے اب اڑیل پن پر اتر آئے تھے۔ کسی بھی طرح میدان سے آگے بڑھنے پر راضی نہ تھے۔ سلمان اور رحیم پسینے میں شرابور ہوچکے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر منکا مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ نے سلمان کے غصے کو

بھڑکا دیا اور اس نے قمچی سے ٹٹو کو پیٹنا شروع کردیا۔ اس پر جنون طاری ہوگیا تھا۔ ٹٹو بھی بری طرح اچھلنے لگا تھا۔ رسی زیادہ دیر ٹٹو کی اچھل کود برداشت نہ کرسکی اور ٹوٹ گئی۔ دونوں ٹٹو الگ ہوگئے۔ الگ ہوتے ہی دونوں دو سمتوں میں بھاگے۔ سلمان ان کے پیچھے پھر دوڑتا کہ مینکا نے روک لیا۔

''کیوں پریشان ہورہے ہو' یہ جانور ہیں' انسان نہیں۔ اپنی مرضی کے آگے کسی کی نہیں سنتے' جانے دو ہم پیدل ہی چلیں گے۔'' منکا نے کہا۔

سلمان بری طرح تھک گیا تھا۔ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ مرد کو عورت کے سامنے شکست کھا جانا بہت کھلتا ہے۔ منکا کی موجودگی میں ٹٹوؤں نے اسے شکست دی تھی' اس کا اسے بہت غصہ تھا مگر کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ اگر بولتا تو منکا اسے بے وقوف سمجھتی' اس لیے خاموش تھا۔

''کیا سارا دن یہیں گزارنا ہے۔ اب چل بھی دو۔'' منکا نے کہا۔

بہ حالت مجبوری سلمان کھڑا ہوگیا اور وہ پھر سے سفر کرنے لگے۔ تینوں خاموشی سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ آہستہ آہستہ پہاڑی علاقہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اب وہ میدانی حصہ میں پہنچ چکے تھے مگر اب تک کوئی بستی نظر نہیں آئی تھی۔ سورج بھی اب غروب ہونے والا تھا۔

''رات گزارنے کا انتظام کرو۔ یہاں دور دور تک آبادی نہیں ہے۔'' منکا نے کہا۔

وہ اسی علاقے کی تھی۔ آس پاس کا حال ان سے بہتر جانتی تھی اس لیے سلمان نے میدان میں ہی پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کرلیا۔ یوں بھی صبح سے لگاتار سفر کررہے تھے۔ جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ ایک جگہ پسند کرکے وہ بیٹھ گیا۔ رحیم سوکھی لکڑیاں جمع کرنے لگا تاکہ الاؤ جلایا جاسکے۔

''الاؤ جلانا کیا ضروری ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''آگ جلتی رہے گی تو کوئی درندہ قریب نہیں آئے گا۔'' رحیم نے جواب دیا۔

یہاں کوئی بھی جنگلی درندہ نہیں آئے گا۔ آپ بے فکر ہوکر سو سکتے ہیں۔ یوں بھی مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میں جاگ کر پہرہ دوں گی۔'' منکا بولی۔

''اور اگر سوگئی تو؟ نہیں بھئی میں ایسا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہوں۔'' سلمان نے اس کی بات کو رد کرکے رحیم کو الاؤ جلانے کا اشارہ کیا۔

رحیم نے چقماق رگڑ کر آگ جلانے کی پوری کوشش کرلی مگر حیرت انگیز طور پر چقماق

کی رگڑ سے ایک بھی چنگاری نہیں نکلی۔سلمان نے بھی کوشش کر ڈالی۔یہ عجیب بات تھی۔چقماق ہلکی سی رگڑ پر چنگاری پیدا کر دیتا ہے مگر اس چقماق نے آگ جلائی اور نہ چنگاری پیدا کی۔تمام چقماق ناکارہ ہو گئے تھے۔ایسے وقت میں سلمان کو ماچس کی کمی شدت سے محسوس ہوئی کہ وہ اس طرح دھوکا نہیں دیتی۔

مجبوراً انہیں بغیر الاؤ کے ہی لیٹنا پڑا۔یہ ایک خطرناک بات تھی مگر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔جسم تو پہلے ہی سے تھکا ہوا تھا۔لیٹتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔وہ بے خبر سو رہے تھے کہ یکا یک سلمان کی آنکھ کھل گئی۔شاید یہ چھٹی حس کا کمال تھا کہ خطرے کا احساس ہو گیا' اس نے آنکھیں کھول دیں۔رحیم برابر میں سویا تھا مگر اس وقت اس کی جگہ خالی تھی۔سلمان نے منکا کی تلاش میں گردن موڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔منکا بھی غائب تھی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔تبھی اس کی نظر کچھ دوری پر موجود ایک ہیولے پر پڑی اور وہ چیخ اٹھا۔وہ کسی تیندوے یا اسی قبیل کے جانور کا ہیولا تھا۔وہ جھکا ہوا کچھ چاٹ رہا تھا۔تاروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں وہ منظر اتنا بھیانک تھا کہ سلمان بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جانور کسی انسان کے جسم پر منہ مار رہا ہے۔اس بیابان میں صرف وہی تین تھے۔ان میں سے ہی کوئی اس کے آگے پڑا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس جانور کے ہتھے کون چڑھا ہے۔منکا کے جسم پر چار خانوں والی پوش تھی اور رحیم نے بھی چار خانوں والی عبا پہن رکھی تھی اس لیے دور سے کپڑے بھی شناخت کرانے سے قاصر تھے۔نزدیک جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔پہلے جانور کو بھگانا ضروری تھا۔اسے بھگانے کے لیے سلمان نے پتھر اٹھا لیا۔ابھی صرف ہاتھ بلند کیا تھا کہ اس جانور نے زقند بھری۔سلمان کو ایسا لگا کہ وہ اس پر آ کر گرنے والا ہے۔دہشت سے ہاتھ پیر سن ہو گئے۔وہ تیورا کر گر پڑا پھر اسے کچھ یاد نہیں کیونکہ اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اسے ہوش آیا تو منکا برابر میں بیٹھی تھی۔اس نے جھنجوڑ کر سلمان کو ہوش میں لایا تھا۔

''یہ.....یہ کیا ہوا؟'' منکا نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''کیا.....کیا ہوا؟'' سلمان نے الجھے ہوئے ذہن سے جواباً کہا۔

''میں ضرورت کے لیے ادھر جھاڑیوں کے پیچھے گئی ہوئی تھی کہ چیخ سنی۔میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک تیندوا نظر آیا۔وہ رحیم کو منہ میں دبا کر لے جا رہا تھا۔'' منکا نے کہا۔

''رحیم.....رحیم کہاں ہے؟'' سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔

''ادھر.....وہاں اس کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی ہے۔'' منکا کی آواز میں اب بھی ارتعاش تھا۔اس کے چہرے سے خوف جھانک رہا تھا۔سلمان مرد تھا۔ایسے وقت میں اسے ہی اس کا حوصلہ بڑھانا تھا۔اس نے لاش کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔''ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے' یہ تو ازلی سچ ہے۔''

وہ لاش کے نزدیک پہنچ کر دیکھنے لگا۔اس بے چارے کا نرخرہ ادھڑا ہوا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آس پاس کہیں بھی ایک قطرہ خون کا نظر نہیں آ رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جانور گوشت خور نہیں صرف خون پینے والا تھا۔ایسا عجیب جانور کون سا تھا' سلمان اس پر غور کرنے لگا لیکن مطلق سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ خطرناک جانور کہیں آس پاس ہی چھپا ہوا تھا۔اس لیے وہاں ٹھہرنا بھی مناسب نہ تھا۔سلمان نے جلدی جلدی قبر کھودی اور رحیم کی لاش کو دبا دیا۔سورج ابھی نکلا نہیں تھا پھر بھی اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کر لیا اور منکا کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

سورج نکلنے تک بوغور پہنچ چکے تھے۔وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔مسلمانوں کی آبادی تھی۔انہوں نے ان دونوں کو پردیسی جان کر خوب خاطر داری کی۔وہ دو دن تک وہاں ٹھہرے۔ان کی منزل ابھی دور تھی۔بندر عباس تک پہنچنا تھا کہ وہیں سے ریل ملتی۔

اگلے دن سلمان نے منکا کو ساتھ لیا اور نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔سلمان جو رقم لے کر چلا تھا وہ یہاں کام آ رہی تھی۔اسی رقم سے اس نے سواری کے لیے دو ٹٹو خرید لیے اور انہی ٹٹوؤں پر سوار ہو کر بندر عباس تک پہنچے۔

بندر عباس' تہران کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ان دونوں نے وہاں دو دن قیام کیا اور پھر اصفہان کے لیے روانہ ہو گئے۔منکا کی رفاقت نے اس کے لیے سلمان کے دل میں نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ ابھی بہن کے پاس نہیں جاؤں گا۔تہران میں ہی ٹھہرنے کا پروگرام بنا لیا۔

تہران پہنچ کر اس نے ایک چھوٹا سا گھر حاصل کر لیا۔ابھی خاصی رقم موجود تھی اس لیے فکر کی بھی بات نہیں تھی۔ایک کمرا اور دوسری طرف کھانا بنانے کی کوٹھری۔باقی تمام ضروریات کے لیے محلے سے باہر انتظام تھا۔سلمان نے دو بڑے مٹکے خرید لیے تھے جن میں محلے سے باہر کھدے کنوئیں سے پانی بھر لایا کرتا۔ہانڈی وغیرہ برابر والے نے دے دی تھی۔پہلے دن کھانا

بھی اسی کے گھر سے آیا تھا۔ وہ منکا کو سلمان کی بیوی سمجھ رہا تھا۔ اس نے بھی حقیقت بتانے سے گریز کیا تھا اور منکا کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ خود کو منورہ کہے۔

اس محلے میں آئے ہوئے ابھی تیسرا روز تھا کہ ایک رات محلے میں شور مچ گیا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ سلمان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اسے یاد تھا کہ سونے سے پہلے اس نے چراغ جلا لیا تھا اور دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا تھا لیکن اس وقت دروازہ بھی پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔

اس نے چراغ جلا کر منکا کے بستر کی جانب نظر ڈالی۔ وہ دیوار کی طرف رخ کیے بے خبر سو رہی تھی۔ سلمان کو حیرت ہوئی۔ باہر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ اس طرح بے سدھ پڑی تھی۔ وہ باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا آغائی امجد!'' سلمان نے پوچھا۔

''پتا نہیں کہاں سے ایک تیندوا محلے میں آ گیا ہے۔ اس نے شہادت علی کو زخمی کر دیا ہے۔ اور..... اور اس کا بیٹا.....''

''اس کے بیٹے کو کیا ہوا؟'' سلمان نے پوچھا۔

''اس کو بچانے میں شہادت علی زخمی ہوا پھر بھی اس کا بیٹا بچ نہ سکا۔ زخرہ ادھڑنے کے بعد کون بچتا ہے؟''

سلمان بھی لاش دیکھنے پہنچ گیا۔ لاش پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک گیا۔ بالکل وہی حالت تھی جو رحیم کی لاش کی تھی۔ اسی طرح اس بچے کا جسم بھی سفید پڑ گیا تھا جیسے اس کے جسم سے ایک ایک قطرہ خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

وہاں سے واپس آیا تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ رات ابھی باقی تھی، وہ سونے کے لیے پھر سے لیٹ گیا۔

صبح اٹھا تو ہر ایک کی زبان پر رات کا واقعہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شہر میں ایسا خونخوار درندہ کیسے گھس آیا۔ سلمان بھی الجھ گیا تھا۔ رات تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ اب تک نوکری بھی نہیں ملی تھی۔ سارا دن شہر میں چکراتا رہتا تھا اس لیے تھکن بڑھ جاتی تھی۔ وہ فاکیہ کو یاد کر کر کے وقت گزار رہا تھا کہ اگر وہ رہتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ وہ تو مان کے ڈھیر لگا دیتی۔

اس رات بھی تھکن نے اسے تھپکیاں دے کر سلایا تھا۔ وہ رات آرام سے گزر گئی مگر...

مگر اگلی رات کو پھر ویسی ہی واردات ہو گئی۔ پہلی واردات کے بعد ہی کئی افسر آ کر علاقے کا معائنہ کر گئے تھے۔ دوسری واردات ہوئی تو شکاریوں کی ایک پوری جماعت محلے میں آ گئی۔ رات بھر شکاری محلے کی گلیوں میں چکراتے رہتے تھے لیکن وہ درندہ پھر نظر نہیں آیا۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ اب سب کا خیال تھا کہ وہ درندہ جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ پہرہ دینے والے بھی اب کوفت محسوس کرنے لگے تھے۔ محلے کے نوجوانوں کے ساتھ سلمان بھی پہرہ دینے لگا تھا۔ اس رات بھی اسے بلایا گیا تھا۔ اس ٹولی میں کل چھ لڑکے تھے۔ سب ڈنڈے لے کر اپنی گلی میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں آس پاس کی چھتوں پر چکرا رہی تھیں کہ ایک لڑکے نے کہا۔

''وہ..... ادھر دیکھو۔''

سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔ وہ ایک بڑا بلا تھا بالکل تیندوے جتنا۔ وہ بلا ایک چھت کی منڈیر پر بیٹھا ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سلمان نے جھرجھری لی۔ ایک عجیب سے خوف نے اسے گھیر لیا۔ رونگھٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ دل اپنی جگہ سے اٹھ کر کنپٹی میں آ گیا ہے اور دھڑکن تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پسینے کے قطرے بھی گرنے لگے تھے۔ لڑکوں نے زمین پر ڈنڈے مار مار کر شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ تبھی ایک زوردار دھماکہ 'گونجا' کسی شکاری نے گولی چلائی تھی۔ وہ بلا اپنی جگہ سے اچھلا اور دوسری چھت پر کود گیا۔ شکاریوں نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ سب تماشا دیکھنے کے لیے اس مکان کے نیچے جمع تھے کہ سامنے والی چھت پر چڑھ کر ایک شکاری نے گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ بلے کی کربناک چیخ 'گونجی' سب نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ دوسرے شکاری بھی مختلف چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور اسے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھے۔ تبھی بلے نے چھت سے چھلانگ لگائی۔ اسے بڑھتے دیکھ کر مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ اور وہ بلا برق رفتاری سے سلمان والی گلی میں گھس گیا۔ بعد میں سب نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔

وہ رات ہر روز سے زیادہ طویل لگی تھی۔ ہر شخص جاگتا رہا تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی خوف تھا کہ کہیں وہ بلا اس کے گھر نہ آ جائے۔

صبح کے وقت سلمان گھر لوٹا تو منکا چادر اوڑھے کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ سلمان اپنے بستر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ جوتا اتار کر لیٹنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر منکا کے پیروں کی طرف اٹھی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ چادر کا کونا خون سے سرخ ہو رہا

تھا۔ وہ فوراً ہی ادھر بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے نہایت آہستہ سے چادر کا کونا اٹھا دیا۔ منکا کا داہنا پیر زخمی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نوکدار چیز سے زخم لگا ہو۔ کافی گہرا زخم تھا۔

زخم دیکھ کر اس نے جھرجھری لی اور فوراً باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اب اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ منکا کا ملنا۔ اسے دیکھتے ہی ٹٹو کا بھڑکنا۔ رحیم کے جسم سے خون کی ایک ایک بوند کا نچڑ جانا۔ اسی حالت میں یہاں اس بچے کی موت۔ سرے سے سرا ملتے ہی یہ بات کھل کر سامنے آ رہی تھی کہ یہی وہ بدروح ہے۔ منکا ہی بلے کی شکل میں خون پیتی ہے۔

سلمان بے خیالی میں پل کی جانب بڑھتا جا رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے کے ایک مینار پر پڑی اور اسے ایک نیا حوصلہ مل گیا۔ وہ بھاگتا ہوا سیدھا اس مزار پر پہنچا۔ وہ میناروں والا مزار بزرگ کا تھا۔ اس مزار پر جا کر اس نے خود کو گرا دیا اور رہ رہ کر فریاد کرنے لگا۔ ''مجھے بچاؤ' مجھے بچاؤ۔''

پتا نہیں وہ اس کی پکار کا اثر تھا یا وہ کوئی نیک دل بندہ تھا۔ اس نے سلمان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کیا بات ہے بیٹے؟''

سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بھاری تن و توش کا آدمی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کھلتی ہوئی رنگت پر سفید داڑھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ چہرے پر ایسی پاکیزگی تھی کی نظر ٹھہرنے سے منکر تھی۔

''آپ کون ہیں؟'' سلمان نے پوچھا۔

''میں کون ہوں اس کو چھوڑو اپنی پریشانی بولو اگر زیادہ تجسس ہے تو میرا نام عبداللہ سا مجھ لو یعنی اللہ کا پیدا کردہ۔''

''آپ جو کوئی بھی ہیں میری مدد کیجئے' مجھے بچالیں۔'' داڑھی کی وجہ سے سلمان نے اسے ''بابا'' کہا تھا۔

''کچھ بولو بھی۔ آخر ایسی کون سی بات ہے جس نے تمہیں پریشان کر دیا ہے؟'' بابا عبداللہ نے پوچھا۔

''بابا! پتا نہیں وہ کون ہے میرے ہی ساتھ جنگل سے یہاں تک آ گئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر آج..... آج میں نے ایک عجیب بات دیکھ لی ہے۔ گولی کا زخم اس کے پیر پر دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''بیٹا! جاگنے والے کبھی سوتے نہیں ہیں۔ جاؤ۔ گھر جا کر آرام کرو اور تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ آگ' پانی کے پاس رہ نہیں سکتی۔'' کہہ کر وہ مڑ گئے۔ کئی قدم آگے جا کر رکے اور مڑے بغیر بولے۔ ''خطرے سے منہ موڑنا' مردانگی نہیں ہے۔ جاؤ خطرے کو پرے دھکیلو۔''

''میں سمجھا نہیں بابا!'' سلمان نے سر جھکا کر کہا۔

''شیطان کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض انتہائی پراسرار بھی ہیں۔ انہی میں سے ایک خون آشام بھی ہے۔ وہ تو تمہاری زندگی ابھی باقی تھی کہ بچ گئے ورنہ اصل نشانہ تم ہی تھے۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

''مگر بابا! گھر میں.....''

بابا نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ''اللہ والے پہرے دار ہیں۔ جب تک خلق خدا نہ پکارے' کون کس کی مدد کرے۔ پکار ہوئی کام مکمل ہوا۔'' کہہ کر وہ مزار کے پیچھے چلے گئے۔

وہ کسی پتھر کی بت کی مانند کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو سلمان بھی مڑ گیا۔ اس کے قدم پھر اپنے گھر کی جانب اٹھنے لگے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے اس طرف دھکیل رہی ہے جبکہ کچھ دیر پہلے وہ اسی گلی سے خوف کے عالم میں نکل کر بھاگا تھا۔ منکا کے زخم سے رستے ہوئے خون نے اسے دہلا دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بلے کی شکل میں منکا ہی انسانوں کا شکار کرتی ہے۔ اس کا ثبوت بندوق کی گولی کا زخم تھا۔ گولی بلے پر چلی تھی اور زخمی یہ ہوئی تھی۔ اسی زخم نے اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا تھا۔ سلمان نے اسے پہچان لیا تھا۔ اگر وہ بابا لوٹ جانے کا حکم نہ دیتے تو شاید وہ کبھی بھی گھر میں واپس نہ آتا لیکن اب اس کے اندر حوصلے کا سمندر امڈ پڑا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

منکا دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

''بس یوں ہی کچھ دیر کے لیے نکل گیا تھا۔ کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔''

''اکتاہٹ کا دائمی علاج کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تم نے مجھے سہارا دیا ہے تو پائیدار سہارا دو۔ مجھے بیوی ہونے کا تمغہ چاہئے۔ جلد سے جلد مجھ سے شادی کر لو۔''

''شادی اور تم سے!'' سلمان نے ہنس کر کہا۔ ''شاید تم بھول رہی ہو کہ آگ اور پانی کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ہمارا' تمہارا ملن ناممکن ہے۔''

''آخر کیوں؟ مجھ میں کیا کمی ہے؟ مجھے ٹھکرا کر تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔ عورت کے کتنے روپ دیکھے ہیں تم نے؟ صرف ایک یعنی ماں کا روپ! عورت اگر ماں ہے تو جنم دینے والی ہے' مردوں کو جننے والی۔ بہن ہے تو بھائی پر جان نچھاور کرنے والی۔ بیوی ہے تو شوہر کی تابعدار لیکن یہی عورت وفا کی پیکر' قربانیوں کی مثال جب انتقام کی آگ بھڑکا دے تو سلطنت بھی راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے' ناگن کا راپ دھار لیتی ہے تو دشمن کو پامال میں بھی نہیں بخشتی۔ تم میرا نہیں' عورت کی بے عزتی کر رہے ہو۔ میں تمہارے پاس محبوبہ بن کر آ رہی ہوں اور تم مجھے دھتکار کر دشمن بننے کی ترغیب دے رہے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ناگن سے بھی زیادہ خطرناک بن جاؤں۔''

''تم..... تم تو ناگن سے بھی زیادہ خطرناک ہو۔ ناگن تو صرف ڈستی ہو اور تم..... تم تو خون چوستی ہو خون! تم ویمپائر ہو۔ انسانی خون پینے والی بدروح۔'' اس کی باتوں سے سلمان کو غصہ آ گیا تھا۔

''کیا..... میں بدروح ہوں۔'' وہ چیخ کر بولی۔ ''آخر تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو؟'' وہ رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو اور چہرے کی معصومیت دیکھ کر کون کہتا کہ وہ ایک بدروح ہے لیکن سلمان تو حقیقت جانتا تھا کہ وہ انسانی خون پینے والی بدروح ہے۔ اس نے ثبوت کے طور پر کہا۔ ''اگر تم عفریت نہیں ہو تو تمہیں گولی کیسے لگی؟''

''گولی..... کیسی گولی؟'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''تمہارے داہنے پیر میں زخم کیسے لگا؟'' سلمان نے اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ زخم؟'' اس نے ساڑی کو ٹخنوں تک اٹھا کر پنڈلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دروازے کے کیل سے زخم آیا ہے۔ میں جلد بازی میں باہر نکل رہی تھی کہ وہ کیل چبھ گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے زخم کچھ گہرا آیا ہے۔''

اب سلمان نے زخم کو غور سے دیکھا تو اس کی بات سچ لگی۔ گولی کا زخم اتنا ہلکا تو ہوتا نہیں ہے۔ چھرے اندر تک دھنس جاتے ہیں۔ وہ زخم کو ٹھیک بھی کر سکتی ہوگی۔ اس سے زیادہ منہ لگنا مناسب نہیں' یہ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ بابا جی کے حکم کو بھول کر گھر سے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ گلی سے باہر نہیں نکلا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر زوردار گھونسا مارا ہو۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ تبھی کئی چیخیں ایک ساتھ گونجیں۔ ''ہوہو'' لوگ شور مچانے لگے تھے۔ سلمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کی روح فنا ہو گئی۔ اس کے پیچھے وہی خونی بلا کھڑا

تھا۔ اس کی سرخ انگارہ سی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ سلمان کے ہاتھ پیر سن ہو چکے تھے۔ جی چاہا زور سے چیخ مارے لیکن حلق میں کانٹے سے اگ آئے اور آواز پھنس کر رہ گئی۔ ہر عضو پر لرزہ سا طاری تھا۔ وہ سر تا پا لرز رہا تھا۔ دانت بھی بجنے لگے تھے۔ اسے خود پر زعم تھا کہ میں بہت بہادر ہوں' بھیانک جنگل کو پار کر کے آیا ہوں مگر اس وقت اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اب تب میں وہ مجھ پر چلانگ لگائے گا اور میرے زخرے کو ادھیڑ دے گا مگر اسی وقت ایک معجزہ سا ہوا۔ وہی درویش صورت شخص جس نے سلمان کو مزار پر ڈھارس دی تھی' گلی میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لوہے کا چمٹا تھا۔ وہ اسے بجاتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ بلے کی طرف تھا۔ بلا بھی اپنی جگہ ساکت کھڑا بابا جی کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ بابا جی سلمان کے برابر سے گزرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ بس ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا' انھوں نے اپنا چمٹا بلے پر مارنے کے لیے اٹھا لیا تھا کہ کسی نے گولی چلا دی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور بلا اچھلا۔ سلمان سمجھا کہ شاید بلے کو گولی لگی ہے مگر نہیں! اگلے ہی پل وہ بلا نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔

''بے وقوف!'' بابا جی نے زور سے کہا۔ ''میں کب سے اس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا خاتمہ ہو جاتا کہ تم نے میرے کام کو بڑھا دیا۔''

بابا جی نے بندوق بردار کو جھڑکنے کے بعد سلمان کے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ پڑھ رہے تھے۔ سلمان نے اپنی پوری قوت سماعت ان کی جانب لگا دی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ شاید کسی آیت کا ورد کر رہے تھے۔

گلی میں اب تک لوگ جمع تھے۔ شور سن کر منکا بھی باہر نکل آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سلمان یہ سوچ کر خوش ہوا تھا کہ اس کے ساتھ بابا تھے۔ وہی اسے سبق سکھا سکتے تھے۔ اس نے انگلی سے منکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابا سے سرگوشی میں کہا۔ ''بابا! یہی ہے وہ جس نے پورے محلے کو آزار میں مبتلا کر رکھا ہے۔''

بابا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خفگی کی جھلک تھی۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔

''تہمت لگانا خدا کو سخت ناپسند ہے۔'' بابا دھیرے سے بولے۔

''بابا میں ایسے حالات سے گزر چکا ہوں کہ ہر ایک پر شک ہوتا ہے۔''

''انسان حالات اپنی قسمت کے ساتھ لکھ کر لاتا ہے جسے اپنے عمل سے قوی کرتا ہے۔ تم پر جو بھی گزری ہوگی یہ تمہارے عمل کا ثمر تھا۔ اچھے عمل کی وجہ سے زندگی خوشگوار اور برے عمل کی وجہ سے دشوار بن گئی ہوگی۔''

''مگر بابا زندگی کا کچھ لمحہ تو واقعی کسی کی وجہ سے بہت زیادہ خوشگوار ہو گیا تھا۔'' سلمان نے جیسے ہی یہ جملہ ادا کیا بابا کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولے:

''اچھا تم فاکیہ کے بارے میں بتا رہے ہو۔''

سلمان اچھل پڑا۔ بابا واقعی سب کچھ جانتے تھے۔ اس نے کہا ''جی۔ جی ہاں۔''

''وہ تو خود بھٹک رہی ہے۔ وہ تمہاری کیا مدد کرتی۔ اس نے تو تمہیں بھی بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔ یہ تو تمہارے اچھے عمل تھے جنہوں نے تمہیں بچا لیا۔''

''نہیں بابا' وہ میری محسنہ ہے۔ اس نے ہر برے وقت میں میری مدد کی ہے۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''یہ ہی تمہاری بھول ہے۔ وہ ایک سراب ہے جس کے پیچھے بھاگتے ہوئے تم اپنی منزل کھو رہے تھے۔ جانتے ہو میں نے اپنی زندگی کے کتنے سال ضائع کیے ہیں؟''

''کتنے؟''

''بیس سال' بیس سال پہلے میں بھی تمہاری طرح ایک سراب کے پیچھے بھاگا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ میں کسی اور مقصد کے تحت گھر سے نکلا تھا۔ مجھے جنات پر قابو پانے کی دھن تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں جنات کو قبضہ میں کر کے اس دنیا پر راج کروں گا۔ اسی خیال کے حصول کے لیے میں گھر چھوڑ کر در در بھٹک رہا تھا۔ تین تین عمل کر چکا تھا مگر کامیابی نہیں ملی ایک بار تو جان جاتے جاتے بچی تھی۔'' انہوں نے سلمان کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''جنات نے پٹک دیا ہوگا؟'' سلمان نے انہیں بیٹھنے کے لیے جازم دیتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں' بات کچھ اور تھی۔ وہ کیا' یہ بتانے کے لیے مجھے ماضی میں جانا پڑے گا۔'' کہہ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بولے کہ ایک روز فقرا کی ایک جماعت نے روک لیا۔ وہ تعداد میں چار تھے انہوں نے پوچھا' کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا' میں عامل کامل بننے

نکلا ہوں۔'' کہہ کر بابا رکے انہوں نے گہری سانس لی پھر بولے۔ ''میں نے کہا' میں بہت اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ولی کامل بننا چاہتا ہوں' میرے جواب پر سب ہنس دیے ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ولی خرقہ پوش ہوتا ہے اور خرقہ پوش چار ترک کے حامل ہوتے ہیں۔ اول ترک دنیا، دوئم ترک خواہش نفس، سوئم ترک خور و خواب مگر اتنی کہ بقائے زندگی کے لیے کافی ہو۔ چہارم ترک ماسوائے حق۔ کیا تو اتنا کچھ کر لے گا؟ جا گھر جا کر بیٹھ۔ یوں بھی جنگ اور تبلیغ دین کے لیے سفر تجھ جیسے بے وقوف پر ساقط ہے۔''

''ہاں میں یہ بھی جانتا ہوں۔''

''پہلے دین کی تعلیم حاصل کر پھر کچھ کہنا۔''

''کہاں سے حاصل کروں' یہاں تو کھانے کے لالے پڑ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو نے عثمان ہارونی کا نام سنا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلا کر دیگر لوگوں پر نظر ڈالی جو وہیں اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر چولھا جلا رہے تھے۔ مٹی اور پتھر اکٹھے بنے اس عارضی چولھے پر شاید کھانا بنانا چاہ رہے ہوں۔ میں نے پوچھا ''کیا میں آپ لوگوں کی مدد کروں؟''

ان میں سے ایک بولا ''تیرے لیے عبدالسلام کی باتیں زیادہ ضروری ہیں یہ موقع بار بار نہیں ملے گا۔ قسمت نے تجھے نورِ اسلام کے روبرو لا کھڑا کیا ہے تو فائدہ اٹھا۔''

میں نے عبدالسلام سے کہا ''آیئے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

عبدالسلام وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر بولا ''عثمان ہارونی کا شمار اللہ کے برگزیدہ تر بندوں میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ خواجہ عثمان ہارونی کا گزر آتش پرستوں کے ایک بڑے معبد سے ہوا اس معبد کے اندر آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن تھا۔ یہ آتش کدہ ایسی جگہ بنا ہوا تھا کہ انسان کے قدم خود بہ خود تھم کر رہ جاتے تھے۔ بہت ہی پر فضا مقام تھا، حضرتؒ کے ساتھ کئی اور لوگ بھی تھے۔ آپ نے وہیں پر ایک کھلے مقام پر قیام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شام کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا۔ آپ نے مصلیٰ اٹھاتے ہوئے فخر الدین نامی شخص کو حکم دیا۔ ''جاؤ بستی سے آٹا اور آگ لے آؤ تا کہ کھانا پکایا جا سکے۔'' اس نے بستی سے غلہ خریدا، واپسی کے وقت آگ لینے کے لیے آتش کدہ پر پہنچا۔ انہیں معبد کے اندر آتا دیکھ کر آتش پرست خفا ہو گئے۔ فخر الدین نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور آگ کی فرمائش کی۔ آگ مانگنا تھا کہ آتش پرست بھڑک اٹھے، انہوں نے فخر الدین کو

سخت وسست کہتے ہوئے معبد سے نکال دیا۔ وہ حضرت عثمان ہارونیؒ کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ غصہ انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ انہیں دعائیں دیتے ہوئے لوٹ آئے۔ فخر الدین کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر حضرت عثمان ہارونی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے آگ نہیں ملی۔''

فخر الدین نے جواب دیا ''ان کا کہنا ہے کہ اس آگ کی ہم پرستش کرتے۔ اسے چولھا جلانے کے لیے کیوں دیں؟''

حضرت عثمان ہارونیؒ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے شاید وہ وقت آچکا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔''

دو دونوں دوبارہ معبد میں پہنچے۔ اس بار حضرت عثمان ہارونیؒ نے دست سوال دراز کیا۔ آتش پرستوں نے وہی رٹا رٹایا جواب دیا۔ حضرت عثمان ہارونیؒ نے انہیں ہدایت دینا اپنا فرض سمجھا اور فرمایا ''دوستو معبود حقیقی تو وہ ذات الٰہی ہے جس نے ہم سب کو اور اس آگ کو پیدا کیا ہے۔ تم پر افسوس ہے کہ اس ذات حقیقی کو چھوڑ کر خالق کو بھول کر اس کی مخلوق کی عبادت کرتے ہو۔ اگر تم اپنے اس فعل قبیح سے باز آؤ تو دوزخ کی آگ سے بچ جاؤ گے۔''

آتش پرست ان کی باتوں پر ہنسنے لگے۔ ان کے پروہت (پجاری) نے جواب دیا۔ ''تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ آگ تو ہماری نجات کا باعث ہے۔ اس کی عبادت ترک کر کے بھلا ہم کیسے نجات پا سکتے ہیں؟''

حضرت عثمان ہارونی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا ''اگر آگ فی الواقع تمہاری نجات دہندہ ہے تو اس میں اپنا ہاتھ ڈال کر دکھاؤ اگر وہ جلنے سے محفوظ رہا تو میں سمجھوں گا کہ واقعی آگ نجات دہندہ ہے۔''

پجاری حضرت کا ارشاد سن کر خاموش ہو گیا اور اپنی گود میں بیٹھے ننھے سے بچے سے کھیلنے لگا۔

حضرت عثمان ہارونیؒ نے پھر ٹوکا ''کیوں بھائی، تم نے جواب نہیں دیا؟''

پجاری نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ''آگ کا کام جلانا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عضو اس میں ڈالا جائے اور وہ جلنے سے محفوظ رہے۔ ایسی فرمائش تو دیوانوں کا شیوا ہے۔''

حضرت عثمان ہارونی نے فی الفور اس بچے کو پجاری کی گود سے چھینا اور قل یانار کونی بردا و سلاما! پڑھتے ہوئے آگ میں کود گئے۔ یہ ایک بہت بڑا آتش کدہ تھا۔ ہزاروں

من لکڑیاں اس میں جلتی تھیں۔ حضرت عثمان ہارونیؒ اور وہ بچہ آگ کے شعلوں میں بالکل مستور ہو گئے۔ مجوسیوں نے سمجھا کہ آپ جل کر راکھ ہو گئے ہوں گے۔ پجاری خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ وہ کیوں نیچے اترا، کیوں بچے کو لے کر بیٹھا تھا۔ تبھی آگ میں سے حضرت کی آواز گونجی ''یہ دیکھ اس مخلوق کے خالق کا معجزہ۔ جس نے آگ کو خلق کیا ہے اس نے مجھ پر اور تیرے اس بچے پر رحم بھی کر دیا اور یہ آگ ہم پر برف ایسی ٹھنڈی ہو گئی۔'' پھر وہ بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے آگ سے باہر نکل آئے اور بولے۔ ''یہ میرے رب کا کرم تھا جس نے جھوٹ اور سچ کی پہچان کرائی۔''

مجوسی یہ حیرت انگیز کرامت دیکھ کر ششدر رہ گئے اور ان کے دلوں سے کفر و شرک کی سیاہی دھل گئی۔ انہوں نے حضرت عثمان ہارونیؒ سے پوچھا ''یہ کیا چیز ہے جس کی برکت سے آپ آگ کی گرمی سے محفوظ رہے۔''

حضرت نے فرمایا۔ ''یہ اللہ پر یقین محکم، اسلام کی برکت اور قرآن کا اعجاز تھا جس نے آگ کی گرمی سے مجھے محفوظ رکھا۔ میں نے صدق دل سے آگ کے خالق کی پناہ طلب کی تھی اس نے اپنی مخلوق کو میرا دوست بنا دیا۔''

مجوسیوں نے آپ کو گھیر لیا۔ جوق در جوق اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ سب کے سب توحید اور اسلام کے متعلق استفسار کر رہے تھے۔ آپ بڑے ذوق اور شوق سے انہیں تعلیم دیتے رہے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے پہلے پہلے تک آس پاس کی کئی بستیاں اسلام کے نور سے جگمگا اٹھیں۔

اس واقعہ کے ایک ڈیڑھ سال بعد کا ذکر ہے۔ حضرت عثمان ہارونیؒ ایک دوسرے سفر پر جا رہے تھے ان کے ساتھ معین الدینؒ چشتی بھی تھے۔ چلتے چلتے وہ سب دریائے جیحان پر پہنچے تو دیکھا ندی طغیانی شباب پر تھی۔ ایسے وقت میں کسی ملاح کی جرات تھی کہ وہ دریا میں کشتی اتارتا ساحل پر بھی کشتیاں نہ تھیں۔ اب دریا کیسے پار کیا جائے؟ معین الدینؒ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ حضرت عثمان ہارونیؒ نے فرمایا ''حسن اپنی آنکھیں بند کر لو۔''

معین الدینؒ نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک لمحے کے بعد عثمان ہارونی نے کہا ''اب آنکھیں کھول دو۔''

معین الدین نے آنکھیں کھولیں تو خود کو حضرت کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے پر پایا۔

اس واقعے نے معین الدین پر بہت زیادہ اثر کیا۔ وہ بغداد تک اسی واقعہ پر غور کرتے رہے۔ بغداد پہنچ کر حضرت ہارونی ایک مسجد میں ٹھہرے۔ اس شہر میں ان کے بہت سارے مرید تھے۔ انہی میں سے ایک فوت ہوگیا۔ اسے دفن کر کے سب لوگ واپس چلے گئے۔ صرف معین الدین ٹھہر گئے۔ وہ قبر کے نزدیک بیٹھے ذکر الٰہی کر رہے تھے کہ عذاب کے فرشتے پہنچ گئے۔ اسی وقت خواجہ عثمان ہارونی بھی قبرستان آ پہنچے اور بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ ''الٰہی میرے اس مرید کو بخش دے۔ اس سے بے شک گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ لیکن اس نے میرا دامن تھام رکھا تھا۔''

حضرت معین الدین فرماتے ہیں۔ ابھی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مستجاب ہوگئی۔ فرشتے بہ حکم الٰہی واپس چلے گئے۔

اس واقعے کے ایک ماہ کے بعد ایک دن خواجہ عثمان ہارونی نے ان سے کہا ''حسن اب اس قابل ہو چکے ہو کہ تمہیں بیعت کرنے کی اجازت دے دی جائے۔''

اس بیعت کا حال خود حضرت معین الدین کی زبانی سنو جسے اس عاجز بندے نے خواجہ معینؒ حسن چشتی کی مرتب کردہ کتاب ''انیس الارواح'' میں پڑھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''یہ فقیر بغداد میں خواجہ جنید بغدادی کی مسجد میں حضرت شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کی مجلس میں بہت سے درویش حاضر تھے۔ فقیر نے جونہی بیعت کا ارادہ کیا، حضرت نے فرمایا ''وضو کرو اور دو رکعت نماز ادا کرو۔'' فقیر نے حکم کی تعمیل کی پھر فرمایا ''قبلہ رو ہو کر سورۃ بقرہ پڑھو۔'' اس سے فارغ ہوا تو ارشاد ہوا اکیس بار درود شریف پڑھو۔ فقیر نے تعمیل ارشاد کی تو حضرت نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور فقیر کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا ''ترا بخدا رسانیدم و مقبول حضرت اوگردانیدم'' اس کے بعد حضرت نے اس عاجز کے سر کے بال قینچی سے تراشے اور کلاہ چہار ترکی فقیر کے سر پر رکھی۔ پھر اپنا گلیم خاص مرحمت فرمائی ''اب جا اور آج کا دن اور آج کی رات مجاہدہ کر۔'' فقیر نے ایک دن اور ایک رات یاد الٰہی میں بسر کی۔ پھر حاضر ہوا تو فرمایا۔ ''بیٹھ جا!'' عاجز بیٹھ گیا تو فرمایا ''اوپر دیکھ اور بتا تو کہاں تک دیکھ سکتا ہے۔'' فقیر نے دیکھ کر عرض کیا کہ عرش معلیٰ تک نگاہ جاتی ہے۔ پھر فرمایا ''نیچے دیکھ کہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔'' فقیر نے عرض کیا۔

''تحت الثریٰ تک سب کچھ عاجز کے سامنے ہے۔'' پھر فرمایا ہزار مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ! فقیر جب اس سے فارغ ہوا تو حکم ہوا ''اب اوپر دیکھ اور بتا کہاں تک دیکھ سکتا ہے۔'' فقیر

نے اوپر دیکھا اور عرض کیا ''حجاب عظمت تک سب کچھ عاجز کے سامنے روشن ہے۔'' پھر فرمایا اپنی آنکھیں بند کر لے۔'' فقیر نے آنکھیں بند کر لیں پھر ارشاد ہوا ''اب کھول دے!'' فقیر نے ایسا ہی کیا۔ اب حضرت نے اپنی دو انگلیاں کھول کر فرمایا ''ان میں سے تجھے کہاں تک دکھائی دیتا ہے۔ فقیر عرض پیرا ہوا کہ اٹھارہ ہزار عالم دکھائی دے رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا ''بس اب تیرا کام پورا ہوگیا (یعنی تو مرتبہ کمال تک پہنچ گیا) پھر آپ نے قریب پڑی ہوئی ایک اینٹ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا ''اسے اٹھا۔'' فقیر نے یہ اینٹ اٹھائی تو اس کے نیچے کچھ دینار پڑے پائے۔ حکم ہوا ''یہ دینار اٹھا لے اور انہیں فقیروں میں صدقہ کر دے!'' فقیر نے حکم کی تعمیل کی۔

بیعت ہوتے ہی معین کا مرتبہ بلند ہوگیا اب وہ حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری کے نام سے پہچانے جاتے۔ آپ نے بیعت کے بعد بھی حضرت عثمانؒ ہارونی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور ان کی خدمت کو ہی اپنا نصب العین بنا لیا۔ ان دنوں ریاضت اور مجاہدے کا یہ عالم تھا کہ مسلسل ایک ایک ہفتہ روزے رکھتے اور آٹھویں دن پانچ مثقال کی ایک ٹکیہ پانی میں بھگو کر افطار کرتے۔ بدن پر صرف ایک کپڑا ہوتا جب پھٹ جاتا تو اسے پیوند لگا لیتے۔ مرشد کہیں سفر پر جاتے تو ان کا بستر اور دوسرا سامان سر پر اٹھا کر ساتھ چلتے۔ مرشد کی خدمت میں آپ کے عرصۂ قیام کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے بیس سال تک مرشد کی خدمت کی اور سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔ اپنی بے مثال خدمت اور ارادت کی وجہ سے خواجہ عثمان ہارونی کے خاص الخاص محبوب بن گئے تھے چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا ''معین الدین خدا کے محبوب ہیں۔ اور مجھے ان کی مریدی پر فخر ہے۔''

جب خواجہ غریب نواز کے مجاہدات و ریاضات کی تکمیل ہو چکی تھی تو آپ کے مرشد خواجہ حضرت عثمان ہارونی نے حج کا عزم کیا اور خواجہ غریب نواز کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ بیت اللہ شریف پہنچ کر طواف کیا اور طواف سے فارغ ہو کر خواجہ عثمانؒ ہارونی نے خواجہ غریب نواز کا ہاتھ پکڑ کر بارگاہ الٰہی میں دعا فرمائی کہ مولائے کریم میرے معین الدینؒ حسن کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔ اسی وقت غیب سے آواز آئی ''معین الدین دوست ماست قبول ردم و برگزیدم۔'' (معین الدین ہمارا دوست ہے ہم نے اسے قبول کیا اور عزت بخشی)

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر خواجہ عثمانؒ ہارونی اور غریب نوازؒ مدینہ منورہ پہنچے اور سرکارِ دو عالم کے روضے پر حاضری دی۔ مرشد کامل نے مرید صادق کو حکم دیا۔ ''معین الدین آقا دو

جہاں کی بارگاہ میں سلام عرض کر!''

خواجہ غریب نواز نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ کہا ''الصواۃ والسلام علیکن یا سید المرسلین و خاتم النبین.''

روضہ اقدس سے آواز آئی۔ ''وعلیکم السلام یا قطب المشائخ.''

خواجہ عثمان ہارونی نے فوراً درود وسلام کی تلقین کی۔ آپؒ عشاء تک درود شریف پڑھتے رہے۔ نماز عشاء کے بعد آنکھ لگ گئی۔ تو خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا ''معین الدین میں نے تمہیں بحکم الٰہی سلطان الہند مقرر کیا۔ اب تم اپنے مرشد سے ہند جانے کی اجازت حاصل کرو۔''

صبح ہوتے ہی خواجہ غریب نواز نے مرشد گرامی کی خدمت میں خواب کا واقعہ بیان کیا۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ اپنے محبوب مرید کی دربار رسالت میں مقبولیت کا حال سن کر بہت مسرور ہوئے اور خواجہ غریب نواز سے فرمایا ''تم نے ہند نہیں دیکھا ہے۔ اپنی آنکھیں بند کرو تاکہ میں تمہیں اس اجنبی سرزمین کی سیر کرادوں۔''

خواجہ غریب نواز نے آنکھیں بند کیں اور مرشد کامل نے چند لمحوں میں سارے ہندوستان کی سیر کرادی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؒ کو خواجہ عثمان ہارونیؒ نے ایک مشت خاک دی تھی اور کہا تھا کہ یہ خاک جہاں کی مٹی سے مل جائے سمجھ لینا ہند میں وہی تمہاری منزل ہے۔

جب بارگاہ الٰہی اور دربار رسالت سے خواجہ غریب نواز کو مقبولیت کا پروانہ مل گیا تو حضرت عثمان ہارونی نے انہیں اپنا خرقہ، مصلیٰ، نعلین اور عصا مرحمت فرما کر ارشاد کیا۔

''یہ چیزیں ہمارے پیران طریقت کی یادگار ہیں، اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت کرنا اور اپنے بعد جس کو ان کا اہل سمجھنا اسے بخش دینا۔'' پھر انہوں نے خواجہ کے سر پر کلاہ چہار ترک رکھی اور پھر ایک بار اپنے مرشد حضرت حاجی شریف زندانی کی نصیحت دہرائی کہ یہ چہار ترک کا نشان ہے، انہیں ہمیشہ ترک کیے رہنا۔'' جب وہ صاحب خاموش ہوئے تو سلمان الفاظ کے سحر سے نکل آیا۔ اسے عبدالسلام کا بولنا اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی باتیں سننے کے لیے منکا بھی وہیں آبیٹھی تھی۔ اس نے کہا:

''آپ کی کہانی تو بڑی دلچسپ ہے آگے کیا ہوا بتادیں نا۔''

''یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ ہر لفظ سچ ہے۔'' وہ بولے۔

''اچھا تو یہ سچی کہانی ہے؟ پھر تو آگے بھی سنائیں۔''

''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ خرقہ لینے کے بعد حضرت معین الدین چشتی نے بغداد جانے کا عزم کیا اور وہیں آپ نے شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی، شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ اوحدالدین کرمانی ایسے جلیل القدر اولیاء سے ملاقات کی۔ حضرت کبریٰ چھٹی صدی ہجری کے اولیاء میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ان کا اسم گرامی احمد بن عمر الصوفی اور کنیت ابوالجناب تھی اور ولی تراش کے نام سے مشہور تھے۔ مباحثہ و مناظرہ میں مخاطب کو مبہوت کردیتے تھے۔ بہت بڑے محدث اور امام تھے۔ مشہور محدث شیخ سیف الدین باخرزی آپ کے ہی شاگرد اور خلیفہ تھے۔ امام فخر الدین رازی بھی آپ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

خواجہ غریب نوازؒ حضرت ولی تراشؒ سے رخصت ہوکر ہمدان پہنچے۔ ان دنوں ہمدان میں شیخ ابو یوسف ہمدانی کا نام گونج رہا تھا۔ شیخ ہمدانی سے بھی انہوں نے علم حاصل کیا پھر تبریز پہنچے۔ تبریز میں حضرت شیخ ابی سعید کا قیام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ ابو یوسف ہمدانی سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور ان سے تصوف کے کئی مسائل کو سمجھے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدینؒ تبریزی جیسے سرآمد روزگار ولی اللہ نے آپ ہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔

حضرت شیخ ابو یوسفؒ ہمدانی سے فیض حاصل کرنے کے بعد خواجہ غریب نوازؒ کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ اور آپ اصفہان پہنچے۔ یہاں شیخ محمود اصفہانیؒ کے باطنی کمالات سے مستفیض ہوئے۔ اسی شہر میں آپ کی ملاقات خواجہ قطب الدینؒ بختیار کاکی سے ہوئی اور اسی جگہ وہ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ انہی دنوں آپ کا گزر علاقہ غور سے ہوا شیخ شہاب الدین سہروردی، اور شیخ اوحدالدین کرمانی آپ کے ہمراہ تھے۔ تبھی ان کی نظر ایک نوجوان پر پڑی۔ وہ تیر کمان سے لیس تھا۔ اس نے رک کر نہایت ادب سے سلام کیا۔ آپ نے نام پوچھا تو اس نے بتایا ''شہاب الدین۔'' اس کے آگے بڑھ جانے پر آپ نے فرمایا ''یہ نوجوان ایک دن دہلی کا بادشاہ بنے گا۔'' تاریخ شاہد ہے کہ حضرت کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔

اصفہان کے بعد خواجہ غریب نواز نے استرآباد میں پڑاؤ ڈالا اور وہاں کے مشہور عالم شیخ ناصر الدینؒ استرآبادی سے کسب فیوض حاصل کیا۔ لیکن وہاں زیادہ عرصہ رکے نہیں اور ہرات

جا پہنچے۔ ہرات میں آپ نے شیخ الاسلام امام عبدالانصاری کے مزار پر قیام کیا۔ کسی طرح وہاں کے لوگوں کو آپ کے کمالات باطنی کا علم ہوگیا۔ اور وہ کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اس سے آپ کے اذکار واشغال میں خلل پڑا چنانچہ ہرات سے عازم سبزوار ہوگئے۔

سبزوار میں آپ نے ایک باغ میں قیام کیا یہ باغ نہایت سرسبز وشاداب تھا۔ حاکم سبزوار محمد یادگار نے یہاں اپنی خلوت گاہ بنا رکھی تھی۔۔ وہاں وہ شراب نوشی کرتا اور رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ باغ کے بیچوں بیچ شفاف پانی کی ایک نہر جاری تھی۔ اور وسط میں ایک خوش نما حوض تھا۔ خواجہ غریب نوازؒ نے نہر میں غسل فرمایا، نماز ادا کی اور پھر حوض کے کنارے عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے۔

حاکم سبزوار نہایت ظالم و جابر حکمران تھا۔ اس کے غلاموں نے جب حضرتؒ کو باغ میں عبادت کرتے دیکھا تو منع کیا، حاکم کا خوف دلایا۔ مجبوراً آپ کو کہنا پڑا۔ ''درویش جہاں بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا اللہ تعالیٰ میرا محافظ ہے۔''

اتنے میں حاکم سبزواری کی آمد کا اعلان ہوا۔ اس کے ملازموں نے حوض کے کنارے بیش بہا قالین بچھایا اور انہیں بھگانے کی فکر میں لگ گئے۔ سب اپنی کوشش میں مصروف تھے کہ حاکم سبزوار پہنچ گیا۔ اس نے لب حوض ایک گودڑی پوش کو بیٹھے دیکھا تو آگ بگولا ہوگیا۔ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ خواجہ غریب نواز نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اسی وقت زمین پر گر کر مرغ بسمل کی مانند تڑپنے لگا۔ اور پھر بے ہوش ہوگیا۔ سارے لوگ حضرت کی منت سماجت کرنے لگے۔ تب حضرت اپنی جگہ سے اٹھے اور چلو میں پانی بھر کے حاکم کے چہرے پر چھینٹے مارے، وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور رو رو کر اپنے گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ پھر حضرت سے التجا کی کہ مجھے اپنی غلامی میں لے لیجئے۔

حضرت نے ایک برتن میں اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور پھر اپنی بیعت سے مشرف فرمایا۔

محمد یادگار کی دنیا یکسر تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی ساری دولت خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کردی۔ آپ نے دولت کو ٹھکرا کر کہا ''یہ دولت تو نے ظلم و جور سے جمع کی ہے۔ اسے اصل مالکوں کو لوٹا دے۔''

محمد یادگار نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے سارے لونڈی غلام بھی آزاد کردیے۔ اور خود خواجہ صاحب کی غلامی کرنے لگا۔

حضرتؒ نے تھوڑے ہی عرصے میں اسے فیوض باطنی سے مالا مال کردیا۔ اور پھر اسے خرقہ خلافت عطا فرما کر حصار کے لیے چل پڑے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بلخ تشریف لے گئے۔ اور شیخ احمدؒ حضرویہ کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ بلخ میں حکیم مولانا ضیاء الدینؒ ایک جید عالم تھے جو فلسفے میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ وہ علم باطنی کے منکر تھے۔ اور تصوف کو ڈھونگ سمجھتے تھے اپنے شاگردوں کو بھی وہ تصوف کے خلاف تعلیم دیتے تھے۔

ایک دن خواجہ غریب نواز بلخ کے قریب جنگل میں تشریف لے گئے اور ایک کلنگ کا شکار کر کے کباب بنانے لگے۔ اتفاق سے مولانا ضیاء الدین کا ادھر سے گزر ہوا۔ حضرت نے از راہ تواضع کباب کا ایک ٹکڑا کھاتے ہی مولانا ضیاالدین کی حالت متغیر ہوگئی، اور ذہن سے تمام فلسفیانہ خیالات یکسر غائب ہوگئے۔ حضرت کے قدموں پر گر کر بیعت کے طالب ہوئے۔ بیعت حاصل کرنے کے بعد گھر آئے اور طب وفلسفہ کی تمام کتابوں کا دریا برد کیا۔ ایک روایت کے مطابق خواجہ غریب نوازؒ نے انہیں بھی خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔

آپ نے بلخ میں زیادہ عرصہ قیام نہیں کیا اور غزنی کے لیے چل پڑے۔ غزنی میں آپ نے شیخ عبدالواحدؒ غزنوی سے کسب فیض حاصل کیا۔ اور عازم ہند ہوئے۔ ہند میں آمد کے متعلق متضاد بیانات ملتے ہیں۔ تاریخ فرشتہ اور معین الارواح کے مطابق خواجہ غریب نواز چار بار ہندوستان تشریف لائے۔ پہلی دفعہ محرم ۵۶۱ھ اور آخری بار ۵۸۷ھ میں، جبکہ سید العارفین کے مصنف کے بقول خواجہ غریب نواز ۶۰۲ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ مگر طبقیات ناصری، منتخب التواریخ، انڈیا آف اورنگ زیب میں لکھا گیا ہے کہ حضرت معین الدین حسنؒ سلطان شہاب الدین غوری کے لشکر کے ہمراہ ۵۸۷ھ میں ہندوستان آئے اور اجمیر میں پرتھوی راج کے زوال کے بعد پہنچے۔ لیکن سیر الاولیاء۔ مفتاح التواریخ۔ اسرار الاولیاء، اکبر نامہ، تزک جہانگیری، فوائد السالکین، سیر القطاب، اخبار الاخبار، بایوگرافیکل ڈکشنری از ہنری جارج لین، تذکرۃ الکرام، ارمغان ہند بتاتے ہیں کہ حضرت معین الدین چشتی پرتھوی راج کے زوال سے پہلے ہند تشریف لائے۔ جبکہ تذکرۃ حضرت خواجہ اجمیری میں طالب ہاشمی لکھتے ہیں کہ ہماری تحقیق کے مطابق سرزمین ہند کو پہلی بار خواجہ غریب نواز کے اقدام میمنت لزوم چومنے کا شرف ۵۸۷ھ میں حاصل ہوا۔ اور اس کے بعد حضرت، ہند سے باہر کبھی تشریف نہیں لے گئے۔ پرتھوی راج کا ستارہ اقبال آپ ہی کے سامنے غروب ہوا۔'' طالب ہاشمی کے بیان سے یہ ناچیز بھی متفق ہے کیونکہ زیادہ تر

کتابوں میں آپ کی ہند آمد کا سن ۵۸۷ھ درج ہے۔ خواجہ نے ہند کے جس پہلے شہر میں قیام کیا تھا تھا وہ شہر لاہور تھا۔ آپ یہاں ڈیڑھ دو ماہ تک ٹھہرے تھے پھر ملتان تشریف لے گئے اور وہاں قیام فرما کر ہندوؤں کی زبانیں سیکھیں پھر وہاں سے دہلی تشریف لے گئے۔

اس وقت دہلی کا چپہ چپہ کفر و شرک میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے مسلمان درویشوں کو دیکھتے ہی انہیں ختم کر دینے کی ٹھانی اور ایک نوجوان کو تیار کیا کہ وہ آپ کو قتل کر دے۔ وہ چاقو لے کر نکل پڑا آپ کی مجلس میں پہنچا وہ وار کرنے کی تاک میں بیٹھا تھا کہ آپ نے فرمایا ''بھائی اپنا کام کر جھجکتا کیوں ہے؟''

آپ کے الفاظ خنجر بن کر اس نوجوان کے سینے میں پیوست ہو گئے اور آپ کے قدموں میں گر پڑا اور معافی مانگنے لگا۔ پھر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ خواجہ غریب نوازؒ کی تبلیغ نے دہلی کے ہزاروں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ دہلی کے بعد آپ سونی پت، نارنول اور سمانہ بھی ٹھہرے۔

سمانہ کے ہندوؤں نے بھی آپ اور آپ کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی سازش تیار کی۔ آپ کے ساتھیوں کو زہر ملا کھانا بھیجا لیکن حضرت کو کشف کے ذریعے اس سازش کا علم ہو گیا اور آپ نے کھانا واپس کر دیا اور اجمیر کی جانب چل پڑے۔

ان دنوں اجمیر پر چوہان خاندان کے پرتھوی راج پتھورا کی حکومت تھی۔ کچھ ہی دنوں پہلے یعنی ۵۸۷ھ میں تھانیسر سے چودہ میل دور تائن (تراوڑی) میں پرتھوی راج نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کو شکست دی تھی، اس لیے ان کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ایسے کینہ پرور شخص کے پایہ تخت میں ٹھہرنا معمولی بات نہ تھی۔ پھر بھی آپ اس علاقے میں جا پہنچے۔

اجمیر پہنچ کر خواجہ اور ان کے چالیس ساتھیوں نے شہر سے باہر ایک میدان میں قیام کیا۔ اس میدان میں راجہ پرتھوی راج کے اونٹ چرا کرتے تھے۔ راجہ کے ملازمین کو اس میدان میں مسلمان درویشوں کا ٹھہرنا ناگوار گزرا اور انہوں نے حضرت کو بھگانے کی کوشش شروع کر دی۔

خواجہ غریب نوازؒ نے کہا ''بھائی یہ میدان کافی وسیع ہے راجا کے اونٹوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔'' لیکن وہ بدزبان ملازمین کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ مجبوراً خواجہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اٹھ گئے جاتے جاتے آپ نے فرمایا ''ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی خواہش ہے کہ یہاں اونٹ

بیٹھیں تو یہی ہوگا۔'' پھر آپ انا ساگر کی جانب چل دیے۔

ادھر میدان میں اونٹ جو بیٹھے تو بیٹھے ہی رہ گئے۔ ساربانوں نے تمام حربے آزما لیے لیکن وہ اٹھ نہ سکے اب ان شتر بانوں کو احساس ہوا کہ یہ انہی بزرگ کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ وہ بھاگتے ہوئے حضرت کی خدمت میں آئے اور اپنے کیے کی معافی طلب کرنے لگے۔ خواجہ صاحب وہاں رحمت کا پرتو بن کر پہنچے تھے انہوں نے دعا کرنے میں دیر نہ اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ادھر ان کے ہاتھ اٹھے ادھر اونٹوں نے اٹھنا شروع کر دیا۔

انا ساگر جہاں ہر طرف بتوں سے سجے ہوئے مندر تھے انہی مندروں کے درمیان بیٹھ کر خواجہ معین الدین نے تبلیغ دین شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارے ہندو کفر کا راستہ ترک کر کے راہ حق پر آ گئے۔

''کیا حضرت جی جادو بھی جانتے تھے؟'' منکا نے پوچھا۔

''لاحول بلاقوۃ الا باللہ..... بے وقوف لڑکی اسلام میں جادو حرام ہے۔ یہ تو ان کی روحانی قوت تھی۔ وہ اللہ والے تھے۔ جو چاہتے، ہو جاتا تھا۔'' بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا تو منکا سہم گئی۔ سلمان نے سر جھکا لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اللہ والوں کے پاس کتنی قوت ہوتی ہے۔

اس نے کہا:

''بابا آپ اس کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ جو سنا رہے ہیں سناتے رہیں۔'' سلمان کا ملتمس لہجہ تھا۔

بابا عبداللہ نے سلسلہ کلام جوڑا ''ان کی اس کامیابی نے ہندوؤں میں ہلچل مچا دی، ہر طرف ہیجان برپا ہو گیا اور وہ حضرت کے درپے آزار ہو گئے۔ یہ خبر پرتھوی راج تک پہنچی، وہ اپنے دھرم کا رکھشک تھا۔ اسے دنیا میں پھیلے ہوئے تمام مذاہب جھوٹے نظر آتے تھے۔ وہ پتھر کے تراشیدہ بت کو ہی اپنا نجات دہندہ مانتا تھا۔ اسے یہ مطلق گوارہ نہ تھا کہ کوئی اس کے مذہب میں دخل اندازی کرے اس لیے اس نے اپنے درباریوں کو طلب کیا۔ ان سے مشورہ مانگا بس نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ان درویشوں کو موت کی سزا دے دی جائے کسی طرح یہ بات اندر محل تک پہنچ گئی۔ راجہ کی بیوی نجو گیتا پریشان ہو اٹھی۔ اسے اپنی ساس کی پیش گوئی یاد آ گئی۔ راجا پرتھوی راج چوہان کی ماں اپنے وقت کی بہت بڑی کاہنہ تھی۔ اسے علم نجوم پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ ستاروں کی چال دیکھ کر وہ مستقبل کی ہر بات جان لیتی تھی۔ اس نے بہت پہلے بیٹے کو بتا دیا تھا کہ

اس اجمیر نگری میں پتھروں کے دیس سے ایک ایشور بھگت آئے گا۔ اگر اسے ستایا گیا تو سلطنت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

بیوی کے منع کرنے پر پرتھوی راج خاموش ہوگیا کیوں کہ عرب بھی پتھروں کی سرزمین تھی مگر دل کی کدورت مٹ نہ پائی۔ اس نے عوام کو سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور انہیں کھلا چھوڑ دیا۔

عوام الناس کی خواہش تھی کہ راجا قوت کا استعمال کرے۔ درویشوں کو زبردستی بھگا دے۔ لیکن جب انہوں نے راجہ کو صرف زبانی جمع خرچ کرتے دیکھا تو بددل ہوگئے اور شہر کے بڑے مندر جا پہنچے۔ اس مندر کے مہنت کا نام رام دیو تھا۔ وہ جادو ٹونے کا ماہر تھا۔ اس کے قبضے کلوا بیر تھا۔ اس نے کئی سال کی تپسیا کے بعد وہ مقام حاصل کیا تھا۔ اسے اپنی قوت پر بہت گھمنڈ تھا۔ اس نے جب سنا کہ عرب کے درویش اس کے دھرم پر وار کر رہے ہیں، اس کے دیوی دیوتا کو پتھر کی بے جان مورت کہہ رہے ہیں تو وہ ان کا ساتھ دینے پر تیار ہوگیا اور اپنے جادو منتر کی پٹاری لے کر حضرت معین الدین چشتیؒ سے مقابلہ کرنے ان کے خیمے کی جانب چل پڑا۔

وہ اپنی قوت پر نازاں تھا۔ اور خواجہ غریب نواز اپنے خدا پر۔ اس کے آنے کی خبر خود زمین نے خواجہ غریب نواز کو دے دی۔ انہوں نے ساتھیوں کو بلا کر کہا۔ ''خبردار کوئی اسے نہ روکے۔ اگر وہ اندر آنا چاہے تو راستہ دے دیا جائے۔''

رام دیو اپنی سفلی قوت کے نشے میں چور مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آپ کے سامنے پہنچا اور نہایت بدتمیزی سے آپ کو مخاطب کرنا چاہا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرتا مگر خواجہ غریب نواز کی تو شان ہی الگ تھی۔ انہوں نے چہار تر کی کلاہ زیب سر کیا تھا۔ ضبط کا دامن کیسے چھوڑتے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ جھکے ہوئے سر کو اٹھایا اور اس کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالی۔ بس وہی ایک نظر اس کے لیے کافی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ مگر یہ بھڑکتی ہوئی آگ اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ہلکا پن سا محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ایسا لگنے لگا کہ وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے نام بھی ذہن سے نکل گئے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ کچھ دیر تک پتھر کے بت کی مانند کھڑا رہا پھر وہ آگے بڑھا اور خواجہ صاحب کے پیروں پر گر پڑا ''ہے مہان یوگی! میں تمہارے شرن میں آنا چاہتا ہوں۔''

خواجہ غریب نواز نے سرعت سے پیر کھینچا اور بزرگانہ شان کے ساتھ بولے ''اگر تمہیں سر جھکانا ہے تو اس کے آگے جھکاؤ جو سب کا خالق ہے۔''

''آپ مجھے اوپدیش دیں۔ اپنے دھرم کی شکچھا دیں۔''

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے کلمہ پڑھوا کر مشرف بہ اسلام کر لیا اور اس کا نیا نام شادی دیو رکھا۔

شادی دیو کا قبول اسلام معمولی واقعہ نہ تھا۔ پورے اجمیر میں ہلچل مچ گئی۔ راج مہنت دھرم چھوڑ دے۔ ایک ناقابل یقین واقعہ تھا۔ خود وا جا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنے جاسوس بھیجے۔ انہوں نے ''افواہ'' کی تصدیق کر دی۔

ہندوؤں میں اشتعال پھیل گیا تھا۔ وہ لوگ جتھا بنا کر راجا پرتھوی راج کے پاس پہنچے اور پھر سے اپنا پرانا مطالبہ دوہرایا، عوام کا کہنا تھا کہ یہ درویش نہیں، ساحر ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی بڑے جادوگر کو بلایا جائے۔

وہ دور جادوگروں کا تھا۔ ہر تیسرا مندر ''بھیرو'' کا ہوا کرتا تھا۔ جہاں بیٹھ کر لوگ منتر کا جاپ کیا کرتے تھے۔ بڑے پاٹھ شالاؤں اور وشو ویدالیہ (مدرسوں اور کالجوں) میں تنتر، منتر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ویکرم شیلہ وشو ویدالیہ (بھاگل پور، بہار) اسی دور کی یادگار ہے۔ جسے تنگ آ کر آس پاس کے گاؤں والوں نے آگ لگا دی تھی۔ جس کے کھنڈر آج بھی داستان عبرت ہیں۔

اس وقت ہندوستان بھر میں سب سے بڑا ساحر جئے پال تھا لاتعداد راجا مہاراجا اس کے شاگرد تھے۔ پرتھوی راج بھی اسی کا چیلا تھا۔ عوام کے دباؤ میں آ کر اس نے جے پال کو خبر بھیجی کہ وہ فوراً پہنچے اور ان مسلمان ساحروں کے ٹولے کو خوفزدہ کر کے شہر سے دور بھگا دے۔ اس نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ایسا وار کرنا جس سے وہ خوفزدہ ہو جائیں مگر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

راجا کا پیام ملتے ہی جئے پال روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ سینکڑوں شاگرد تھے۔ اجمیر میں اس کا داخلہ عجب شان سے ہوا وہ ہرن کی کھال پر بیٹھا تھا اور وہ کھال ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس کے سارے شاگرد شیروں پر سوار تھے اور ان کے ہاتھوں میں سانپوں کے کوڑے تھے۔

مذہب پر حملے کی خبر سن کر جئے پال بپھر اٹھا تھا۔ اسے اپنی ساحرانہ قوت پر بڑا ناز تھا۔ وہ چند غریب الدیار فقیروں کو کیا خاطر میں لاتا۔ بڑے کروفر سے ان کو تاراج کرنے چل پڑا۔ ایک عجیب منظر تھا۔ آگے آگے جئے پال ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے شاگردوں کی فوج

تھی۔سب کے سب شیروں پر سوار تھے۔کسی کے ہاتھ میں آگ اگلتے سانپوں کا کوڑا تھا تو کسی کے ہاتھ میں آگ کے چکر۔کوئی آگ کا گولہ ہوا میں اچھالتا ہوا بڑھ رہا تھا تو کوئی انگارے برساتا ہوا۔زمین بھی ان کی دہشت خیز آوازوں سے لرز رہی تھی اور فضا میں ایک ہولناک طوفان برپا تھا۔

خواجہ غریب نوازؒ نے اس طوفان بدتمیزی کو دیکھتے ہی اپنے ساتھیوں کے گرد ایک حصار کھینچا اور سب کو تلقین کی کہ کوئی بھی اس حصار سے باہر قدم نہ نکالے اور خود یادالٰہی میں مشغول ہو گئے۔

جے پال نے خیمہ کے پاس پہنچ کر اپنے ٹوٹکے آزمانے شروع کر دیئے۔جادوئی آگ کا گولہ ہوا میں اڑتا ہوا حصار تک پہنچتا اور اس طرح غائب ہو جاتا جیسے اژدھے نے انہیں نگل لیا ہو۔کافی دیر تک وہ اپنی قوت آزماتے رہے پھر تھک کر بیٹھ گئے۔ان کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خواجہؒ نے مشفق لہجے میں کہا ''اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ اور ہم درویشوں کے سکون میں خلل مت ڈالو۔اسلام راہ حق ہے کفر کو ترک کر کے نجات کی راہ پر آجاؤ۔''

جے پال کو پھر غصہ آگیا اس بار وہ خود سب سے آگے تھا۔ان کی بڑھتی ہوئی شرارتوں کو دیکھ کر خواجہ غریب نوازؒ نے ایک مشت خاک اٹھائی اور ان کی جانب اچھال دی۔خاک کے ذرے ہوا میں اڑتے ہی ہر طرف پھیل گئے اور ایک عجیب کرامت کا ظہور ہوا۔نہ وہاں شیر باقی رہے اور نہ سانپ کے کوڑے'آگ اور''چکر''بھی پلک جھپکتے غائب ہو گئے۔

اپنے سارے حربے مٹی میں ملتے دیکھ کر جے پال غضب ناک ہو اٹھا اور اپنا سب سے خطرناک حربہ آزمانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے منتر پڑھ کر اچھلا اور ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔وہ پرندوں کی مانند پرواز کرتا ہوا خواجہ کے سر پر پہنچا۔اس نے ''اگنی بان'' نامی جادو آزمانا چاہا تھا۔اس جادو کے ذریعے دشمن پر آگ کی برسات کی جاتی ہے۔وہ بھی خواجہؒ پر آگ برسانا چاہتا تھا۔اس نے آپ کے سر پر پہنچنے کے بعد منتر کا پہلا سطر پڑھا ''اوم ہرنگ کرینگ مہا یگ۔''
ابھی گایتری منتر پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ خواجہ صاحب نے داہنے پاؤں کو اٹھایا، اپنی نعلین اتاری اور اسے پھینک مارا۔وہ کھڑاؤں اڑتی ہوئی اس سے بھی اوپر پہنچی اور یک لخت باز کی طرح جے پال پر جھپٹی پر تڑ تڑ اس کی گنجی کھوپڑی پر پڑنے لگی۔
وہ ایک ''مہان جوگی'' تھا۔ہندو پنڈتوں کی طرح اس نے سر گنجا کر رکھا تھا۔صرف

گدی پر ایک چٹیا سی لٹک رہی تھی۔اس تربوز ایسی تیل لگی چمکتی ہوئی کھوپڑی پر نعلین نے طبلہ بجایا تو وہ بلبلا اٹھا اور منتر بھول کر ادھر سے ادھر غوطہ لگا لگا کر بچنے کی کوشش کرنے لگا۔نعلین نے تو گویا قسم کھالی تھی۔وہ جدھر جدھر جاتا نعلین بھی اس کے پیچھے پہنچ جاتی۔وہ اس طرح گھبرا اٹھا تھا کہ اڑنے کا منتر بھی بھول گیا اور اول فول بکنے لگا۔منتر رکا تو وہ پیڑ سے ٹپکے پھل کی طرح خواجہ کے قدموں میں آگرا۔اس پر منکشف ہو چکا تھا کہ مقابل معمولی ہستی نہیں ہے۔کوئی سحر کوئی منتر کارگر نہیں ہوگا۔عقل مندی یہی ہے جو اپنی لغزش کو پہچان لے،شکست کو مان لے۔اس نے بھی اپنی شکست تسلیم کر لی اور گڑگڑانے لگا،خطاؤں کی معافی مانگنے لگا۔خواجہؒ تو غریب نواز تھے۔درگزر کرنے والے۔انہوں نے فوراً اسے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگالیا۔جے پال اسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔دین حق پر آنے کے ساتھ اس نے آپ کی بیعت کر لی اور حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔جے پال کفرانہ لفظ تھا اس لیے خواجہ نے اس کا نام بدل دیا۔اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔

وہی شخص جو گلے گلے تک کفر میں ڈوبا ہوا تھا۔بتوں کو خدا مانتا تھا جب اس کا سینہ انوار اسلام سے منور ہوا تو برگزیدہ بن گیا۔چلے کاٹے۔روزے رکھے۔ساری ساری رات عبادت میں گزاری اور پھر درجہ ولایت پر پہنچ گیا۔اس کی قابلیت،مجاہدات و ریاضات دیکھ کر خواجہ نے بھی اس پر خاص توجہ دی،اسلامی علوم پر دسترس بہم پہنچائی اور ایک دن وہ بھی آیا کہ آپ نے اسے خرقہ خلافت عطا کر دیا۔خواجہ کے خلفاء میں جس عبداللہ بیابانی کا نام پایا جاتا ہے وہ یہی عبداللہ یعنی سابق جے پال جوگی ہیں۔

جے پال جوگی کا مشرف بہ اسلام ہو جانا ایک ایسی خبر تھی کہ جس نے بھی سنی حیرت زدہ ہو گیا۔پورے شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ہر عقل مند نے سمجھ لیا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اس میں وہ قوت ہے جو ہر ایک کو مسخر کر لیتی ہے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے اور خواجہ سے اسلامی تعلیمات سیکھ کر بیعت کرنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے کئی سو گھرانے مسلمان ہو گئے۔یہ بات پنڈتوں،پجاریوں کو بری لگی۔انہیں اپنی روزی روٹی خطرے میں نظر آئی اور انہوں نے سازش کے ذریعے آپ کو ہلاک کرنا چاہا۔

وہ لوگ تاک میں تھے کہ انہیں خبر ملی، راجا کا ایک ہاتھی پاگل ہو گیا ہے۔انہوں نے ایک ہاتھی کو خوفزدہ کر کے خواجہ غریب نواز کے مسکن کے جانب ہانک دیا۔جیسے ہی ہاتھی حضرت

کے نزدیک پہنچا آپ نے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور ہاتھی کی جانب اچھال دی وہ ہاتھی اس لمحہ میں پتھر کا ہو گیا۔ جو آج بھی انا ساگر کے کنارے کھڑا زائرین کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

اس ناکامی پر وہ سب جھلا گئے اور پرتھوی راج پر جا کر غصہ اتارنے لگے کہ تمہارے پاس طاقت ہے تم طاقت کا استعمال کیوں نہیں کرتے اپنی عاقبت سنوارنا ہے تو ان ساحروں کے ٹولے سے مذہب کو بچاؤ۔

یہ بات حق ہے کہ جن کے دلوں پر کفر کا قفل پڑا ہو ان پر کوئی بات اثر نہیں کرتی اتنی بڑی کرامت ہوئی پرتھوی راج کے عقل پر پڑا پردہ اٹھا نہ سکی۔ وہ پیچ و تاؤ کھانے لگا۔ اسے رہ رہ کر سنجوگیتا پر غصہ آنے لگا جس نے ماں کی پیش گوئی یاد دلا دی تھی۔ پھر بھی وہ موقع کی تلاش میں رہا کہ کسی بات کو بہانہ بنا کر خواجہ کو شہر سے نکال باہر کرے۔ بالآخر اسے بہانہ مل گیا۔

وہ اس دن بہت خوش تھا اور سنجوگیتا کے ساتھ محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تبھی ان کی باتوں میں رخنہ پڑا۔ وہ دونوں حیرت بھری نظروں سے مشرقی سمت کے اس وسیع میدان کی طرف دیکھنے لگے اس میدان میں ایک شخص کھڑا اذان دے رہا تھا اور ایک جم غفیر نماز کے لیے صفیں درست کر رہا تھا۔

نماز اس کے لیے عجوبہ نہ تھی اس نے سلطان شہاب الدین غوری سے جنگ کی تھی۔ اس کی فوجوں کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نماز جوش ایمانی کو قوت بخشتی ہے مسلمانوں پر مرمٹنے کی للک پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اسلام کے لیے سر بھی کٹا دینے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ وہی منظر وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ لوگ بڑے جوش و خروش سے نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ان میں شہر کے لوگ زیادہ تھے۔ یہ بات اس نے جان لی تھی۔ اجمیریوں کے کپڑوں نے یہ راز کھول دیا تھا، اسے یقین آ گیا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب پورا اجمیر مسلمان ہو جائے گا۔

''سنجوگیتا میں اس طوفان کو روکوں گا۔''

''سوامی! آپ کس طوفان کی بات کر رہے ہیں؟'' سنجوگیتا نے شوہر سے پوچھا۔

''اسلام کے طوفان کو، اگر اسے روکا نہیں گیا تو ہمارا دھرم مٹی میں مل جائے گا۔ پورے شہر میں ایک بھی ہندو نہیں بچے گا۔ اور اگر سب کے سب مسلمان ہو گئے تو وہ شہاب الدین کا ساتھ دیں گے، اپنے دھرم کا راجا چنیں گے۔ مجھ سے تاج و تخت چھین لیں گے۔'' وہ چیخنے کی حد تک تیز آواز میں بول رہا تھا۔

''جو کچھ بھی کرو لیکن اس طرح کرو کہ اس سنت (مرشد) کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔'' بیوی نے سمجھایا۔

''میں آج ہی اس جادوگر کو اجمیر سے نکل جانے کا حکم بھجواتا ہوں۔ آخری وقت تک میری کوشش یہ ہوگی کہ ٹکراؤ نہ ہو۔ اگر اس نے پھر بھی میرا حکم رد کر دیا تو مجبوراً مجھے طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

نیچے پہنچتے ہی اس نے کاتب کو بلوایا، پیغام لکھوایا اور اس پیغام کو ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے کر خواجہ صاحب کے پاس بھیج دیا۔

وہ پیغام اس وقت کی زبان سنسکرت میں تھا۔ یہ زبان خواجہ غریب نوازؒ نے ملتان میں ہی سیکھ لی تھی انہوں نے خود ہی اسے پڑھا۔ وہ پیغام اتنے غیر مہذب انداز میں لکھا تھا کہ خواجہ صاحب کی جبین مبارک پر شکن پڑ گئی۔ انہوں نے غصے میں کہا ''پتھورا را زندہ گرفتیشم و دادیم'' یہ ایک چھوٹا سا جملہ تھا مگر ولی کامل کی زبان سے نکلا تھا اور سچ ثابت ہوا ایسا سچ ثابت ہوا کہ رہتی دنیا تک لوگ سبق حاصل کریں گے۔

جن دنوں اجمیر میں خواجہ غریب نوازؒ اور پرتھوی راج کے مابین رسہ کشی چل رہی تھی سلطان شہاب الدین غزنی ہندوستان پر دوبارہ حملے کی تیاری میں مشغول تھا۔ اپنی شکست پر وہ تلملا رہا تھا۔ وہ تراوڑی کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا تاکہ دنیا والے دیکھ لیں حق کے نام لیوا بت پرستوں کے آگے جھکتے نہیں ہیں اور اپنی ہزیمت کا بدلہ لے کر رہتے ہیں۔ اس نے غزنی پہنچتے ہی قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنی شکست کا بدلہ نہیں لے لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ اس نے خود کو جنگی تیاریوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلوت میں جانا اور نیا لباس پہننا اس نے ترک کر دیا تھا اسلامی فوج کے وہ امراء جنہوں نے تراوڑی کی پہلی جنگ میں پیٹھ دکھا دی تھی ان پر شہاب الدین نے بہت عتاب نازل کیا تھا ان کی گردنوں میں جوتے بھرے ہوئے تو بڑے لٹکا کر شہر میں گھمایا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ سلطان نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ جو شخص ان کے توبڑوں میں سے جو نکال کر نہ چکھے اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

ایسا ظالمانہ حکم صرف اس لیے جاری کیا گیا تھا کہ اس شکست میں ان سرداروں کی بھی بزدلی شامل تھی۔

سلطان شہاب الدین غوری کی تخت نشینی بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کی

وفات کے بعد ہوئی تھی ۱۱۷۴ء میں ہی اس نے دنیا والوں سے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ محمود غزنوی کی یادگار سلطنت غزنی اس کے کمزور جانشینوں سے چھین لی پھر اس نے ہند کا رخ کیا۔ ملتان اور لاہور پر قبضہ کیا اور ۱۱۹۰ کے اواخر میں قلعہ سرہند (بھٹنڈا) پر فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس فتح کے بعد وہ غزنی لوٹ رہا تھا کہ راستے میں خبر ملی کہ ہستنا پور (دہلی) کے راجہ پرتھوی راج نے سرہند کا محاصرہ کرلیا ہے۔ وہ اسی وقت واپسی کے لیے مڑ گیا۔

تھانسیر سے چودہ میل دور تراوڑی میں اسے پرتھوی راج چوہان کا لشکر مل گیا۔ پہلی خبر غلط نکلی تھی۔ ابھی راجہ چوہان راستے میں ہی تھا۔ اس کے لشکر میں دو لاکھ جنگ جو سپاہی اور تین ہزار ہاتھی تھے جبکہ سلطان کے پاس صرف بارہ ہزار سپاہی تھے پھر بھی وہ اتنے بڑے لشکر سے ٹکرا گیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جنگ عروج پر تھی کہ پرتھوی راج کے بھائی کھانڈے راؤ (حاکم دہلی) کی نظر سلطان پر پڑ گئی۔ اس نے سلطان کو پہچان لیا۔ اور اپنے ہاتھی کو گھوڑے کی جانب ریل دیا۔ سلطان کا گھوڑا بدکا مگر اس نے گھوڑے کو قابو میں کر کے کھانڈے راؤ پر نیزے سے وار کیا۔ نیزہ اس کے منہ پر لگا اور اس کے دو دانت ٹوٹ گئے لیکن وہ بھی جری تھا اس نے فوراً پلٹ کر جوابی وار کیا۔ سلطان زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا ہی چاہتا تھا کہ ایک خلجی غلام نے اسے سنبھال لیا اور شمشیر زنی کے جوہر دکھاتا، ہندوؤں کے ٹڈی دل کو چیرتا ہوا نکل بھاگا۔ سلطان کے زخمی ہوتے ہی فوج نے ہمت ہار دی تھی۔ راجا پرتھوی راج نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

سلطان اسی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ اس جنگ میں جو بھی اس کا ساتھ دے گا مالا مال ہو جائے گا۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ صرف ایک سال میں اس کے جھنڈے تلے ایک لاکھ بیس ہزار مسلح سوار جمع ہو گئے۔ ابھی اس نے کوچ کا دن مقرر نہیں کیا تھا کہ ایک رات خواب میں ایک نورانی صورت بزرگ کی زیارت کی۔ وہ فرما رہے تھے۔

''اے سلطان! تو جلد ہند کی جانب کوچ کر، وہاں کا تخت تیرا منتظر ہے۔''

صبح جب سلطان بیدار ہوا تو اس نے بھرے دربار میں اس روحانی بشارت کا حال سنایا۔ لوگوں کے حوصلے دو چند ہو گئے۔ اسی اثناء میں قلعہ سرہند کے سقوط کی دل خراش خبر پہنچ گئی۔ اب اس کے لیے کوچ میں تاخیر ممکن نہ تھی۔ اس نے زیر عتاب امراء کو بلایا، وہ اپنے کئے پر نادم تھے۔ سلطان نے ان کی خطا معاف کر دی اور انہیں دوبارہ فوج میں شامل کر لیا۔ اس بار تمام امیروں نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میدان جنگ میں مر جائیں گے مگر منہ نہ

موڑیں گے۔

ادھر ہندوؤں میں بھی پوری تیاری تھی۔ پرتھوی راج کو یقین تھا کہ سلطان شہاب الدین شکست کا بدلہ لینے ضرور آئے گا۔ چنانچہ وہ اپنی فوجی قوت میں اضافہ کر لے۔ قلعہ سرہند کی فتح کے بعد جس دن اس نے خواجہ غریب نوازؒ کو اجمیر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اسی کے دوسرے روز کھانڈے راؤ حاکم دہلی کی طرف سے اطلاع ملی کہ سلطان شہاب الدین ہندوستان کی جانب بڑھ رہا ہے۔

اس اطلاع نے پرتھوی راج کو بوکھلا دیا تھا۔ اس نے ہندوستان کے تمام ہندو راجاؤں کو قومی حمیت کا واسطہ دے کر دھرم کی حفاظت کے لیے بلایا۔ سوائے ایک آدھ ہندو راجا کے تمام راجے اپنی فوجوں کے ساتھ چل پڑے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو راجے اپنی فوجوں کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ اب اس کی فوج تین لاکھ سواروں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ جنگی سامان سے لدے سولہ ہزار چھکڑے لے کر وہ شہاب الدین کا راستہ روکنے کے لیے نکل پڑا۔ تراوڑی کے میدان میں دونوں کا سامنا ہوا۔ دونوں لشکروں کا یہ عزم تھا کہ ایک طرف تو سلطان کی فوج کے امیروں نے قسم کھائی تھیں کہ مر جائیں گے لیکن پیٹھ نہ دکھائیں گے دوسری جانب پرتھوی راج اور اس کے حلیف راجاؤں نے اپنی اپنی پیشانی پر قشقہ کھینچ کر پان کا بیڑا اٹھایا تھا کہ جب تک مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا نہ دیں گے گھر کا منہ نہ دیکھیں گے۔ اس سوگند نے جنگ کو نہایت اہم بنا دیا تھا۔

۲۷ محرم الحرام ۵۸۸ھ کو دونوں لشکر بالکل آمنے سامنے آ گئے۔ پرتھوی راج نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا تھا کہ آگے ایک لاکھ تیر انداز تھے۔ ان کے پیچھے ڈیڑھ سو راجاؤں کی فوجیں اور اس کے پیچھے پرتھوی راج پچاس ہزار سواروں کے ساتھ موجود تھا اور پشت پر جنگی ہاتھیوں کی قطار تھی۔

سلطان نے بھی دشمن کے انداز کو مدنظر رکھ کر اپنی فوج کو ترتیب دی تھی۔ اپنی فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصے کو جس میں بیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل تھے کمان کی شکل میں ترتیب دیا اور اسے سب سے آگے رکھا۔ تین حصوں کو ایک ایک تجربہ کار سپہ سالار کے سپرد کر کے ہدایت کی کہ وہ لڑائی کے شروع میں خاموش کھڑے رہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مختلف سمتوں سے حملہ کریں۔ بارہ ہزار چیدہ سوار سلطان نے اپنی خاص فوج میں رکھے اور

خود ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔ طبل جنگ بجتے ہی ہندو لشکر سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی ادھر سے غوری فوج نیزے تانے برق کے مانند ان پر جا پڑی، دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ اس زور کا رن پڑا کہ زمین کانپ اٹھی۔ سلطان تیز رفتار سواروں کے ذریعے اپنی فوج کو ہدایت بھیج رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی داہنی جانب خاموش کھڑی فوج حملہ کر رہی تھی۔ اس انداز جنگ نے ہندو فوج کو بوکھلا دیا تھا۔ اب سلطان نے جنگ کو وسیع علاقے میں پھیلانے کا حکم دیا۔ دراصل سلطان ہندو فوجوں کو تھکا دینا چاہتا تھا۔ سہ پہر تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تبھی سلطان کی خاصہ کے بارہ ہزار تازہ دم سواروں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور شاہین کی مانند جھپٹے یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تمام راجاؤں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ اپنے بارہ ہزار مقتولین کو میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بھاگنے والوں میں پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ بھی تھا۔ سلطان نے اس کی بھی پیشبندی کر رکھی تھی۔ تقریباً دس میل کے فاصلے پر کھڑی فوج نے کھانڈے راؤ کو پہچان لیا اور اسے پکڑ کر ٹکڑوں میں بدل دیا۔ پرتھوی راج کو بھی دریا سرستی کے کنارے گھات لگائے بیٹھی فوج نے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس طرح خواجہ غریب نواز کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو گئی۔

تراوڑی سے کیکڑی کی راستے سلطان شہاب الدین پرتھوی راج کے پایہ تخت اجمیر پہنچا۔

اجمیر پہنچنے تک اسے علم نہ تھا کہ وہاں بھی اسلام کا نور پھیل چکا ہے۔ شہر پہنچ کر اسے علم ہوا کہ یہ کام درویشوں کی ایک جماعت نے کیا ہے۔ وہ ان کی زیارت کے لیے انا ساگر پہنچا اور حیرت زدہ رہ گیا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن بزرگ کی اس نے خواب میں زیارت کی تھی، وہ ان سے بالمشافہ گفتگو کرے گا۔ وہ کوئی اور نہیں خواجہ غریب نوازؒ تھے۔ جنہوں نے اسے خواب میں فتح کی بشارت دی تھی ٹھیک اسی دن جس روز انہوں نے پرتھوی راج کو گرفتار ہو کر قتل ہونے کی بددعا دی تھی۔

خواجہ غریب نواز کی قدم بوسی کے بعد شہاب الدین دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب بنا کر ہندوستان کی حکومت سونپی اور خود واپس غزنی چلا گیا۔"

بابا عبداللہ نے اپنی بات ختم کر کے سلمان کی طرف دیکھا پھر بولے میری اس طویل تقریر کا مقصد یہ تھا کہ تُو سمجھ سکے کہ سب سے قوی اللہ ہے۔ وہی مالک کل ہے۔ فاکیہ کی ذات

ایک سراب تھی اور کچھ نہیں۔"

"بابا فاکیہ تو خیر قصہ پارینہ بن گئی مگر اس بدذات کا کیا کیا جائے جو میرے ساتھ لگ کر یہاں تک چلی آئی ہے۔"

"کون؟" بابا نے مسکرا کر پوچھا۔

"بابا مجھ پر کیا گزری یہ آپ اپنے کشف سے جان گئے ہوں گے اسی لیے میں اس عورت سے نفرت کرنے لگا ہوں۔"

"مگر یہ عورت معصوم ہے، بدروح نہیں۔" بابا ہنس کر بولے۔

"بابا! جب سے یہ ملی ہے، تبھی سے میں اس خونی بلے کو دیکھ رہا ہوں۔ اسی لیے تو مجھے شک ہونے لگا ہے کہ یہی وہ بدروح ہے جو مجھے جنگل والے کھنڈر میں ملی تھی۔"

"بیٹے! بدروح اگر قریب ہو تو ایک ناگوار سی بو پھیلی رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ بدروح تمہارے ہی ساتھ یہاں آئی ہے لیکن یہ لڑکی بدروح نہیں ہے۔" بابا نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "ویسے میں ابھی زائچہ بنا کر معلوم کرتا ہوں کہ وہ بدروح کس مقصد سے اتنی دور آئی ہے۔"

بابا جی کو دیکھ کر منکا باہر چلی گئی تھی۔ بابا نے قلم سے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں ڈالنا شروع کیں۔ کافی دیر کی دماغ سوزی کے بعد انھوں نے سر اٹھایا۔ سلمان کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولے۔ "بیٹے! کھنڈر میں جو بدروح تمہیں ملی تھی اُسے کسی اللہ والے نے وہیں مقید کر رکھا تھا۔ جب تم اس کھنڈر میں پہنچے تو وہ حصار ٹوٹ گیا۔ اس حصار کو تمہارے بازو پر بندھے جوشن کبیر کے تعویذ نے توڑا۔ جوشن کبیر ہر قسم کے حصار کو توڑ دیتا ہے۔ انجانے میں تم نے جو غلطی کر ڈالی تھی اسی کی یہ سزا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ جس دن تم اپنے بازو سے تعویذ اتار دو گے، اسی دن وہ تمہیں بھی مار دے گی۔ اسے سو انسانوں کا خون پینا ہے تاکہ وہ اپنا "جاپ" مکمل کر سکے۔ جس دن اس کا عمل مکمل ہو گیا، وہ بنی نوع کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ بلے کی شکل میں وہی شکار کرتی ہے لیکن یہ لڑکی تو معصوم ہے۔ اس پر شک نہ کرو۔ بے سہارا ہے، اسے سہارا دو پھر اسے اپنانے سے تمہیں ثواب بھی ملے گا۔ ایک بھٹکے ہوئے انسان کو صراط مستقیم پر لانا بہت بڑا ثواب ہے اگر تم اسے اپنا لو گے تو یہ بتوں کی پوجا سے تائب ہو جائے گی۔"

"بابا! یہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ پہلے یہ بتائیں کہ اس بدروح سے نجات کیسے ملے گی؟"

"بیٹے! اس لیے تو میں آیا ہوں۔ اس کا شکار تمہارے ہی ذریعے ممکن ہے اسی لیے اس

روز میں نے تمہیں روک لیا تھا۔صوفیائے کرام نے اپنے اپنے علاقے مخصوص کر لیے ہیں۔میں صوفیوں کے قدموں کی دھول'ان کی برابری کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ہاں'ان سے التجا کر سکتا ہوں۔میری تمنا تھی کہ مجھے یہ علاقہ مل جائے اور مل گیا۔یہ علاقہ میرا ہے۔میں اپنے علاقے میں کسی گندی روح کو برداشت نہیں کر سکتا۔جب سے مجھے اس بدروح کی موجودگی کا علم ہوا ہے'میں اس بدذات کو ڈھونڈ رہا ہوں۔وہ تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔آج میں اسے بلا کر ہی دم لوں گا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے بٹوا نکالا۔اس بٹوے سے انھوں نے کالے رنگ کے کچھ دانے نکالے اور ان دانوں کو ہوا میں اچھال دیا۔وہ دانے گئے کہاں'سلمان اسی پر غور کر رہا تھا کہ کمرے کے ایک کونے میں رکھے ٹین کے بکس کا ڈھکن کھل گیا اور اس میں رکھا نافہ باہر نکل آیا۔حیرت انگیز بات تھی کہ وہ نافہ اسے رحیم کے نانا علی نے بطور تحفہ دیا تھا۔مشک بھرا نافہ کسی زندہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے گرد کالے دانے چمٹے ہوئے تھے۔

''اوہ!تو یہ مجھے دھوکا دینے کے لیے نافہ میں چھپی بیٹھی ہے۔میں کہوں کہ آخر اس کی بدبو مجھے اتنی ہلکی محسوس کیوں ہو رہی ہے۔'' بابا نے مسکرا کر کہا پھر زیرِلب کچھ پڑھنے لگے۔کچھ دیر بعد انھوں نے پھر پھونک ماری۔بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔اگر وہ واقعی سلمان کی آنکھوں کے سامنے رونما نہ ہوتا تو وہ بھی اسے تسلیم نہ کرتا۔اس نے دیکھا کہ پھونک مارتے ہی اس نافہ میں آگ لگ گئی اور اس نافہ سے اچھل کر کوئی باہر آئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی ہونے لگی۔لمحے بھر میں وہ انتہائی خوفناک شکل کی عورت بن گئی تھی۔عورت اپنے جسم کو خود ہی نوچتے ہوئے منمناتی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔''جل گئی رے۔او مولوی کے بچے!تو نے یہ کیا کر ڈالا۔بجھا دے آگ۔''

بابا نے پھر کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔وہ تیورا کر گری اور پھر اس کے جسم سے شعلے بلند ہونے لگے،دیکھتے ہی دیکھتے وہ راکھ میں تبدیل ہو گئی۔

اس راکھ کو بابا جی نے اپنے کشکول میں بھر لیا پھر بولے''یاد ہے تجھے فاکیہ نے ایک تحفہ دیا تھا جو اس کا نہیں تھا۔ایک برگزیدہ بندے نے اسے اپنے نوری علم سے حاصل کیا تھا مگر ہر ذی روح کی طرح اسے بھی فنا ہونا تھا وہ ایک دن مر گیا۔''

''مجھے نہیں پتا کون مر گیا۔'' سلمان جو بابا کی باتوں کے اثر میں تھا جلدی سے بولا۔

''ابھی میں نے اس کے بارے میں بتایا کہاں ہے'وہ بھی بام کار رہنے والا تھا۔جس

وقت وہ آخری ہچکی لے رہا تھا فاکیہ وہاں سے گزر رہی تھی۔اس ویرانے میں کوئی تھا نہیں۔اس نے انسانی جسم میں خود کو ظاہر کیا اور گاؤں سے لوگوں کو بلا لائی۔لوگ کفن دفن میں لگ گئے اور اس نے اس بندے کی انگوٹھی پر قبضہ کر لیا۔وہی انگوٹھی اس نے تمہیں دی تھی۔جس سے تم اپنی جائز خواہش پوری کرتے تھے۔وہ بھی اس نے اس لیے دیا تھا کہ اس کے پاس وہ انگوٹھی رہتی نہیں۔اس انگوٹھی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے حاصل کردہ رقم صرف نیک مقصد کے لیے ہی خرچ کی جا سکتی ہے اور وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی اسی لیے اس نے وہ انگوٹھی تمہیں دے دی تھی۔تم نے بھی جس دن اس انگوٹھی کے پیسوں کو گناہ کے کام میں لگایا اسی دن وہ غائب ہو گئی۔اب وہ مجھے کسی نے دی ہے کہ تمہیں دے دوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ جس دن تم نے غلط کام لیا یہ پھر غائب ہو جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑے لیکن دروازے پر پہنچ کر رک گئے پھر بولے۔''بیٹے! میرے مشورے پر عمل کرنا۔منکا کو اپنا لینا۔''

سلمان اس طرح مسحور تھا کہ انہیں روک بھی نہ سکا۔بعد میں سلمان نے انہیں بہت ڈھونڈا۔مزار پر بھی گیا مگر وہ کہیں نہ ملے۔

یہ انہی کا حکم تھا اس لیے سلمان نے منکا کو جامع مسجد کے پیش امام قاری عبداللہ کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام کرایا پھر اس سے نکاح کر لیا۔

اب اسے کسی تنگی کا بھی سامنا نہ تھا۔اس کی پرانی مددگار انگوٹھی اسے مل چکی تھی۔وہ جب چاہتا اپنی ضرورت کے مطابق تومان منگوا لیتا۔زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔

زندگی ایک ڈگر پر آئی تو اسے اپنی امی اور بہن کی یاد ستانے لگی کہ پتا نہیں وہ لوگ کس حال میں ہوں گی۔اب فاکیہ کا تو سہارا تھا نہیں کہ وہ ایک پل میں ان لوگوں کو تلاش کر لیتا اب اسے عام انسانوں کی طرح وقت کے ساتھ انہیں تلاش کرنا تھا۔بندر عباس سے بام کوئی پڑوس میں تو تھا نہیں۔کئی دن کی مسافت پر تھا۔اس نے اس کا ایک آسان حل یہ نکالا کہ ایک شخص کو راضی کیا کہ وہ خاموشی سے جا کر حال احوال لے آئے۔

میثم تابانی نامی اس شخص کو اس نے آنے جانے کے علاوہ ایک ہزار تومان دیا تھا جو اس وقت کے حساب سے بہت بڑی رقم تھی۔وہ اسی روز روانہ ہو گیا تھا اور اس نے پانچویں دن آ کر پوری خبر دے دی۔اس نے بتایا کہ اس کے والد کا اور ماموں کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ بہت کسم پرسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔

خبر سنتے ہی وہ اسی دن بام کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ شہر اس کے لیے جیل سے کم نہ تھا۔ وہاں اس نے کئی کارنامے انجام دئے تھے مگر وہاں گئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ اس کے قصبہ تک جانے کے لیے وہاں سے ہو کر ہی جایا جاسکتا تھا، سلمان شام کے وقت بام کے اتو باس دیپو (بس اسٹاپ) پر اترا۔ اس وقت بھی بھیڑ بھاڑ عروج پر تھی۔ خوب رونق تھی۔ وہ سیدھا ویٹنگ روم میں جا بیٹھا۔ اس کے قصبہ کی طرف جانے والی بس ابھی تک آئی نہیں تھی۔ وہ وہاں بیٹھا ابھی ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شیریں کا ایک محلے دار ادھر ہی چلا آ رہا تھا۔ اگر اس کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ اسے پہچان لیتا اور خواہ مخواہ کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اس طرف نہ آئے مگر وہ تو سیدھا ادھر ہی بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ اٹھ کر کسی اور طرف چلا جائے مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ مجبوراً وہ اپنی جگہ نظریں جھکائے بیٹھا رہا تبھی اسے احساس ہوا کہ اس کے برابر میں کوئی آ کر بیٹھا ہے۔ اس نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ وہی تھا۔ اس نے اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب اسے یاد آیا کہ فاکیہ نے کہا تھا کہ میں نے سب کی نظروں پر پردہ ڈال دیا ہے اس لیے تمہیں کوئی بھی پہچان نہیں پائے گا اور سب شیریں کا گمشدہ بھائی سمجھیں گے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے گہری سانس لی اور اٹھ گیا کیونکہ بس آ چکی تھی۔ وہ ٹکٹ لے کر اندر جا بیٹھا۔ یہ آدھے گھنٹے کا سفر فوراً ختم ہوگیا۔ وہ خیالوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ اسے سفر کٹنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ بس رکی تب وہ چونکا تھا۔

جب وہ بس سے اترا تو اسے سب کچھ نیا نیا سا لگا۔ سڑکیں وہی تھیں۔ مکان اور دکانیں بھی ویسی ہی تھیں مگر دل میں تغیر تھا اس لیے سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر ممانی نے اپنے بھائی کے قتل کی بات اٹھائی تو وہ بھرپور انداز میں اپنا دفاع کرے گا۔ اب وہ پہلی سی تو بات رہی نہیں اگر ضرورت پڑی تو مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی ماں اور بہن کو ساتھ لے کر ہی آئے گا۔

جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو وہ بند تھا۔ اس نے دستک دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ممانی تھی۔ وہ کچھ دیر تو اسے بغور دیکھتی رہی پھر اداس لہجے میں بولی۔

''سلمان تُو کہاں تھا۔ تیرے ماموں مر گئے اور تو اب آیا ہے۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا۔''

ممانی کا لہجہ ایسا تھا کہ سلمان حیران رہ گیا۔ آواز سن کر بہن بھی آ گئی تھی۔ اس نے بھائی کو دیکھا تو روتی ہوئی سینے سے لگ گئی۔ ماں بھی آ گئی تھی۔

سب نے دل بھر کر آنسو بہایا۔ جب رونے کا دور ختم ہوا تو ماں نے پوچھا ''اتنے دن کہاں رہا۔ تیرے ابا نہیں رہے، تیرے ماموں نہیں رہے۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔''

''ماں میں اب بندرعباس میں رہتا ہوں۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ تیاری کر لو۔'' اس نے کہا۔

''اب کہاں جانا ہے۔ جو تھوڑی سی زندگی بچ گئی ہے وہ یہیں گزر جائے گی۔ تُو بتا کیا کر رہا ہے؟''

''میں وہاں نوکری کرتا ہوں۔ اچھی تنخواہ ہے۔ تم رہو گی تو آرام رہے گا۔''

''تیری ممانی بہت اکیلی ہوگئی ہے۔ اس کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔ تیرے جانے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد کسی نے اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر تیرے ماموں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس لیے اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

ممانی کا بھائی اس کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا۔ اس اطلاع نے اس کے دل سے خوف نکال دیا اور وہ مطمئن ہوگیا۔ بہن بھی ساتھ جانے پر تیار نہیں تھی۔ مجبوراً وہ اکیلا ہی واپس لوٹ آیا۔ وقت سب کو صحیح کر دیتا ہے، یہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب حالات اتنے بدل چکے ہیں تو ماں بہنوں کا یہیں رہنا بہتر ہے جب سوچ کر وہ مطمئن ہوگیا اور آتے وقت اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر ماہ رقم بھیج دیا کرے گا۔

اس نے وعدہ سچ کر دیکھایا۔ ہر ماہ معقول رقم بھیج دیتا۔ بہن کی شادی بھی اسی نے کرائی۔ وہ اس انگوٹھی کے ذریعہ اپنی ضرورتیں پوری کر رہا تھا۔ مگر ایک دن جب وہ سو کر اٹھا تو وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آ گیا کہ کل رات اس نے منورہ کو رقم دی تھی کہ وہ گھر کی ضرورت کا سامان منگوا لے۔ اس نے فوراً منورہ کو بلا کر پوچھا کہ اس نے وہ رقم کہاں خرچ کی تو اس نے بتایا ''میں نے پڑوس کے طاہری کو دے دی تھی۔ ان کے شوہر کو کسی ضرورت کے لیے کچھ رقم چاہیے تھی۔ میں نے بطور قرض دے دیا۔''

''بے وقوف عورت، طاہری کا شوہر جواری ہے۔ وہ رقم اس نے جوا میں ہار دی ہو گی۔'' سلمان سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب کیا کر سکتا تھا اس لیے صبر کر کے بیٹھ گیا۔ اتنے دنوں میں

اس نے جو عزت کمائی تھی اسی کے بل پر اس نے کچھ رقم ادھار لے کر ایک تنور کھول لیا۔ خدا کی قدرت کے وہ تنور خوب چلنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ دھیرے دھیرے عمر کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ منورہ بھی بوڑھی ہوتی رہی۔ اس کا تنور آج بھی ایران میں مشہور ہے۔ دور دور سے لوگ روٹیاں خریدنے کے لیے آتے ہیں۔ کیونکہ اس کی روٹی پورے ایران میں روحانی روٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ آٹے کی بوری کھولنے سے روٹی پکانے تک وہ اور اس کے تمام نوکر درود شریف پڑھتے رہتے ہیں۔ خریداروں کو بھی حکم ہے کہ جب تک وہ قطار میں کھڑے رہیں زور زور سے درود شریف پڑھتے رہیں۔ اس دکان کی شہرت ایران سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ منورہ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہے۔ وہ سلمان کے چھے بیٹے، بیٹیوں کی ماں ہے اور گیارہ پوتے، نواسوں، نواسیوں کے درمیان خوش ہے۔ سلمان اب بھی جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ کیا واقعی ایسا میرے ساتھ ہوا ہے اور تب وہ منکا جس کا اسلامی نام منورہ رکھا تھا، اسے چھیڑنے کے لیے کہتا ہے۔ ''کہو بدروح کیسی ہو؟'' اور وہ پوپلے منہ سے صلواتیں سنانے لگتی ہے۔